

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِينَ قَتَلُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ أَمْوَالًا بَلْ عِنْدَ رَبِّهِمْ يُسْرَتُونَ ه
اور جو لوگ خدا کی راہ میں شہید کئے گئے انہیں ہرگز مردہ نہ سمجھنا بلکہ وہ لوگ زندہ ہیں اپنے پروردگار کے یہاں وہ زندگی پاتے ہیں

انسان کو بیدار تو ہو لیتے دو ہر قوم پر کسے کی ہمارے ہیں حسین
(جوش)

شہیدِ السائیت

از افادات

مفتِ اسلام مجتہد العصر النجفی روزگار سید العلماء الحاج علامہ سید علی نقی النجفی ظلہ العالی
سابقہ بینظیری آف تھیا لوجی علی گڑھ یونیورسٹی

ناشر :-

امامیہ مشن پاکستان ٹرسٹ، انارکلی لاہور

1/2



عرض ناشر

انسان کو پروردگار عالم نے اشرف المخلوقات بنایا اور اس کی خلقت کی غرض معرفت خالق قرار دی۔
 نوری رہنمائی کا اہتمام خود خالق کی طرف سے اس طرح کیا گیا کہ تمام حجت ہو جائے اور عدم معرفت کے عذر کی گنجائش
 باقی نہ رہے چنانچہ ہر زمانے کی ضروریات کے مطابق ہادیان برحق مبعوث ہوتے رہے یہاں تک کہ وہ وقت آ گیا
 کہ رب اپنے دین کے اعمال اور اپنی نعمتوں کے انعام کا اعلان کر دے۔ جناب پیغمبر اکرم خزانہ ان حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ
 علیہ وآلہ وسلم نے کتاب ہدایت کے ساتھ اپنے اسوہ حسنہ کا نمونہ پیش کیا۔ اس معلم آخری نے متعلمین کو نہ صرف ہدایت
 بلکہ نصاب ہدایت سے روشناس کرا دیا بلکہ یہ اہتمام بھی کر دیا کہ کتاب اللہ کے ساتھ ساتھ ان کی عزت و اہلیت
 کو ترکہ رسولؐ سمجھو اور دونوں سے وابستہ رہ کر رشد و ہدایت حاصل کرتے رہو۔ اس طرح گمراہی سے بچنے کی راہ
 دکھا دی۔ یوں تو ہر نگرانِ کار نے رسولؐ کے پیغام کو اصلی خود و خال میں پہنچانے اور اس طرح اپنے بعد گمراہی
 سے بچانے کا فریضہ نگہبانی با حسن و بوجہ انجام دیا لیکن فخر انسانیت کے نواسہ شہید انسانیت امام حسینؑ نے
 اس سرمایہ علم و عمل کی حفاظت کا فرض کچھ اس طرح ادا کیا کہ جس کی نظیر کائنات عالم میں نہیں مل سکتی ہے
 انبیاء میرے نسیب مد این کار والہ کہ اسے حسینؑ کا رہ کر دی
 مدحیان معرفت خدا پران کا یہ وہ احسان عظیم ہے کہ جس سے وہ کبھی سبکدوش نہیں ہو سکتے وہ
 محسن شامی کا اظہار اس طرح کر سکتے ہیں کہ حسینیت کا پیغام دنیا کے گوشے گوشے میں پہنچا دیں۔ اسی مقصد عظیم کے
 پیش نظر امام حسینؑ کی نیرہ سو سالہ یادگار کے سلسلہ میں جناب سید العلماء علامہ علی نقی النقی مظلہ العالی نے
 ایک جامع پروگرام قوم کے سامنے پیش کیا جس کے تحت شہر شہر، قریہ قریہ اور سیتی سیتی یادگار حسینؑ کے اجلاس
 منعقد ہوئے۔ اس پروگرام میں ایک ایسی کتاب کی تدوین بھی شامل تھی جو بین الاقوامی نقطہ نظر سے امام حسینؑ
 کے سوانح حیات اور واقعہ ہائے کربلا کی مستند تفصیلات پر مشتمل ہو چکی ہو اس کی تدوین میں ہر ذوق و مسلک کے
 مشاہیر کو شامل کیا گیا کیونکہ حسینؑ کسی فرقہ خاص کے نہیں بلکہ تمام دین کے انسانوں کو حق و باطل میں تمیز کرنے
 کی راہ دکھاتے ہیں۔ بقول جوشن رح ”ہر قوم ہمارے ہی ہمارے ہیں حسینؑ“

(جملہ حقوق بحق پبلشر محفوظ)

بار _____ سوم
 اشاعت _____ ۱۹۸۶ء
 تعداد _____ ایک ہزار
 باہتمام _____ علی محترم جعفری
 مطبع _____ اظہار سنز ریڈیو گن روڈ لاہور
 طابع _____ اظہار الحسن رضوی
 کتابت _____ محمد اصغر قریشی طاہر رقم
 طباعت _____ آفٹ
 کاغذ _____ سفید اعلیٰ

قیمت

مندرجات

۴	۱۔ تعارف
۲۱	۲۔ تمہید
۳۳	۳۔ نسبی خصوصیات، خاندان اور اس کے شاندار روایات
۴۵	۴۔ بنی ہاشم اور بنی امیہ
۴۸	۵۔ اسلام اور اس کا پیغام
۵۸	۶۔ اسلام کا مزاحم طاقتوں سے تصادم
۶۹	۷۔ حسین بن علیؑ کی ولادت اور ابتدائی زندگی
۷۳	۸۔ امام حسینؑ کی زندگی کا دوسرا دور، نانائے وفات کے بعد سے باپ کی شہادت تک۔
۹۵	۹۔ بنی امیہ کا اقتدار اور ان کی سیاسی روش
۱۰۳	۱۰۔ پیغمبر خدا کے بعد اسلامی مفاد کے محافظین، ان میں اور مخالفت قوتوں میں تصادم اور اس کے نتائج
۱۰۷	۱۱۔ حسن مجتبیٰؑ کی صلح اور اس کے نتائج
۱۲۱	۱۲۔ یزید کی ولیعہدی
۱۵۳	۱۳۔ معاویہ کی وفات اور یزید کی تخت نشینی
۱۵۶	۱۴۔ یزید کا رنج کی روشنی میں
۱۶۲	۱۵۔ امام حسینؑ کے بلند اخلاق و کمالات اور گراں قدر مقولات
۱۸۴	۱۶۔ یزید کا بیعت پر اصرار اور حسینؑ کا انکار
۱۹۴	۱۷۔ حسنؑ کی خاموشی اور حسینؑ کا اقدام
۲۰۰	۱۸۔ حسینی موقف کی تشریح
۲۱۱	۱۹۔ حرم رسولؐ سے سفر اور حرم خدا میں پناہ
۲۱۸	۲۰۔ دعوتِ اہل کوفہ اور سفارتِ مسلم بن عقیل
۲۵۵	۲۱۔ کتے سے کر بلا تک
۲۹۰	۲۲۔ یزیدی حکومت کی سرگرمی اور کربلا میں فوجوں کی آمد
۲۹۶	۲۳۔ امام حسینؑ کی قربانی، آزادی اور اس کے اسباب

حال ہی میں سید العلماء مدظلہ نے اپنی اس مبسوط کتاب شہیدانِ نیت کے متنی پر نظر ثانی فرما کر اسے از سر نو مرتب فرمایا ہے اور اس عظیم کتاب کی اشاعت کے حقوق امامیہ شہنشاہ پاکستان ٹرسٹ لاہور کو عطا فرمائے ہیں۔ امام حسینؑ کی سیرت و سوانح کے موضوع پر اردو زبان میں کوئی ایسی جامع اور مستند کتاب موجود نہیں تھی تمام علم دوست افراد سرکارِ محدوح کے پاس گزرا رہیں کہ انھوں نے اس کی کوپڑا کیا۔ فخر المثلکین جناب مولانا سید محمد جعفر زیدی خطیب جامع شیعہ لاہور نے اس کتاب کا تعارف لکھا ہے جو شامل اشاعت ہے اپنی اہمیت کے اعتبار سے شہیدانِ نیت اس صدی کی عہد آفرین کتاب ہے۔ جس طرح نابغہ روزگار صدیوں میں پیدا ہوتا ہے اس طرح عظیم کتابیں بھی روز بروز منقذہ نشود پر جلوہ گر نہیں ہوتیں۔ ہم اس کتاب کو بڑے بڑے مجاز کے ساتھ اپنے قوم کے سامنے پیش کرتے ہوئے امید کرتے ہیں کہ اسے ہر لائبریری ہر اسکول اور ہر کالج نیز ہر مسلک کے سربراہ حضرات تک پہنچانے کی کوشش کی جائے گی۔

علی محترم جعفری
مینجنگ ٹرسٹی امامیہ شہنشاہ لاہور

تعارف

تعارف کرایا جاتا ہے اس شے کا جو خود تو ہو غیر معروف اور تعارف کرانے والا ہو اپنی جگہ معروف و مشہور لیکن یہاں صورت حال ہے برعکس۔ دینائے شیعیت میں کون ایسا شخص ہو گا جو جناب سید العلماء السید علی نقی النقیوی دامت مکارمہ اور ان کے کمال علم و فضل سے یا ان کے مصنفات کی جلالہ قدرت سے نا آشنا ہو لیکن چونکہ عالم اسباب میں عظیم ترہستیوں کی پشت پر بھی تصدیق و تائید کرنے والے مناسب حضرات رکھے گئے ہیں جیسے جناب موسیٰ علیہ السلام کی تصدیق کے لیے ہارون علیہ السلام اور حضرت سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تصدیق و تائید کے لیے حضرت علی مرتضیٰ علیہ السلام، اسی طرح میں بھی کتاب ”شہید انسانیت“ کے تعارف کے لیے قلم اٹھا رہا ہوں۔

میں ہمیشہ سے یہ سمجھتا رہا ہوں کہ جناب سید العلماء دام مجدہ علم و فضل کے بلند ترین مقام پر ہیں اور تقریباً ہر علمی شعبہ میں خداداد کمال اور ذوق بے مثال رکھتے ہیں اس اعتبار سے وہ مجتہد العصر نہیں بلکہ وحید عصر اور نادرہ روزگار اور حقیقتاً سید العلماء ہیں۔ چونکہ ہر کلام اپنے منظم کے صفات و کمالات کا آئینہ دار ہوتا ہے لہذا سید العلماء کا ہر کلام سید الکلام اور ان کی ہر کتاب کتابوں کی سید و سر دار ہے۔ کتاب شہید انسانیت بھی جناب موصوف کی نگارش قلم ہے ابتداءً مسودہ کتاب میں کچھ نامانوس اور غیر مشہور چیزیں آگئی تھیں لیکن موجودہ طباعت میں جناب موصوف نے نظر ثانی فرما کر ہر امر کا لحاظ فرماتے ہوئے ہر مضمون کو مطبوع اور مانوس حیثیت میں پیش کیا ہے۔ میں نے کتاب پیش نظر کو ادل سے آخر تک دیکھا ہے۔ صرف کتابت کے اغلاط کو درست کیا گیا ہے۔ یہ کتاب یقیناً ہر قوم و ملت کے لیے مفید ہے کیونکہ جناب موصوف نے یہ کتاب ایسی نرم اور ہموار سطح پر

۳۰۰

۳۰۴

۳۰۹

۳۱۵

۳۲۰

۳۲۱

۳۱۸

۳۳۹

۳۴۵

۳۶۵

۳۷۱

۳۸۶

۳۹۳

۳۹۸

۵۰۶

۵۱۰

۵۲۳

۵۳۰

۵۴۱

۵۴۳

۵۴۶

۵۴۹

۵۹۹

۲۴۔ صلح کی باتیں

۲۵۔ بندش آب اور غلبہ تشنگی

۲۶۔ صلح کی آخری کوشش اور اس کا انجام

۲۷۔ شب عاشور یعنی محرم کی دسویں رات

۲۸۔ دسویں محرم ۱۱۱۰ھ، اقامت محنت اور آغاز حرب

۲۹۔ انصارِ امام کے حالات اور حیرت انگیز قربانیاں

۳۰۔ اقرائے امام، یعنی بنی ہاشم کی قربانیاں

۳۱۔ جہادِ آخر اور شہادت

۳۲۔ شہادت کے بعد

۳۳۔ امیری اہل حرم کے واقعات پر ایک جامع تبصرہ

۳۴۔ ائمہ اہل بیت کے مختصر حالات

۳۵۔ گزشتہ واقعات کی روشنی میں حسینی شخصیت اور کارنامہ حسینی پر تبصرہ

۳۶۔ فتح کس کی ہوئی؟

۳۷۔ مجرموں کی پریشانی

۳۸۔ عالم اسلامی کے تاثرات

۳۹۔ آثار انقلاب و ائمہ حترہ خلافت ابن زبیر، اضطراب عراق و ایران اور دیگر جزئی واقعات

۴۰۔ جماعت تو آئیں

۴۱۔ خون ناحق کا انتقام

۴۲۔ اموی حکومت کا انجام

۴۳۔ بنی عباس کی سلطنت

۴۴۔ تبدیل ذہنیت

۴۵۔ اخلاقی نتائج

خاتمہ کتاب: عالم انسانی کو اصلاح عمل اور اتباع اسوۂ حسینی کی دعوت

خاندان رسالت اور ان کے متبعین پر ظلم و تشدد رہا۔ مسلمانوں کی دنیا میں کوئی برائی تھی جو مٹ گئی ہو اور کوئی بھلائی تھی جو پلٹ آئی ہو۔ یزید کے بعد مردان اور مردان صفت خلیفہ ہوتے رہے۔ کیا وہ یزید سے کچھ کم تھے؟ ائمہ اہل بیت کی انتہائی خاموشی اور صابرانہ زندگی کے باوجود ان پر کیا ظلم و ستم نہ ہوئے۔ سادات اور ان کے متوسلین کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر تہ تیغ کیا جاتا رہا۔ زندہ دیواروں میں چننا جاتا رہا۔ ان کے خون سے گارے بنائے گئے۔ مرقدِ حسین کو بے نشان کرنے کے لیے پانی چھوڑا گیا۔ پل پھلائے گئے۔ روضہ حسینی میں کتنی بار آگ لگائی گئی اور اس کو تباہ کیا گیا۔ علی رضی اللہ عنہ پر کت تک سب دھم ہوتا رہا اور گانے و ایوں سے ان کی بھوکائی گئی۔ کیا دنیا کے ظلم و جور، قہر و استبداد کا رنگ کچھ بدلا؟ نہیں۔ دنیا جوں کی توں رہی بلکہ بد سے بدتر ہو گئی۔ پھر یہ کیسے کہا جائے کہ ان مقاصد کے لیے امام نے بیعت کرنا نامنظور اور شہادت کو منظور کیا۔ انکارِ بیعت کا سبب تو کچھ ادھر ہی تھا۔

یہ لفظ بھی زباںِ نذرِ خاص و عام ہے کہ امام نے بیعتِ یزید سے اس لیے انکار کیا کہ وہ شراب خوار تھا، زانی تھا، ظالم تھا، فاسق و فاجر تھا۔ یہ نظریہ بظاہر خوش آئند ہے۔ جو اٹھتا ہے اسی پر اپنے خیالات کی عمارت بناتا چلا جاتا ہے لیکن حقیقت سے کوسوں دُور ہے یہ نظریہ۔ ابتداء میں کچھ سوچ سمجھ کر پھیلایا گیا ہو گا جس کی اب ہر شخص بغیر سوچے سمجھے رٹ لگا رہا ہے۔ اس طریقہ سے اصل میں یہ تاثر ہم پہنچانا تھا کہ یزید وہ پہلا دعویدارِ خلافت تھا جو فاسق و فاجر تھا۔ اس سے پہلے فضا ٹھیک تھی اس لیے امام حسینؑ اور ان کے خاندان کی طرف سے یہ انکارِ بیعت کا پہلا واقعہ ہے۔

ایسا کہنے والوں سے اگر یہ پوچھا جائے کہ اچھا اگر یزید شراب خوار، زانی اور فاسق نہ ہوتا تو کیا امام اس کی بیعت کر لیتے؟ بے خبر دنیا تو شاید کہہ دے کہ کر لیتے لیکن بانجھ فرائی ہو کر بولے گا کہ ہرگز نہیں۔ پھر رگزن نہیں تو انکارِ بیعت کا سبب یہ فسق و فجور کہاں رہا؟ یہ بات تو بالکل ختم ہی ہو گئی اور امام کا انکارِ بیعت تو کسی ادھر ہی سبب سے ہوا جس کو ہم آئندہ بیان

تحریر فرمائی ہے جو ہر مذہب و ملت کے لیے لائق قبول ہو۔ ہو سکتا ہے کہ جنابِ مسلم بن عقیل علیہ السلام کی آخری جنگ والا حصہ کسی اور صاحبِ قلم کا ہو کیونکہ آپ کا وہ شاہکار شجاعت جو کتب تاریخ میں پایا جاتا ہے پورے طور پر نمایاں نہیں ہوا۔

مسئلہ بیعت جو واقعہ کر بلا کی اصل بنیاد ہے اگرچہ جنابِ موصوت نے اس کو انتہائی لطافت سے پیش کیا ہے لیکن ظاہر ہے کہ کتاب کو ہوا اور معتدل رکھنے کے سبب سے پوری توضیح نہیں ہو سکتی تھی۔ اس لیے اس مسئلہ کی مختصر توضیح کی جاتی ہے۔

یہ تو دنیا جانتی ہے کہ امام حسین علیہ السلام اور ان کے اقرباء و انصار نہ کسی قتل کے قصاص میں قتل کیے گئے نہ کسی اور جرم کی پاداش میں۔ وہ قتل کیے گئے صرف اس بنا پر کہ

انہوں نے بیعتِ یزید نہیں کی۔ لیکن یہ کہ امام نے بیعتِ یزید کیوں نہ کی، انکارِ بیعت کا سبب کیا تھا اور وہ کیا چیز تھی کہ بیعتِ یزید کے مقابلہ میں امام کو اپنا بھرا گھر ٹا دینا اور ہر ابھرا باغ کٹوا دینا آسان نظر آیا۔ کیا امام کو یہ توقع تھی کہ اس عظیم قربانی کے بعد خلافت

اپنے صحیح اصول پر آجائے گی، یزید اور یزیدیت کا خاتمہ ہو جائے گا۔ حق مانا جائے گا اور باطل مٹ جائے گا، ظلم و جور کی حکمرانی ختم ہو جائے گی۔ امتِ مسلمین حق سے وابستہ

اور باطل سے کنارہ کش ہو جائے گی اور ان کی سوتی ہوئی دنیا جاگ جائے گی۔ آلِ محمد اور ان کے متبعین پر جو ظلم و ستم ہو رہا ہے اس کا سلسلہ ختم ہو جائے گا اور میرے بعد میرا خاندان

اپنے متبعین کے ساتھ آرام اور عافیت کی زندگی بسر کرے گا۔ بدعتیں ختم ہو جائیں گی اور شریعتِ حق کا ہر طرف سے خیر مقدم ہوگا۔ اگر ان باتوں میں سے کوئی بات ہو گئی ہوتی تو ہم یہ سمجھیں

حق بجانب ہو سکتے تھے کہ امام نے ان اغراض و مقاصد کو سامنے رکھ کر بیعت نہ کی اور اس عظیم قربانی کو قبول کیا۔ زورِ شاعری اور زورِ تقریر چاہے کسی سے یہ نتائج بیان کرانے

اور نہ کسی طور پر اس شہادت کے نتیجے میں یہ سبز باغ دکھا دے لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہی خلافت کا رنگ رہا، وہی ظلم و جور رہا، وہی باطل پسندی اور حق سے دوری رہی، وہی

کریں گے۔ یہاں یہ بات بھی لائقِ توجہ ہے کہ یزید کی مبتینہ بدکرداری اس کے باپ کی زندگی ہی میں تھی یا بعد میں رونما ہوئی؟ یاد رکھیے کہ امام نے حضرت معاویہ کی زندگی ہی میں خلافتِ یزید کی قرارداد سے انکار کیا تھا۔ اس کے بعد مدینہ میں حضرت معاویہ کی خبر وفات اور امام سے بیعتِ یزید کی طلب یہ دونوں چیزیں ایک ساتھ پہنچی تھیں لہذا امام اور دہریوں کی نظر میں یزید کی وہی زندگی تھی جو اس کے باپ کے سامنے تھی۔ وہ جیسا بھی تھا اپنے باپ کی زندگی ہی میں تھا۔ پھر ایسے ناسق و فاجر کو خلافت کے لیے نامزد کرنا اس کا الزام نامزد کرنے والے پر آئے گا یا نامزد ہونے والے پر؟ یزید خود سے تو خلیفہ نہیں بنا، اس کو تو خلیفہ بنایا گیا۔ اب فسق و فجور کے توازن میں کس کا پتہ بھاری رہتا ہے۔ پھر یہ بھی سوچنا پڑے گا کہ وہ کون سے ایسے سنگین گناہ تھے جن کے لیے یزید کو منفرد اور مہیا شخص کہا جاسکے اور یہ سمجھا جاسکے کہ ایسے سنگین گناہ یزید سے پہلے نہ تھے۔ بیشک شرابخواری اور زنا کاری سنگین اور گناہِ کبیرہ ہیں لیکن ان گناہوں کا تعلق گنہگار کی ذات سے ہے۔ ان گناہوں کے مقابلہ میں مومنین کا دیدہ و دانستہ قتل ناسق وہ سنگین ترین گناہ ہے جس پر قرآنِ کریم کے کھلے الفاظ میں وعیدِ جہنم ہے۔ مومن کے قتلِ عمد کے سامنے شراب نوشی اور زنا کیا چیز ہے؟ اور یہ قتلِ مومن کی جزا کا جہنم ہونا اس وقت ہی ہے جبکہ یہ مقتول مومن عام مومنین میں سے ہو اور یہ قتل صرف ایک مومن کا ہو تب اس جرم کی سزا جہنم سے کم نہیں اور اگر وہ مقتول صرف مومن ہی نہ ہو بلکہ مشقی، متعبد، فقیہ، عارف اور صحابی رسول بھی ہو تو اس جرم کی سنگینی کتنی بڑھ جائے گی اور ایسا مقتول اگر محض ایک ہی نہ ہو بلکہ بہت سے ہوں تو یہ جرم کہاں سے کہاں پہنچے گا؟ اور ایسے توازنِ جرم کے مقابلہ میں شراب نوشی اور عیاشی کیا چیز رہ جائے گی۔ میں یہاں جنگِ صفین کا کوئی ذکر نہیں کر رہا ہوں بلکہ امام حسن علیہ السلام اور مالکِ اشتر ایسے حضرات کو زہر دلانے کا بھی ذکر مقصود نہیں ہے کیونکہ اس پر کچھ نہ کچھ پردہ ضرور ہے۔ یہ خدا ہی جانتا ہے کہ معاویہ نے کتنے بے خطا اور ایماندار حضرات کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ تمام واقعات مذکورہ

تاریخ سے قطع نظر کر کے اگر صرف حجر بن عدی اور ان کے ساتھیوں کے قتل ناسق پر ہی نظر کی جائے جو مرج عذرا میں تہ تیغ کیے گئے، اور ان چھ حضرات کو ایک ساتھ موت کے گھاٹ اتار دیا گیا اور ساتویں شخص عبدالرحمن بن حسان نامی کو حضرت معاویہ کی ہدایت کے مطابق زیاد نے زندہ زمین میں دفن کرا دیا۔ یہ وہ لوگ تھے جن کے قتل سے اُمّ المؤمنین حضرت عائشہ اور امام حسین علیہ السلام نہایت دردناک، ملول اور شاکی ہوئے۔ حضرت اُمّ المؤمنین عائشہ نے ان لوگوں کو علمی طاقت اور فقهی قابلیت کے اعتبار سے عرب کا سر اور دماغ فرمایا۔ جن کے قتل سے باز رکھنے کے لیے حضرت عائشہ نے عبدالرحمن بن عمار بن ہشام کو حضرت معاویہ کے پاس بھیجا اور کہا یا کہ معاویہ تم حجر اور ان کے اصحاب کے بارہ میں خدا سے ڈرنا لیکن اُمّ المؤمنین کے قاصد مذکور کے دہاں پہنچنے سے پہلے یہ کامل الایمان حضرت قتل کیے جا چکے تھے۔ ان بے خطا لوگوں کے قتل کی خبر سن کر حضرت عبداللہ بن عمر جیغیں مار مار کر رونے لگے اور ربیع بن زیاد ساری حاکم خراسان نے درد مند ہو کر جمعہ کے دن اس امر کی دعا کی کہ خداوند اب جلد ربیع کی یعنی میری روح کو بھی قبض کر لے اور مجمع سے خواہش کی کہ وہ آمین کہے چنانچہ وہ مسجد سے نکلے ہی کہ مر گئے۔ اس پر متزاد یہ کہ صحابی رسولؐ عمر بن حنظلہ کو پیغمبرؐ نے سلام لکھا یا تھا اور جو بقول امام حسینؑ ایسے صراح اور عبادت گزار تھے کہ کثرتِ عبادت سے ان کا جسم گھل گیا تھا، بدن ڈھل گیا تھا، چہرہ پر زردی چھا گئی تھی، ان کی گرفتاری کا حکم ہوا اور حضرت معاویہ کی خصوصی ہدایت کے مطابق ان پر نیزہ کے نو وار کیے گئے حالانکہ وہ پہلے یا دوسرے ہی زخم میں دنیا سے رخصت ہو چکے تھے یعنی ان کی شہادت کے بعد بھی کم از کم سات مرتبہ نبیؐ مارا گیا۔

یہ اقدام بھی حضرت معاویہ کا کس قدر خلافِ شریعت اور مخالفِ ارشادِ نبویؐ تھا کہ انھوں نے محض اس بنا پر کہ ان کے باپ ابوسفیان نے مادرِ زیاد سے زنا کیا تھا زیاد کو اپنا بھائی اور ابن ابی سفیان قرار دے دیا۔

کیا گیا اور شہادتِ حق کے بعد حسینؑ کی موجودگی میں یزید کی ولیعهدی کا چھپا ہوا منصوبہ کھل کر سامنے آ گیا۔ اگر محض امام حسنؑ کا دُعا رافع تھا تو وہی دُعا رافع امام حسینؑ کا تھا۔ صرف امام حسنؑ کو زہر دانا اور اس کے بعد دس برس تک امام حسینؑ کو چھوڑے رکھنا اور ان کے خلاف ایسا کوئی حربہ نہ استعمال کرنا جس سے ان کی شیعہ حیات گُل ہو جائے اسکی کوئی نہ کوئی وجہ ہے اور وجہ یہی ہے کہ صلح نامہ میں امام حسنؑ کے نام کی تخصیص ہے یہ بات سچی تھی کہ معاویہ کے بعد خلافت پھر امام حسنؑ کی طرف منتقل ہوگی۔ اس شرط نے یہ مسئلہ صاف کر دیا کہ امام حسنؑ نے صرف عارضی طور پر نظامِ حکومت حضرت معاویہ کے سپرد کر دیا تھا۔ وہ مستقل خلیفہ قرار نہیں دیے گئے، کیونکہ سنی، شیعہ دونوں نقطہ نظر اس پر متفق ہیں کہ ہر خلیفہ کو حق ہے کہ وہ اپنے بعد کے لیے خلیفہ معین کرے اور خلیفہ مابعد کی تصریح کرے۔ جیسا کہ حضرت ابوبکرؓ نے حضرت عمرؓ کو معین کیا اور حضرت عمرؓ نے خلافت کو چھ نامزد افراد میں منحصر کیا۔ نامزدگی دونوں حضرات نے کی اور وہ عموماً تسلیم کی گئی۔ حضرت علی مرتضیٰؓ نے اپنے بعد کے لیے امام حسنؑ کو نامزد فرمایا اور ہر امام آخر تک اسی طرح اپنے بعد کے لیے نامزد کرتا رہا۔ جبکہ دونوں مذہب میں ہر خلیفہ کا حق استخلاف موجود ہے مگر غیر خلیفہ کو نہیں تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ خلیفہ ہے تو اسکو حق استخلاف بھی ہے اور جس کو حق استخلاف نہیں تو وہ خلیفہ بھی نہیں، لہذا یہ شرط کہ معاویہ کو حق استخلاف نہ ہوگا رکھی ہی اس لیے گئی تھی کہ دنیا ان کو خلیفہ نہ سمجھ بیٹھے۔ اگر ان کو خلیفہ مان کر حکومت دی گئی ہوتی تو ان کو استخلاف کے لیے بے بس کیوں کیا جاتا؟ جبکہ سنی شیعہ کسی کے یہاں بھی کوئی خلیفہ حق استخلاف سے محروم نہیں۔ مجھے تعجب ہے کہ عموماً اہل نظر نے بھی اس شرط اور اس معاہدہ کی افادیت پر نظر نہیں کی۔

جب یہ بات ثابت ہے کہ امام حسنؑ و امام حسینؑ اور ان کے خاندان اور تبعین نے خلافت حضرت معاویہ ہی کو تسلیم نہیں کیا (جیسا کہ اردنی بنت عبدالمطلب کی اس گفتگو سے

امیر شام کے یہاں گانے والوں کی قدر و منزلت ہوتی تھی اور وہ سرور و نشاط میں بھر کر تھرکنے لگتے تھے۔

مقام بن معدی کرب نے خود حضرت معاویہ سے کہا کہ میں تمھارے یہاں سونے کا پہننا اور نہ جانوروں کی کھال پر بیٹھنا، پائخانوں کا رُخ قبلہ کی طرف ہونا یہ سب دیکھ رہا ہوں جو خرام اور خلافِ شریعت ہے۔ امیر شام مذکور نے عرفہ کے روزِ حج میں تبلیغہ (لبیک کہنا) ممنوع قرار دے دیا۔ مدینہ میں نماز عشا پڑھائی تو نہ بسم اللہ پڑھی نہ بعض تکبیریں کیں اور اہل مدینہ کے ٹوکنے پر بھی کوئی اعتنا نہ کی۔ یہ تمام چیزیں ہی کتاب ”شہیدانِ انسانیت“ کے صفحہ ۱۲ تا ۱۳۵ میں پڑھ لیں۔ ان تمام چیزوں سے زیادہ یزید کا اس کی تخت نشینی کے وقت وہ کون سا فسق و فجور تھا جس کی وجہ سے فسق و فجور میں اس کو منفرد اور بے مثال کہا جاسکے۔ امام سے طلبِ بیعت کے وقت نہ اس کے دامن پر قتلِ اہل بیتؑ کا دھبہ تھا نہ کعبہ کی بے حرمتی کا، نہ اہل مدینہ کی غارت گری کا۔ بیعتِ یزید سے امام اور ان کے خاندان کا انکار کوئی پہلی اور نئی بات نہ تھی۔ کیا امام حسنؑ اور امام حسینؑ نے حضرت معاویہ کو حقدارِ خلافت تسلیم کر لیا تھا؟ کیا امام حسنؑ نے ان کو صحیح حقدارِ خلافت مان کر حکومت ان کے سپرد کی تھی؟ ہرگز نہیں۔ اس صلح میں یہ قرارداد بڑی اہمیت رکھتی ہے کہ معاویہ کو اپنے بعد کسی کو خلافت کے لیے نامزد کرنے کا حق نہ ہوگا بلکہ بعض جگہ تو یہ بھی مذکور ہے کہ خلافت بعدِ معاویہ پھر حسنؑ کی طرف منتقل ہوگی اور یہ امر اس بات سے بالکل ثابت ہو جاتا ہے کہ حضرت معاویہ نے امام حسینؑ کے وجود کو نہیں بلکہ امام حسنؑ کے وجود کو یزید کی ولیعهدی کے لیے سب راہ سمجھا اور جب تک امام حسن علیہ السلام کو زہر دلا کر شہید نہ کر دیا اس وقت تک یزید کی ولیعهدی کو زبان سے نہ نکالا۔ عزت و دُعا کے اعتبار سے امام حسنؑ اور امام حسینؑ دونوں بھائی ایک جیسے تھے۔ پھر یہ کیا بات ہے کہ جب تک امام حسنؑ زندہ رہے یزید کی ولیعهدی کا اظہار نہ

لیکن متعلق حضرات نے محسوس کر لیا کہ یہ تشدد کارگر نہیں ہو سکتا بلکہ خطرناک اور مضر ہوگا خاموش ہو گئے۔ اس کے بعد یزید سے پہلے تک ہر خلیفہ اس ہی نظریہ پر رہا کہ افراد اہل بیت جبہ ہاری خلافت کی بناء پر ہم سے جنگ آزمانہیں۔ ہم ان کے ترک بیعت پر ان سے کیوں جنگ کریں۔ یزید پر جو انی اور حکومت کا نشہ سوار تھا۔ اس کو آل محمد کی قوت آزادی کا صحیح اندازہ نہ تھا اس نے تشدد کی انتہا کر دی مگر امام تو امام اس گھر کا کوئی بچہ، بڑا غلام، کینز، فدائی، شیدائی کسی کو بھی اس کے مقام عزم سے نہ ہلایا جاسکا لہذا حسین کا طرز عمل کوئی نیا طرز عمل نہ تھا البتہ جو طرز عمل حسین کے ساتھ اختیار کیا گیا وہ ضرور نیا تھا۔

اب ہم انکار بیعت کے سبب پر روشنی ڈالتے ہیں:-

بات یہ ہے کہ تمام کائنات عالم کا خالق صرف ایک ہے جس کا کوئی دوسرا نہیں ہے "جو تیرے سوا ہے وہ ترابندہ ہے" جب تمام مخلوق کا خالق صرف ایک ہے تو اس مخلوق پر اطاعت بھی صرف اس ایک ہی ذات کی ہے دوسرے کی نہیں۔ چاہے وہ دوسرا شان و شوکت، عزت و طاقت کے اعتبار سے کتنا ہی بلند کیوں نہ ہو کیونکہ وہ بھی مخلوق ہونے میں اس ہی مخلوق کی مش ہے۔ اَللّٰهُ الْخَلْقُ وَالْاَمْرُ۔ خالق بھی صرف وہی ہے اور امر و حاکم بھی صرف وہی، البتہ اگر وہ خالق ہی کسی کی اطاعت کا حکم دے تو یہ اطاعت کسی کی وجاہت کی بناء پر نہ ہوگی بلکہ حکم خدا کی اطاعت اور صرف خدا کی اطاعت ہوگی اور اگر اس کے حکم کے باوجود اطاعت نہ ہوگی تو یہ اسکی نافرمانی نہ ہوگی جسکی اطاعت کا حکم خدا نے دیا تھا بلکہ حکم خدا کی مخالفت اور خدا کی نافرمانی ہوگی۔ اللہ نے ایمان والوں کو حکم دیا ہے کہ وہ اللہ اور رسول اور اولی الامر کی اطاعت کریں۔ یا ایہذا الذین امنوا اطیعوا اللہ واطیعوا الرسول واولی الامر منکم۔ بعض حضرات کم علمی کی وجہ سے لفظ منکم کو لفظ اولی الامر سے متفصل دیکھ کر یہ سمجھ لیتے ہیں کہ منکم صرف اولی الامر کے لیے کہا گیا ہے حالانکہ یہ غلط ہے۔ لفظ منکم رسول اور اولی الامر دونوں کے لیے کہا گیا ہے۔ بکہ اگر پہلا جملہ اطیعوا اللہ الگ نہ کر دیا گیا ہوتا اور ایک ہی جملہ قرار دے کر یہ کہا جاتا

ثابت ہے جو حضرت معاویہ سے ہوئی اور کتاب حاضر میں کسی جگہ مذکور بھی ہے تو انکار بیعت یزید اس گھرانے کی طرف سے کوئی پہلی مثال ہرگز نہ تھی۔ حق تو یہ ہے کہ علی رضی اللہ عنہ سے لے کر گیارھویں امام تک ہر امام کا مستقل یہ شعار رہا کہ اپنے اپنے عہد کے حکمران کی حکمرانی کو ضرور برداشت کرتے رہے اور کسی امام نے بھی اپنے حق حکومت کو حاصل کرنے کے لیے اگرچہ قتال و جدال نہیں کیا لیکن ان میں سے ایک امام نے بھی کسی کا استحقاق خلیفہ ہونا تسلیم نہیں کیا۔ یہی وجہ ہے کہ تیسری خلافت کے انعقاد کے وقت علی رضی اللہ عنہ نے کسی بھی حکمران کے اتباع کی شرط کو مان کر اپنا خلیفہ ہونا پسند نہ کیا اور یہی وجہ ہے کہ علی رضی اللہ عنہ سے لے کر گیارھویں امام تک ایک امام بھی کسی عہد حکومت میں کسی عہد حکومت پر نہ آیا اور نہ لایا جاسکا۔ نہ کسی جہاد اور ہم میں شریک ہو سکا۔ کیا یہ تعجب کی بات نہیں ہے کہ یا تو امام حسن اپنے باپ کے بعد تھے امیر المومنین اور خلیفہ راشد یا صلح کے بعد اپنی دس سالہ زندگی میں صرف مدینہ کے بھی حاکم نہ رہے۔ امام حسین عہد حکومت معاویہ میں میں برس مدینہ میں رہے مگر ایک دن کے لیے بھی صرف مدینہ کے بھی حاکم نہ رہے بلکہ امامین کی موجودگی میں دوسرے ہی لوگ مدینہ کے حاکم ہوتے رہے جن کو حسن و حسین سے کسی طرح کوئی نسبت ہی نہیں۔ آخر ہر امام کا حکومت اور حکومت کی ہر مہم سے دور رہنا، ہر حکومت کی ان پر کڑی نگاہیں کسی کے لیے قتل اور کسی کے لیے قید و بند کیوں ہوتا؟ اگر وہ اپنے اپنے عہد کی حکومتوں کے سامنے ہر تسلیم خیم کیے ہوتے اور حکومتیں یہ سمجھتیں کہ یہ لوگ ہم کو خلیفہ بحق تسلیم کرتے ہیں۔ انکار بیعت خلیفہ حسین کے گھرانے میں شریک رہا ایسے حسین وہ پہلے شخص نہیں جسے انکار بیعت کیا ہو خود اس کتاب میں کسی جگہ لکھا کہ آیا ہے کہ ابن زیاد کی تحریر پر ابن سعد نے یہ کہا کہ حسین ہرگز بیعت نہ کریں گے۔ ان کے سینہ میں ان کے باپ (علی) کا دل ہے۔ ابن سعد کا یہ جملہ صاف ترجمانی کر رہا ہے کہ کسی تشدد سے متاثر ہو کر علی نے بیعت نہ کی تو حسین ان ہی کے بیٹے ہیں اور ان کے سینہ میں علی ہی کا دل ہے۔ خلافت کے ابتدائی مرحلوں میں علماء سے بیعت لینے کے لیے ضرور ایک بار تشدد کو آزمایا گیا تھا

اطيعوا الله والرسول واولى الامر منكم تو لفظ منكم اللہ رسول، اولی الامر
 کے لیے ہو جاتا اور ترجمہ یہ ہوتا کہ ایمان والو تمہاری ہی جنس سے جو اللہ رسول، اولی الامر میں
 ان کی اطاعت کرو۔ ظاہر ہے کہ اللہ ہماری جنس سے نہیں اس لیے جملہ اطیعوا اللہ کو الگ رکھا
 تاکہ لفظ منکم اللہ کے بارے میں نہ رہے۔ رسول اور اولی الامر چونکہ ہماری جنس سے ہیں اس
 لیے ان کو منکم کہا اور کہا اس لیے کہ رُسل اور اولی الامر مَلَک میں سے بھی ہیں جیسے کہ فرمایا
 عِیَّا اِنَّہٗ لَقَوْلُ رَسُوْلٍ کَرِیْمٍ یا جیسے فرشتہ نے حضرت مریم سے کہا اِنَّا رَسُوْلُ رَبِّکَ
 یا جیسے حضرت ابراہیم اور حضرت لوط کی طرف آنے والے فرشتوں کے لیے کہا گیا جَاءَتْ رُسُلُنَا
 بِمِیْرَآئِکُمْ ہٰی کے بارے میں فرمایا تَنَزَّلُ الْمَلَائِکَةُ وَالسَّوْحٰ فِیْہَا بِاِذْنِ رَبِّہِم مِّنْ
 عَلٰی اَمْرِ خَالِدٍ بَنَاتٍ اَمَوَا (قرآن کریم) یہ رُسل اور اولی الامر جو مَلَک میں ہماری
 جنس سے نہیں، نہ ہم پر ان کی اطاعت ہے۔ لٰہٰذَا آیَہُ اطِیْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولٰٓئِیَ الْاَمْرِ مِنْکُمْ
 میں منکم قید احترازی ہے کہ تم پر اطاعت اُن رُسل اور اولی الامر کی نہیں جو تمہاری
 جنس سے نہیں ہیں بلکہ اُس رسول اور اُن اولی الامر کی ہے جو تمہاری جنس سے ہیں۔
 رسول اور اولی الامر دونوں کی اطاعت کا حکم ایک جملہ میں ایک ہی شان سے دیا گیا ہے۔
 حکم اطاعت میں نہ کسی حکم کی قید نہ کسی حکم کا استثناء۔ ہر حکم کی اطاعت ہر مومن پر فرض کی
 گئی جس سے ثابت ہے کہ رسول اور اولی الامر کا ہر حکم مطابق مثبت الٰہی ہے۔ کوئی حکم
 منشاء الٰہی کے مخالفت نہیں ہو سکتا۔ پس وہ سب معصوم عن الخطاء ہوئے جس طرح رسول
 نہ کوئی خود سے ہو سکتا ہے نہ غیر خدا کے بنائے بن سکتا ہے اسی طرح اولی الامر کا تعین
 بھی بجانب اللہ ہے۔ اسی لیے ان کی اطاعت بھی ہر امر میں بامر اللہ ہے۔ بلکہ لفظ منکم
 کی قید احترازی نے یہ بات اچھی طرح واضح کر دی کہ جو رُسل اور اولی الامر تمہاری جنس
 سے نہیں ہیں اگرچہ وہ سب اللہ ہی کے منتخب کیے ہوئے ہیں لیکن اس کے باوجود تم پر
 ان کی اطاعت نہیں، تو پھر جس رسول اور جن اولی الامر کو تم نے معین کیا ہو ان کی اطاعت

تم پر کیسے فرض ہو سکتی ہے۔ مختصر یہ کہ انسان پر صرف اللہ رسول اور اولی الامر کی اطاعت
 ہے جو مطلق اور بغیر کسی قید کے ہے مگر اس اطاعت کے لیے جبر و اکراہ نہیں
 ہے جس کا دل چاہے اطاعت کرے نہ چاہے نہ کرے مگر دنیا میں جہاں اطاعت کی بہترین مثالیں ہیں وہاں
 ترک اطاعت کی آخری مثالیں ہیں۔ حد ہے کہ خدا نے حقیقی کے مقابل میں خدا بن گئے یا بنا لیے
 گئے۔ رسول کے مقابل میں رسول اور اولی الامر کے مقابل میں اولی الامر ہوئے۔ خدا نے
 حقیقی نے تو اپنی، اپنے رسول اور اولی الامر کی اطاعت کے لیے کوئی جبر و اکراہ
 روا نہ رکھا تھا لیکن مقابلہ والوں نے جبر و تشدد سے مطیع بنانا چاہا۔ یہیں سے حق و
 باطل کا فرق نمایاں ہو جاتا ہے۔ حق اپنے منوانے کے لیے کبھی تشدد نہیں کرتا کیونکہ
 حق اپنے نہ مانے جانے پر بھی حق ہی رہے گا مگر باطل اگر تشدد سے کام نہ لے
 تو وہ مانا کیسے جائے؟ اور نہ مانا جائے تو رہے کیا؟ یہی وجہ ہے کہ خدا رسول
 اور اولی الامر اپنے منوانے کے لیے کبھی زبرد آزما نہیں ہوئے۔ خدائی کا دعویٰ
 ہو یا نبوت و امامت کا، اگر محض دعویٰ کی حد میں رہے تو ان میں سے کسی کو بھی حرب و
 قتال کی ضرورت نہیں۔ اپنی جگہ جس کا جو دل چاہے کہتا رہے یہ سب برداشت کیا
 جا سکتا ہے اور برداشت کیا گیا ہے لیکن اگر خدائی کا مدعی چاہے کہ خود خدا بھی اسکو
 خدا مان لے، رسالت کا مدعی اگر چاہے کہ رسول برحق بھی اپنی رسالت کو خیر باد کہہ کر
 اس کو رسول مان لے، دلالت و امامت کے مدعی اگر یہ چاہیں کہ اولی الامر بھی ان
 کو اولی الامر تسلیم کر لیں تو یہ ہر ایک کے لیے ناقابل برداشت، ناممکن اور محال ہے۔
 اگر خدا نے غیر خدا کو خدا مان لیا تو یہ بات تو بعد کی ہے کہ وہ مانا ہوا خدا حقیقتاً خدا
 ہو گیا یا نہ ہوا لیکن خدا تو خدا نہ رہا۔ رسول نے اگر غیر رسول کو رسول مان لیا تو رسول
 رسول نہ رہا۔ اگر حقیقی ولی امر نے کسی غیر کو ولی امر مان لیا تو ولی الامر تو ولی الامر
 نہ رہا۔ اب رسول کے رسول نہ رہنے سے اور ولی الامر کے ولی الامر نہ رہنے سے

واجب ہے۔ تو اب صاحب الامر اس کے اتباع کی نیت ہی کیسے کر سکتا ہے جس پر خود اس کا اتباع لازم ہو۔ اس کے خلاف ایک ہی دقت میں یہ کیسے ممکن ہو سکتا ہے کہ صاحب الامر کر رہا ہو امام جماعت کا اتباع اور امام جماعت کر رہا ہو صاحب الامر کا اتباع۔

فرض کیجیے کہ اگر عہد رسول میں کوئی شخص مدعی رسالت ہو کر چاہتا کہ رسول اپنے دعوائے رسالت سے دست بردار ہو کر اس مدعی کی رسالت کو تسلیم کر لیں اور اپنی طاقت کے بل بوتہ پر انتہائی تشدد سے کام لیتا جب کہ رسول کے انصار کم سے کم اور مدعی باطل کے مددگار زیادہ سے زیادہ ہوتے تو کیا ایسی صورت میں ممکن ہوتا کہ رسول برحق اپنی رسالت کو خیر باد کہہ کر اُس کی رسالت کو تسلیم کر لیں؟ ہرگز نہیں۔ یقیناً اگر رسول کو یہ صورت پیش آتی تو آپ مدعی باطل کی کسی صورت میں بھی بیعت نہ کرتے چاہے وہ تشدد کتنا ہی سخت تر کیوں نہ ہوتا۔ نبی برحق کبھی اس کی بیعت نہیں کر سکتا تھا چاہے وہ کوئی فاسق و فاجر ہوتا یا ظالم و نیک اور پارہا ہوتا۔ اگر نبی پر انتہائی تشدد کیا جاتا تو پہلے آپ اظہار حق فرما کر اتمام حجت کرتے اور کم از کم یہ چاہتے کہ مخالفت اپنی جگہ ہو چاہے کچھ اور کرے مگر اس پر بضد نہ ہو کہ میں اس کے دعوے کو تسلیم کر لوں۔ اگر وہ یہ بھی نہ مانتا تو آپ یہ کوشش کرتے کہ مقابل اس پر ہی راضی ہو جائے کہ میں اپنے وطن، شہر اور ملک کو چھوڑ کر دور دراز کسی جگہ چلا جاؤں۔ اگر یہ صورت بھی قبول نہ کی جاتی اور دشمن صف آرا ہو کر قتال شروع کر دیتا تو آپ بھی اپنے انصار کو لے کر میدان قتال میں آتے اور دشمن کی بھرپور طاقت اور اپنے انصار کی کمی کی پروا نہ کر کے قتال کے ہواب میں قتال کرتے اور اپنا سب کچھ خدا کا بول بالا رکھنے کے لیے قربان کر دیتے۔ حسینؑ رسولؐ کے وارث بھی تھے اور خدا کے قرار دیے ہوئے صاحب الامر بھی تھے۔ یعنی

صرف ان ہی کے منصب کو زوال نہ ہو گا بلکہ جس خدا نے ان کو اپنے کمال علم اور انتہائے اعتماد سے منتخب کیا تھا وہ جاہل اور بے بس ثابت ہوا۔ پھر اس کا خدا ہونا کیسا؟ جس خدا کا نمائندہ اپنے خدا سے ٹوٹ کر باطل سے مل گیا اور جس خدا کو اپنے علم اور انتخاب پر ناز تھا وہ منہ دیکھتا رہ گیا تو اب کیسا خدا، کیسا رسول، کیسے اولی الامر کہاں کی کتاب کہاں کا دین؟ یہ سب ملیا میٹ ہو گیا۔ خدا کے مقابلہ میں کوئی خدا بن جائے تو خدا کی شان میں کوئی نقص نہیں آتا۔ رسول اور اولی الامر کے مقابلہ میں اگر دوسرے مدعی آجائیں تو رسالت اور امامت کے دامن پر اس سے کوئی دھبہ نہیں آتا۔ دھبہ اس دقت آئے گا جب کوئی بھی ان میں سے غیر خدا کو خدا یا غیر رسول کو رسول یا غیر اولی الامر کو اولی الامر مان لے اور یہ دھبہ جیسا کہ اوپر بیان ہو چکا ہے صرف مان لینے والے پر ہی نہ آئے گا بلکہ اس زنجیر کی ہر کڑی اور اس رشتہ کا ہر دانہ ایک دم ٹوٹ جائے گا۔ یہی وجہ ہے کہ ہر امام نے اپنے مقابلہ کی ہر صورت حال کو برداشت کیا اور اپنی امامت کو منوانے کے لیے اظہار حق سے آگے قدم نہ اٹھایا۔ اور خود سے کوئی تشدد کی راہ اختیار نہ کی۔ کیونکہ بندوں کو ان کی اطاعت کا حکم تھا۔ خود ان حضرات کو یہ حکم نہ تھا کہ بندوں کو اپنا مطیع بناؤ۔ ان کا فرض یہی تھا کہ وہ اپنا اولی الامر ہونا اور مقابل کا نہ ہونا ظاہر اور ثابت کرتے رہیں۔ اس کے بعد اطاعت کرنا نہ کرنا یہ دوسروں کا کام تھا۔ لیکن رسول اور اولی الامر یہ ان کے لیے ناممکن اور محال تھا کہ وہ کسی بھی تشدد سے متاثر ہو کر اپنے خدا اور رسول کو جھٹلا کر اپنے منصب کے مستحکم اور غیر کے منصب دار ہونے کے مقبر ہو جائیں۔ جس کے نتیجہ میں نہ خدا خدا رہے نہ رسول رسول رہیں اور خاتمہ ہو جائے دین، ایمان، کتاب ہر شے کا۔

بیعت تو بڑی چیز ہے، صاحب الامر تو غیر کی اقتدار میں نماز بھی نہیں پڑھ سکتا۔ کیونکہ اس غیر پر اس نماز کے وقت بھی منجانب اللہ صاحب الامر کی اطاعت

تمہید

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ وَالصَّلٰوةُ عَلٰی سَيِّدِ الْمُرْسَلِيْنَ وَالْبِطَاءِ الطَّاهِرِيْنَ

دنیا میں کوئی تعلیم یافتہ ایسا نہ ہوگا جس نے عرب کا نام نہ سنا ہو۔ عرب ایک ریگستانی ملک ہے جو ایشیا کی مغربی سرحد پر واقع ہے اور جس کے ساحل پر بحر احمر لیں مار رہا ہے۔ اسی ملک سے ساتویں صدی عیسوی شروع ہونے کے بعد ایک انقلاب کی لہر اٹھی جس کا نام ہے ”اسلام“۔ اس انقلاب کے بانی حضرت محمد بن عبد اللہ تھے جنہوں نے اپنی پیغمبری کا اعلان کرتے ہوئے دنیا کو کامل توحید کا پیغام پہنچایا اور بت پرستی، اقتدار پرستی، سرمایہ پرستی غرض کہ غیر اللہ کی ہر طرح کی پرستش کی مخالفت کی۔ اس سے ان لوگوں کو محاصمت پیدا ہو گئی جن کے اقتدار کو اس تعلیم سے نقصان پہنچتا تھا۔ انہوں نے اس انقلاب کو روکنے کی کوشش کی اور ان کے ہاتھوں پیغمبر کو بڑی تکلیفیں اٹھانا پڑیں۔

اس مخالفت میں بنی امیہ پیش پیش تھے۔ اس لیے کہ اگرچہ پیغمبر اسلام کی تعلیم براہ راست کسی خاندان کی بلندی اور کسی خاندان کی بستی کی حمایت نہیں کرتی تھی مگر آپ کی تعلیم میں بلندی اور عزت کا جو معیار قرار دیا گیا تھا وہ صرف کردار کی خوبی، فرائض انسانی کی بجا آوری تھی جس معیار پر بنی امیہ کے اکثر افراد پورے نہ اُترتے تھے۔ چنانچہ امیہ کے پوتے ابوسفیان بن حرب نے اسلام کے خلاف بغاوت کا جھنڈا بلند کیا۔ عرب کے ہٹ دھرم اور جاہل بت پرست اس علم کے نیچے جمع ہو گئے اور حضرت محمد مصطفیٰ کو ستانے اور تبلیغ اسلام میں روڑے اٹکانے لگے اور آپ براہ مصیبتیں اور سختیاں بھیلے رہے اور دائرہ آپ کے پیغام کی مقبولیت کا وسیع ہوتا گیا۔ یہاں تک کہ حجاز کے دو سرے اہم شہر مدینہ کے رہنے والوں نے اس تہذیب کو قبول

اس جماعت اولی الامر میں سے ایک تھے جن کی اطاعت اللہ نے کافہ مومنین پر فرض قرار دی تھی۔ جو ایسی حالت میں رسول کرتے وہی حسین نے کیا۔ اپنی عزیز ترین جانوں کو دے کر اپنی اور ہر امام کی امامت پر رسول کی رسالت پر خدا کی خدائی پر آج نہ آنے دی۔ حقا کہ بنائے لا الہ است حسین۔ صلی اللہ علی محمد وال محمد۔

السید محمد جعفر عفی عنہ

خطیب جامع شیعہ کوشن نگر (اسلام پور) لاہور

ہوئی کہ قرآنی احکام کی علانیہ مخالفت ہونے لگی۔

حضرت رسولؐ کے حقیقی جانشین جو اسلامی تمدن و تہذیب کے محافظ تھے اس کو کسی طرح برداشت نہ کر سکتے تھے جب علیؑ ابن ابیطالبؑ جو رسولؐ کے چچا زاد بھائی، ان کا آواز پر سب سے پہلے لبیک کہنے والے اور شروع سے آخر تک اسلام کی اشاعت میں ان کے دست و بازو تھے مسلمانوں کے تحت حکومت پر آئے تو انھیں حکومتِ شام سے مقابلہ کرنا پڑا اور صفین کی خونریز لڑائی ہوئی مگر ابھی حضرت علیؑ کا ارادہ اور کام مکمل نہیں ہوا تھا کہ مسجد کوفہ میں عین حالتِ سجدہ میں حضرت کے سر پر تلوار لگائی گئی جس سے آپؑ نے شہادت پائی۔ حضرت علیؑ کے بعد آپ کے بڑے فرزند امام حسنؑ نے کچھ شرائط کا پابند کرنے کے بعد حکومتِ شام سے صلح کر لی مگر حکومتِ شام نے ان شرائط کی پابندی نہیں کی اور خفیہ طور پر نہر دوا کران کی زندگی کا خاتمہ کر دیا۔ اب پیغمبر کے خاندان میں اصولِ اسلام کے تحفظ کی پوری ذمہ داری حسینؑ پر تھی جو حضرت محمد مصطفیٰؐ کے دوسرے نواسے اور حضرت علیؑ کے چھوٹے بیٹے تھے۔

حکومتِ شام کے تحت پر ابوسفیانؑ کا رتایزید بن معاویہ بیٹھا جو بڑا ہی شراب خوار اور بدکردار تھا اور ایسے اخلاقی جرائم کا مرتکب ہوتا تھا جن کا تذکرہ بھی تہذیب اور شائستگی کے خلاف ہے۔ اس کے باوجود اتنے دن کے مضبوط اموی اقتدار کی ہیبت سے عوام کو دم مارنے کی ہمت نہ تھی۔ وہ حکومت کے ظلم و ستم سے اذیتاں کھاتے تھے کہ خوفِ خدا کا احساس باقی نہ رہا تھا۔ مگر یزید جانتا تھا کہ حجاز کے ملک میں شہر مدینہ کے محاذی ہاشم کے اندر ایک انسان ہے جو مجھ سے نہیں ڈرتا، صرف خدا سے ڈرتا ہے اور وہ اصولِ اسلام کا حقیقی محافظ، رسولؐ کا نواسہ ہے۔ وہ خاموش سہی مگر کیا معلوم کس دن دنیا کی آنکھوں سے غفلت کے پرے ہٹ جائیں اور وہ سچائی کی طرف کھینچ جائے۔ اس بنا پر یزید کو فکر لاحق ہوئی کہ کسی نہ کسی طرح وہ حسینؑ سے بیعت حاصل کر لے۔ چنانچہ اس نے مدینہ کے حاکم ولید بن عقبہ بن ابی سفیان کو حکم بھیجا کہ حسینؑ سے بیعت حاصل کر دو اور اس معاملہ میں کسی مراعات سے کام نہ لو۔ حضرت امام حسینؑ نے اس پیغام کے معنی سمجھ لیے اور آپ اسے

کر لیا اور آپ سے نصرت کا وعدہ کر کے آپ کو اور آپ کے ساتھیوں کو واپس آنے کی دعوت دے دی۔ چنانچہ آپ کے ساتھ والے وہاں رفتہ رفتہ جاتے بھی لگے اور زیادہ تر پہلے گئے۔ جب مکہ والے آپ کے مخالفین نے یہ دیکھا تو اب انھوں نے ایک کر کے آپ کی جان لینے کا فیصلہ کر لیا اور رات کے وقت آپ کے مکان کو آ کر گھیر لیا مگر آپ اپنے چچا زاد بھائی حضرت علیؑ کو اپنے بستر پر لٹا کر خود ان کے حلقے سے نکل گئے اور مدینہ کی طرف روانہ ہو گئے۔ اس واقعہ کو ”ہجرت“ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے اور اسی سے مسلمانوں کے ہجری سن کی ابتدا ہوتی ہے۔ دشمنوں نے ہجرت کے بعد بھی آپ کو چین سے بیٹھنے نہ دیا اور کئی مرتبہ چڑھائی کر کے آپ کو قتل کرنے آئے۔ مجبوراً آپ کو کئی لڑائیاں لڑنی پڑیں جن میں بدر، احد اور آخر آب بہت مشہور ہیں۔ مگر ان تمام لڑائیوں میں ابوسفیانؑ کو ہر مرتبہ شکست ہوئی اور حضرت محمد مصطفیٰؐ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حامیوں کی تعداد اور ان کی طاقت برابر بڑھتی رہی۔ آخر بنی امیہ کی قوت بالکل ٹوٹ گئی اور اپنی کمزوری کو چھپانے کے لیے انھوں نے بھی قبولِ اسلام کی نقاب ڈال لی۔ مگر موقع کے منتظر رہے کہ اسلام کی طاقت کچھ بھی کمزور ہو تو انھیں اپنے گئے ہوئے اقتدار کو واپس لانے کا موقع ملے۔

حضرت محمد مصطفیٰؐ کی زندگی میں ان کی اس آرزو کے پورا ہونے کا کوئی امکان نہ تھا مگر اس کے خفیہ ہی عرصہ بعد حضرت کی وفات ہو گئی اور مسلمانوں کے نظام میں ابتری پیدا ہو گئی۔ سلطنتِ دقت کے دنیوی مصالحوں نے بنی امیہ کو شام میں اپنی حکومت قائم کر لینے کا موقع دے دیا جو شروع میں صرف ایک صوبہ دار یا گورنر کی حیثیت سے تھی مگر رفتہ رفتہ اس کے اقتدار اور قوت میں اضافہ ہوتا گیا۔ یہاں تک کہ آخر میں اس نے خود مختار سلطنت کی حیثیت حاصل کر لی۔

ان لوگوں نے شام کے ملک میں اپنا قبضہ جمانے ہی حضرت محمد مصطفیٰؐ کے راج کیے

مگر یہ لوگ اسلام کا بھلاؤ نہ تھا اور مسادات کو اپنے اندر شروع کر دیا اور آخر میں تیرہ حالت

ساتویں محرم سے آپ پر اور آپ کے تمام ساتھیوں یہاں تک کہ چھوٹے بچوں پر پانی بند کر دیا گیا مگر چونکہ امن پسندی حقیقی معنی میں آپ کا شعار زندگی تھا لہذا تمام حجت کے طور پر آپ نے یزیدی فوج کے افسر عمر بن سعد کے سامنے ایسے شرائط پیش کیے جن سے معاملات رو بہ اصلاح ہو جائیں اور جنگ کی ذمہ داری آپ کا طریقہ کار اتنا سبھا ہوا تھا کہ عمر بن سعد کو بھی اس بات کا قائل ہونا پڑا کہ حسینؑ صلح کے راستے پر گامزن ہیں چنانچہ اس نے کوفہ کے حاکم عبداللہ بن زیاد کے پاس اسی مضمون پر مشتمل ایک خط بھیجا مگر ابن زیاد کو حکومت کا غرور اور سلطنت کا نشہ تھا۔ اُس نے حسینؑ کو بچانا بھی نہ تھا کہ وہ مشکلات کا کہاں تک مقابلہ کر سکتے ہیں۔ اس نے آپ کی صلح پسندی کو کمزوری اور عاجزی کا نتیجہ خیال کرتے ہوئے عمر بن سعد کو لکھ بھیجا کہ حسینؑ غیر مندرجہ طریقہ پر اطاعت کر لیں جب ہی انکی جان بچ سکتی ہے۔ خیرت دار اور فرض شناس امام حسینؑ کے لیے ایسا ممکن نہ تھا۔

فوج محرم کی شام کو اس بڑے لشکر نے آپ پر حملہ کر دیا مگر آپ نے ایک شب کے لیے التوائے جنگ کی خواہش فرمائی جو نہ مشکل منظور کی گئی۔ آپ کا مقصد یہ تھا کہ آخری مرتبہ پوری رات جہادِ خدا میں بسر کر لیں۔ اس کے علاوہ دوست اور دشمن دونوں کو جنگ کے قطعی طور پر طے ہو جانے کے بعد سوچنے کا موقع دے دیں۔ دشمنوں پر اتمام حجت ہو جائے اور ساتھیوں میں سے کوئی ساتھ چھوڑ کر جانا چاہتا ہو تو چلا جائے۔ آپ نے اپنے ساتھیوں کو جمع کر کے صاف طور پر بتا دیا کہ کل ہمارے زندگی کا فیصلہ ہے۔ میں تم سے اپنی بیعت کی ذمہ داری ہٹائے لیتا ہوں۔ تم اس رات کے پردے میں جدھر چاہو چلے جاؤ مگر ان جاننا زدن نے اس موقع سے فائدہ اٹھانا نہیں چاہا اور یکے بڑے ہو کر کہا کہ ہم آپ کا ساتھ کبھی نہ چھوڑیں گے۔ ان لوگوں نے جو کہا تھا وہی کر دکھایا۔

ساتنے فوجوں کا سمندر لہریں مار رہا تھا۔ گرد و پیش دیرانی اور بربادی کے سوا کچھ اور نظر نہ آتا تھا۔ عزیزوں، بھائیوں، بھتیجوں اور اولاد کے خوبصورت پھرے امام کے سامنے تھے اور آپ کے ساتھ پردہ دار عورتیں اور چھوٹے بچے بھی موجود تھے۔ دریا پر فوج کا پہرہ بیٹھا ہوا تھا اور حسینؑ اور ان کے ساتھیوں تک ایک قطرہ آب کے پینچنے کی اجازت نہ تھی۔ بے زبان، بے سانس کی تہمت سے

پہلے ہی سے سمجھے ہوئے تھے۔
اصولاً آپ کے لیے یزید کی بیعت کرنا غیر ممکن تھا مگر قلم ہونا بیک آسان تھا مگر حفاظت خود اختیاری کے فرض کو انجام دینے کے بعد جو اسلامی شریعت کا ایک بنیادی حکم ہے۔
اس کے لیے حسینؑ نے ترکِ وطن کا فیصلہ کر لیا۔ آپ نے اپنے تمام متعلقین کو جن میں عورتیں اور بچے بھی تھے اپنے ساتھ لیا اور مکہ میں جا کر پناہ لی۔ اس طرح آپ نے یہ ثابت کر دیا کہ آپ کسی سے جنگ کرنا اور اپنی اور اپنے ساتھیوں کی زندگی کو معرض خطر میں ڈالنا نہیں چاہتے تھے بشرطیکہ آپ کو بیعت یزید پر مجبور نہ کیا جاتا۔

مکہ عرب کے بین الاقوامی قانون اور پھر اسلام کے رو سے ایک ایسا امن کا مقام تھا جہاں کسی متنفذ کے لیے خطرہ نہ ہونا چاہیے۔ مگر فرزندِ رسولؐ کو یہاں بھی اپنے قتل کا سامان دکھائی دیا۔ آخر ایم جج میں کہ جب تمام عالمِ اسلامی مکہ کی طرف کھینچا چلا آ رہا تھا حسینؑ کو مکہ سے رخصت ہونا پڑا اور آپ کو کوفہ کی طرف روانہ ہوئے جہاں کے لوگ آپ کو اصرار کے ساتھ بلارہے تھے اور آپ سے مذہبی رہنمائی کے طالب تھے اور آپ اپنے چچا زاد بھائی، مسلم بن عقیل کو وہاں کے حالات کا مشاہدہ کرنے کے لیے بھیج بھی چکے تھے مگر اس دوران میں کوفہ کی حالت درگاہوں ہو گئی وہاں سنگدل حاکم عبداللہ بن زیاد کا اقتدار قائم ہو گیا اور مسلم بن عقیل شہید کر ڈالے گئے۔ اس کے بعد کوفہ جلنے کا لیا ہر کوئی موقع نہ تھا مگر مکہ اور مدینہ واپس جانے کا بھی امکان نہ تھا۔ ادھر کوفہ سے آپ کو گرفتار کرنے کے لیے فوج بھیج دی گئی جس نے آپ کو آگے بڑھنے یا واپس جانے سے روکا۔ مجبوراً آپ کربلا کی سرزمین پر اتر پڑے۔ دوسرے ہی دن سے یزید کا ٹڈی دل لشکر کربلا کے میدان میں آنا شروع ہو گیا۔ تمام راستے بند کر دیے گئے اور امام حسینؑ کو گھیر کر یزید کی بیعت پر اصرار کیا جانے لگا۔ حضرت امام حسینؑ کے ساتھ صرف آپ کے سترہ عزیز، چند غلام اور سو ڈیڑھ سو کے قریب وہ خاص دوست تھے جو کوفہ یا بعض دوسرے مقامات سے باوجود راستوں کے بند ہونے کے کسی نہ کسی طرح آپ تک پہنچ سکے تھے۔

محسوس ہوتا تھا اس حد تک انتہائی شدید مقابلہ کیا۔ وہ مرتد اہل بولیسے حالات میں عام انسانوں کی طاقت سے یقیناً بالاتر ہے۔ مگر کہاں ایک انسانی جسم اور کہاں فولادی تلواروں کا سیلاب! جسم زخموں سے چور ہو گیا۔ آپ گھوڑے سے زمین پر گرے اور وہ مرحلہ جو آپ کے لیے پہلے ہی آسان تھا اب زیادہ آسان ہو گیا۔ آپ کا سر قلم کر کے یزید پر بلند کیا گیا۔ شہیدوں کی لاشیں گھوڑوں سے پامال کی گئیں۔ مال و اسباب لوٹا گیا۔ خاندان رسالت کی مقدس خواتین کے سردوں سے چادریں اُتاری گئیں۔ بیویوں میں آگ لگائی گئی۔ مردوں میں ایک بھارتی ناناواں علی بن الحسین باقی رہ گئے تھے جنھیں طوق و زنجیر پہنائے گئے اور عرب کے شریف ترین خاندان کی غیرت مند بی بیوں اسیر کر کے شہر بھر بھرائی گئیں۔

یہ ہے دنیائے تاریخ کا وہ بڑا حادثہ جو ”واقعہ کربلا“ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ یوں تو عالم کا ہر واقعہ اپنے محل وقوع کے اعتبار سے کسی خاص جگہ، کسی خاص قوم اور کسی خاص طبقہ سے متعلق ہوتا ہے اور اس لحاظ سے واقعہ کربلا بھی عراق کی سرزمین، عرب کے ملک، ہاشم کی نسل اور مسلمانوں کی جماعت سے تعلق رکھتا تھا مگر واقعات میں ہمہ گیری اور وسعت پیدا ہو جاتی ہے ان خصوصیات اور نتائج کے لحاظ سے جو کل نوع انسانی سے وابستہ ہوں اور جن میں مذہب و ملت کی کوئی تفریق نہ ہو۔ اس حیثیت سے دیکھا جاتا ہے تو واقعہ کربلا متعدد وجوہ سے تمام نوع انسانی کے تعلق کا مرکز ہے۔

اول یہ کہ ظالم سے نفرت اور مظلوم کے ساتھ ہمدردی فطرت بشری میں داخل ہے۔ اگر کوئی قصہ ہمارے سامنے پیش ہو جس میں ایک طرف ظلم کا مظاہرہ ہو اور دوسری طرف مظلومیت تو چاہے اس واقعہ سے متعلق شخصیتوں سے ہم بالکل واقف نہ ہوں تب بھی ظالم سے نفرت اور مظلوم کے ساتھ ہمدردی پیدا ہو جائے گی اور اس میں کسی مذہب و خیال کا امتیاز نہ ہوگا۔ حضرت امام حسینؑ پر جو مظالم کربلا میں واقع ہوئے ان کی مثال تاریخ عالم میں ناپید ہے۔ یوں تو اکثر انبیاء و مسقر بن ابنائے زمانہ کے ہاتھوں مظالم کا شکار ہوئے، بہت سے لوگ ان کی یاد آتی

یتاب نظر آ رہے تھے مگر طاقت کی تمام نمائشیں اور ایذا رسانی کی تمام صورتیں امام حسینؑ اور آپ کے ساتھیوں کو مجبور نہ کر سکیں کہ ایک فاسق و فاجر کو جائز حکمران تسلیم کریں۔

دسویں محرم کو صبح سے دوپہر کے بعد تک امام حسینؑ کے جانناز ساتھی جو آپ سے خاندانی تعلق نہ رکھتے تھے برابر اپنی جانیں حسینؑ اور آپ کے اصول کی خاطر قربان کرتے رہے جب ان میں سے کوئی باقی نہ رہا تو عزیزوں کی نوبت آئی۔ اس موقع پر آپ کے لیے آسان ہوتا کہ آپ خود آگے بڑھ کر راہ حق میں اپنے سر کا ہدیہ پیش کر دیتے مگر آپ کو اپنی قوت برداشت کا پورا امتحان دینا تھا۔ چنانچہ اس کے بعد آپ کے عزیز آپ سے جدا ہونے لگے۔ سب سے پہلے آپ نے اپنے جوان بیٹے علی اکبر کو جو شبیہ پیغمبر بھی تھے مرنے کے لیے بھیجا۔ مال خیمہ میں مقیم اور بلہا خیمہ کے دروازے پر اور ان کا چاند فوج مخالفت کی گھٹائیں چھپا تھا۔ باپ نے دیکھا اور ماں نے سن لیا کہ علی اکبر تلواروں سے ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے مگر صبر و سکون میں فرق نہ آیا۔ اس کے بعد دوسرے عزیز بھی ایک ایک کر کے رخصت ہوئے اور راہ حق میں نثار ہو گئے۔ سب سے آخر میں آپ کے جانناز بھائی عباسؑ ابن علیؑ آپ سے رخصت ہوئے۔ یحسینی جماعت کے علمدار تھے جن کے قتل ہونے سے حسینؑ کی کمر ٹوٹ گئی مگر ہمت شکستہ نہیں ہوئی۔ اس کے بعد آپ کے پاس کوئی سرمایہ حق کی بارگاہ میں نذر دینے کے لیے نہ تھا۔ مگر سب سے آخر میں آپ نے ایک ایسا معصوم ہدیہ پیش کر دیا جس پر کسی شریعت اور قانون کی رو سے مجرم ہونے کا الزام نہ آسکتا تھا۔ وہ شیر خوار بچہ جو اپنی ماں کی گود میں پیاس سے سسکیاں لے رہا تھا حسینؑ نے اس کی حالت دیکھی اور دشمن کی فوج کے سامنے اپنے ہاتھوں پر لیا یہ تھا حسینؑ کا سب سے آخری فدیہ۔ انسانیت کے ہاتھ پیروں میں لڑوہ پڑ گیا اور رحم و کرم کی دنیا میں اندھیرا چھا گیا۔ جب اس دشمن فوج کے ایک سپاہی نے تیر چلہ کمان میں جوڑا اور بچہ کی گردن کو نشانہ بنا لیا حسینؑ کا یہ آخری تحفہ بھی قبول ہو گیا۔ اب کیا تھا؟ بذات خود حضرت کو حق کی حمایت میں جہاد کا فرض انجام دینا تھا اور اپنی جان کی قربانی پیش کرنا تھی۔ چنانچہ آپ نے اس شائستگی اور سبکی کے عالم میں تلوار نیام سے نکالی اور جتنا قانون اسلام کی رو سے آپ کو اپنا فریضہ

لحاظ سے حضرت امام حسینؑ کسی قوم اور مذہب سے مخصوص نہیں سمجھے جاسکتے۔ حسینؑ کا تعلق تمام دنیا کے انسانیت سے ہے۔ آپ نے وہ کام کیا جس نے انسانیت کے ٹٹے ہوئے نقوش کو پھر سے اُبھار دیا اور دم توڑتی ہوئی انسانیت کو نئے سرے سے زندہ کر دیا۔ آپ نے دنیا کو سچائی اور راست بازی کی صحیح قدر و قیمت کا اندازہ کرایا اور اس موت کے معنی سمجھائے جس میں دواعی زندگی کی حقیقت مضمر ہے۔ اس لیے تمام اقوام عالم جو قربانی کی عزت کرتی ہیں مجبور ہیں کہ حضرت امام حسینؑ کو انتہائی قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھیں۔

تیسرے یہ کہ حضرت امام حسینؑ کا مقصد اپنی قربانی سے کوئی ایسا امر نہ تھا جو مختلف مذاہب کے نقطہ نظر سے محل اختلاف ہو۔ انسانی اوصاف و اخلاق کی ایک منزل وہ ہے جہاں تمام مذاہب متفق ہو جاتے ہیں۔ تمام مذاہب کی اصل اساس جس پر ان کی عمارت بلند کی گئی ہے اخلاق انسانی کو نقطہ ارتقاء تک پہنچانا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ زمانہ کے اختلاف سے کچھ احکام میں عملی تبدیلیاں کی گئی ہوں اور بعض مذاہب کے اصول میں بعد کی آنے والی نسلوں کی ناگہمی سے کچھ زیادتی یا کمی ہوئی ہو مگر اصلی محور سب کا تہذیب اخلاق اور تکمیل بشریت ہے۔ حضرت امام حسینؑ کا مقصد یہی نقطہ مشترک تھا۔ یقیناً اگر حضرت امام حسینؑ کا مقابلہ کسی دوسرے دین و ملت کے افراد سے ہوا ہوتا یعنی کوئی غیر مسلم جماعت آپ کے سامنے ہوتی تو چاہے آپ کی قربانی کتنی ہی حقانیت پر مبنی ہوتی اور آپ کو کتنے ہی ظلم کے ساتھ شہید کیا گیا ہوتا مگر وہ مذہبی جماعت جس کے مقابلہ میں آپ تھے اور جس کے ہاتھوں آپ کو یہ مظالم برداشت کرنا پڑے تھے کسی حد تک آپ کے نام اور آپ کے کام سے بنائے خواصمت ضرور محسوس کرتی اور واقعہ کربلا کے ساتھ ہمدردی میں عمومیت پیدا نہ ہوتی۔ لیکن حضرت امام حسینؑ کی قربانی کسی طور پر کسی ایک مذہب کو ملنے اور دوسرے مذہب کو قائم کرنے کے لیے نہیں تھی بلکہ ایک ہی دین کے ظاہری ماننے والوں میں برائیوں کو مٹانے اور اچائیوں کے قائم کرنے کے لیے عمل میں لائی گئی تھی اور چونکہ برائی اور اچھائی کے متعلق اصولی حیثیت

کیے گئے۔ بہتوں کا مال اسباب لوٹا گیا اور بہت سے لوگ قید ہوئے مگر بحیثیت مجموعی وہ تمام مصائب جن کا سامنا فرداً فرداً بہت سے اشخاص کو کرنا پڑا۔ حضرت امام حسینؑ کی ذات میں اکٹھا ہو گئے اور ان کے بوقت واحد جمع ہو جانے سے آپ کی ذات مظلومیت میں اپنی آپ مثال قرار پا گئی۔ لہذا جس قدر حضرت امام حسینؑ کی مظلومیت کا درجہ بلند اور ظلم کے ظلم کا درجہ بلند ہے اسی قدر وہ ہمدردی بھی کہ جو امام حسینؑ کے ساتھ بحیثیت مظلوم ہونا چاہیے۔ ہر دوسرے مظلوم سے زیادہ ہے اور وہ نفرت بھی کہ جو آپ کے دشمنوں سے بحیثیت ظالم ہونا چاہیے تمام دنیا کے سنگاروں کی بہ نسبت زیادہ ہے۔

دوسرے یہ کہ حضرت امام حسینؑ کی مظلومیت بے بسی کی مظلومیت نہ تھی۔ جس طرح کسی شخص پر ایسے جنگل میں ڈاکو حملہ کر دیں اور اس کے مال و اسباب کو لوٹ لیں یا اسے قتل کر دیں۔ اس مظلوم یہ بھی ہے اور ہمدردی اس کے ساتھ بھی ہوگی مگر یہ مظلومیت غیر اختیاری طور پر ہے۔ اس کے ساتھ کوئی عمل ایسا شریک نہیں ہے جو اخلاقی نقطہ نظر سے قابل مدح ہو۔ حضرت امام حسینؑ کی مظلومیت اس نوع کی نہیں ہے۔ آپ نے ایک مسلک حق کی حمایت اور ایک صحیح اصول کی حفاظت کے لیے ان تمام مصائب کو برداشت کیا۔ اس کا نام قربانی ہے۔ یوں تو قربانی کے بہت سے اقسام ہو سکتے ہیں مگر سب میں بلند جان کی قربانی ہے اور اگر اس فرض کے عائد ہونے پر کوئی اس منزل میں ثابت قدم نظر آئے تو تمام افراد انسانی کے نزدیک زیادہ عزت و احترام کا مستحق ہوگا اور جس قدر مقصد عزت دار اور شریف ہوگا اتنی ہی قربانی اہم اور قابل عزت سمجھی جائے گی۔ کربلا کی سرزمین پر حضرت حسینؑ بن علیؑ نے جو قربانی پیش کی وہ انسانی تاریخ کا ایک بیشمار کارنامہ ہے۔ حق پرستی اور حق پروری کی بنیادیں منزلزل ہو رہی تھیں اور غلبہ و اقتدار انسانی آزادی کا سرکچل کر اپنی غلامی کا اقرار لے رہا تھا۔ اس نازک موقع پر حسینؑ نے اپنے کو اور اپنے عزیزوں بلکہ بچوں تک کو میدان جہاد میں لاکر جبر و استبداد کا پردہ چاک کر دیا اور ثبات استقلال صلب و صبر، ایثار و قربانی حق پروری اور راست کرداری کا بہت بلند نمونہ پیش کیا۔ اس

لیکن اس کے برخلاف واقعہ کربلا کی یاد کا اس شدت کے ساتھ قائم رہنا کہ حال کا کوئی واقعہ اس پر اثر انداز نہ ہو سکے۔ یہ ماننے پر مجبور کرتا ہے کہ تاریخ عالم اس کے بعد سے اس وقت تک کوئی نظیر اس کی پیش نہیں کر سکی۔

بادجو دیکھ واقعہ کربلا کے بعد کتنے ہی انقلاب ہوئے۔ تمدن نے کتنی ہی کروٹیں بدلیں۔ معیار اخلاق میں کتنے ہی تغیرات ہوئے مگر حسینی قربانی کی یاد مسلسل تیرہ سو برس سے یکساں عزت و احترام کے ساتھ قائم ہے۔ ماننا پڑے گا کہ وہ قربانی ایسے مشترک انسانی اصول کی حفاظت کے لیے کی گئی ہے کہ جب تک دنیا میں انسانیت قائم ہے اس اصول کی بھی قدر و منزلت ہے اور اس یاد کا قربانی کی یاد بھی برقرار ہے۔

کھلی ہوئی بات ہے کہ جتنا کوئی موضوع اہم ہوگا اور تاریخی حیثیت سے جس قدر کسی واقعہ میں ندرت اور اہمیت زیادہ ہوگی اسی قدر اہل فکر و قلم طبع آزمائی زیادہ کریں گے۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ دنیا کی تاریخ میں کربلا کے واقعہ سے بڑھ کر کسی واقعہ سے متعلق نظم و نثر کا ذخیرہ فراہم نہیں ہوا۔ کربلا کی زمین پر ابھی خون شہیدان کی ری خشک نہ ہونے پائی تھی کہ شاعروں کی زبان سے اس واقعہ کے متعلق اشعار تراش کر لگے اور نثر میں ان خطبوں سے قطع نظر کرتے ہوئے جو اہل بیت حسینؑ کی زبان یا دوسرے مقررین کے دہن سے ہنگامی حالات کے ماتحت نکلے ہیں خصوصاً ان اقدامات کے ذیل میں جو امام حسینؑ کے خون کا بدلہ لینے کے لیے سلیمان بن صرد خزاعی اور پھر مختار کی جانب سے ہوئے تھے جن کا مقصد یہ تھا کہ لوگوں کو واقعہ کربلا کی اہمیت سے متاثر کیا جائے مستقل طور سے اس واقعہ پر تصانیف کی ابتداء پہلی صدی ہجری کے اواخر سے ہوئی اور اس کے بعد برابر مورخین واقعہ کربلا پر متواتر لکھتے رہے اور تصانیف کا سلسلہ جاری ہو گیا اور یہ واقعہ ہے کہ دنیا کے کسی دوسرے موضوع پر اتنا نہیں لکھا اور کہا گیا ہے جتنا واقعہ کربلا کے متعلق لکھا اور کہا جا چکا ہے۔ پھر بھی موضوع تشنہ ہے اور بہت کچھ سمجھنے اور سمجھانے کی ضرورت باقی ہے۔ اس کے علاوہ اب تک جتنی کتابیں لکھی گئی ہیں ان کا

۳۰

سے مذاہب میں کوئی اختلاف نہیں پایا جاتا۔ یعنی ہر مذہب کے نزدیک برائیاں مٹانے کے قابل اور اچھائیاں قائم کرنے کی مستحق ہیں اس لیے ہر مذہب کے لوگوں کو حسینؑ کے مقصد سے اتفاق ہوگا اور وہ آپ کی قربانی کو عزت و احترام کا مستحق سمجھیں گے۔

چوتھے حضرت امام حسینؑ اور ان کے ساتھیوں نے واقعہ کربلا کے دوران میں مختلف اخلاق و اوصاف کا ملہ کی جو مثالیں پیش کی ہیں وہ عامہ خلایق کے لیے ایک دائمی درس عمل کی حیثیت رکھتی ہیں جس سے تمام افراد بشر یکساں طور پر فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ ان ہی تمام وجوہ کا نتیجہ یہ ہے کہ دنیا نے واقعہ کربلا کے ساتھ اپنے باہمی نفرت اور جذبات کی کشمکش کے باوجود بیگانگی کا برتاؤ کیا اور اقوام عالم نے یکساں طور پر اس کی اہمیت کا اعتراف و اقرار کیا اور صدیاں گزرنے کے ساتھ انکی دلچسپی اس اہم حادثہ سے نہ صرف قائم رہی بلکہ مختلف اوقات میں اس میں اضافہ ہوتا رہا۔

اگر کوئی سیاح محترم کے زمانہ میں مشرق و غرب عالم کی سیاحت کرے اور ہر مرتبہ محترم کے پہلے دس دن ایک نئے خطہ زمین پر گزارے تو وہ دیکھ لے گا کہ ہر جگہ اپنے اپنے معیار زندگی اور طرز معاشرت کے اعتبار سے کسی نہ کسی طرح کربلا کے شہید کو یاد کیا جاتا ہے۔

یہ سالانہ یادگار جو عزاداری کے مختلف مراسم کی شکل میں منائی جاتی ہے کربلا کے واقعہ کے بعد پہلی ہی صدی میں مسلمانوں نے قائم کر لی تھی اور اس کے حلقہ اشاعت میں برابر اضافہ ہی ہوتا رہا۔

سالانہ انسان فطرۃً خوشی کو پسند کرتا ہے اور رنج و غم سے بھاگتا ہے۔ اس لیے اگر حوادث زمانہ کے ماتحت غم کے اسباب پیدا بھی ہوتے ہیں تو ان کو بھلانے کی کوشش کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اقوام عالم میں جتنے تنواریں وہ سب خوشی کی یادگار ہیں۔ غم کی یادگاریں کبھی قائم نہیں کی گئیں یہ صرف حسینؑ مظلوم کی شہادت ہے جس کی یادگار غم کی صورت میں صد ہا سال سے برقرار قائم ہے۔ ظاہر ہے کہ فطرت انسانی کسی بار کو عرصہ تک برداشت نہیں کر سکتی۔ اس غم کی یادگار کا اس طرح برقرار رہنا اس امر کی دلیل ہے کہ واقعہ کربلا کی یاد میں انسانی زندگی کے لیے نفع بخش عناصر مضمر ہیں۔

پھر یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ہمیشہ حال کا نقش ماضی کو زاموش بنا کر اس کے اثر کو ختم کر دیتا ہے۔

پہلا باب

نسبی خصوصیات خاندان اور اس کے شاندار روایات

نظام اخلاق کی تشکیل میں آباؤ اجداد کا بڑا حصہ ہوتا ہے۔ "توارث صفات" اور خاندانی احساسات کے لحاظ سے بھی اور اس لیے بھی کہ بچپن سے کان میں پڑے ہوئے ماضی کے تذکروں سے قلم ادراک و شعور کی اسی طرح پرورش ہوتی ہے جس طرح دودھ سے بچہ کی جسمانی پرورش اور جس طرح دودھ خون کی شکل میں تبدیل ہو کر رگوں میں دوڑتا ہے یوں ہی بچپن کے سنے ہوئے تذکرے بچی کی رو کے ساتھ انسان کے دل و دماغ کی گہرائیوں میں اترتے اور نفس کے تحت الشعوری طبقوں میں راسخ ہو جاتے ہیں۔ اس لیے مذہبی معتقدات سے قطع نظر کرتے ہوئے انسانی حیثیت سے حسین کو سمجھنے کے لیے ان کے آباؤ اجداد کے کارناموں پر نظر ڈالنا ضروری ہے۔

حضرت ابراہیم خلیل اللہ کی ذات بڑی حد تک بین الاقوامی حیثیت رکھتی ہے۔ یعنی یہود و نصاریٰ اور مسلمان سب ان کو مانتے ہیں اور وہ مذہبی طور پر مسلمانوں کے مورث اعلیٰ کے جاسکتے ہیں کیونکہ قرآن کریم کی تصریح کے مطابق حضرت محمد مصطفیٰ نے اپنے کو ملت ابراہیم کا رہبر بتایا اور حضرت ابراہیم نے ہی اس جماعت کا بوراہ حق میں ان کے پیچھے آئی سب سے پہلے نام "مسلم" رکھا اور ابراہیم کی زبانی اپنے پروردگار کی بارگاہ میں یہ دعا بھی مذکور ہے کہ خداوند ابراہیم کو مسلم قرار دے اور ہماری اولاد میں سے بھی ایک "امت مسلمہ" قرار دے۔ اس طرح مسلمانوں کی قومی زندگی اور پیغمبر اسلام کی بعثت گویا دعائے ابراہیم کا نتیجہ تھی۔ اس لیے حضرت ابراہیم کے روایات زندگی اہل اسلام کے لیے ایک موروثی ترکہ کی حیثیت رکھتے ہیں اور فرزندان اسلام کے عناصر اخلاق کی تشکیل میں ان کا بڑا حصہ ہے۔

حضرت ابراہیم کے دو بیٹے تھے۔ اسحاق اور اسمعیل حضرت اسحق سلسلہ بنی اسرائیل کے

انداز بیان زیادہ تر مذہبی معتقدات سے وابستگی رکھنے والے افراد کے مذاق کے مطابق ہے جس سے اکثر غیر مذاہب کے افراد اجنبیت محسوس کرتے ہیں۔ کوئی ناواقف اور اجنبی شخص اگر واقعہ کر بلا اور امام حسین کی شخصیت کو عالم اسباب کی تاریخی رفتار اور اس کے نتائج اور ان کے ضروری تفصیلات کے ساتھ جاننا چاہے تو اس کی تشنگی دور کرنے کے لیے کوئی ایک کتاب ایسی جامع نہیں ہے جس کا پتہ دیا جاسکے۔ زیر نظر کتاب اس ضرورت کو سامنے رکھ کر لکھی جا رہی ہے اور اس موقع پر جب کہ دنیائے انسانیت کے اس عظیم واقعہ کو پورے تیرہ سو برس ہو گئے ہیں اور مذہبی ملت کے افراد نے متفق ہو کر حسین بن علی کی سیزدہ صد سالہ یادگار قیام کی ہے۔ یہ کتاب اس صدی کی یادگار کے طور پر حق، انصاف اور سچائی کی بارگاہ میں حریت، مساوات اور انسانی کی بارگاہ میں، انسانی دل، دماغ اور ضمیر کی بارگاہ میں انسانی جذبات، احساسات اور شرفیہ خیالات کی بارگاہ میں، انسانی وقار، عزت اور افتخار کی بارگاہ میں، انسانی فکر، نظر اور کردار کی بارگاہ میں اور ان سب کے ذریعہ سے ان کے پروردگار کی بارگاہ میں پیش کی جاتی ہے۔

حسین بن علیؑ کے کارنامہ جاوید کی قدر و قیمت کا صحیح اندازہ تو الفاظ کی محدود دنیا کے بس سے باہر ہے لیکن اگر اس پوری کتاب میں ایک جملہ بھی اس ایثار و قربانی کی تصویر کا کوئی ٹرخ انگوٹھ کے سامنے لاسکے تو یہی اس خدمت کا پورا ماحصل ہوگا۔

علی نقی النقی

سلسلہ امام کی شان کیا ہوتی ہے؟ اس بارے میں جو شخص مذہب شیعہ کے معتقدات معلوم کرنا چاہے اسے عربی میں اصول کافی اور اس کے شرح، فارسی میں حق یقین علامہ مجلسی (متوفی ۱۱۱۱ھ) اور حدیث سلطانیہ مصنفہ جناب سید العلماء سید حسین (متوفی ۱۲۰۳ھ) اور اردو میں مذکورہ کتابوں کے تراجم کی طرف رجوع کرنا چاہیے۔ مختصر طور پر اصول مذہب شیعہ کے سمجھنے کے لیے خود میرے وہ تصانیف دیکھنا مناسب ہوں گے جو امام مہشن سے شائع ہوئے ہیں۔

اکیس آدمیوں میں سے کس کو ملا۔ اس میں اختلاف ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ قریش کا لقب سب سے پہلے
نضر بن کنانہ کو ملا۔ بعض کے نزدیک نضر کو اور بعض کے نزدیک قصی بن کلاب کو۔ وہ تسمیہ میں بھی کئی
قول ہیں۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ وہ نضر سے ماخوذ ہے، تجارت اور کسب معاش کے معنی میں
چونکہ یہ لوگ اپنی محنت و مشقت اور فتنہ بازوں کی کمائی معیار عزت سمجھتے تھے اور علی طور پر اس
کے پابند تھے اس لیے قریش کہلاتے اور ایک قول یہ ہے کہ وہ نضر سے بمعنی اجتماع سے ماخوذ ہے۔

چونکہ ان لوگوں نے متفرق ہونے کے بعد اجتماعی شکل اختیار کی اس لیے قریش کے جانے لگے۔
چونکہ قصی کے وقت تک نسل عدنان کے لوگ مکہ کے چاروں اور وادیوں میں منتشر تھے، قصی نے
ان سب کو جمع کر کے کعبہ کے آس پاس مکانوں میں آباد کیا۔ اسی لیے خود قصی کو مجمع کے لقب سے یاد
کیا جانے لگا جیسا کہ عرب کے شاعر نے کہا ہے:-

ابوکمہ قصی کان یسد عی محبتاً
جمع الله القبائل من فھر
(یعنی) تمہارے مورث اعلیٰ قصی وہ ہیں کہ جو مجمع "ملا تے تھے۔ انہی کے ذریعہ سے اللہ
نے قبیلہ نضر کی مختلف شاخوں کو ایک جگہ جمع کیا۔

نابت بن اسماعیل کے بعد خانہ کعبہ کی تولیت جبرہ بن خازم کی طرف ہوئی ان کے خفیال والے تھے
قتل ہو گئی تھی اور اس طرح یہ لوگ ذنبی اور مذہبی اقتداروں کے مالک بنے ہوئے تھے۔ عرصہ تک
قالبض رہنے کے بعد انھوں نے کعبہ کے اموال میں تغلب و تصرف اور حج کو آنے والے پردیسوں پر
ظلم و ستم اور حرم مکہ کی حرمتوں کو برباد کرنا شروع کر دیا جو کہ نتیجہ میں بنی خزاعہ نے یمن سے نکل کر ان
پر حملہ کر دیا اور انھیں مکہ سے نکال کر خود قالبض ہو گئے۔ عاندان تقریباً دو سو برس تک کعبہ کا مالک
بنادیا۔ قصی نے انھیں میں شادی کی اور جب ان کا اثر و رسوخ حجاز میں بڑھ گیا تو انھوں نے نضر
بن کنانہ کی تمام اولاد کو جمع کر کے انھیں خانہ کعبہ کی حمایت و تولیت کی ذمہ داری یاد دلانی اور آخر
متفقہ طاقت کے ساتھ خزاہیوں کو شکست دے کر مکہ پر خود قالبض ہوئے۔ انھوں نے مکہ معظمہ کے

ملک یرت ابن ہشام ج ۱ صفحہ ۶۱-۶۲ طبری ج ۲ صفحہ ۱۵۲

اور حضرت اسماعیلؑ پیغمبر اسلام حضرت محمد مصطفیٰؐ کے مورث اعلیٰ ہیں۔ بعض مصالِح کی بنا پر
حضرت ابراہیمؑ نے اپنے فرزند اسماعیلؑ کو شیر خوار کی کے عالم میں آپ کی والدہ لگانی آجرہ کے ساتھ
مکہ کی سرزمین پر پہنچا دیا جس پر خانہ کعبہ واقع ہے۔ خانہ کعبہ کی تعمیر کا کام انھیں باپ بیٹے ابراہیمؑ و
اسماعیلؑ نے انجام دیا جو مذہبی طور پر تمام خلق خدا کا محل اجتماع قرار پایا اور یہ آل ابراہیمؑ کی مرکزیت کا
احساس علیحدہ خلائق کے دل میں پیدا ہونے کا ایک بڑا ذریعہ بن گیا۔

ان دونوں بزرگواروں کی نسبت اسلامی تاریخ کا یہ واقعہ بڑی اہمیت رکھتا ہے کہ حضرت
ابراہیمؑ من جانب اللہ مامور ہوئے کہ اپنے فرزند حضرت اسماعیلؑ کو اپنے ہاتھ سے ذبح کریں اور آپ
نے بڑی ثابت قدمی اور پرجہدگی کے ساتھ حکم ربانی کی تعمیل کو عمل کے آخری درجہ تک پہنچا دیا۔
اگرچہ وقت پر پروردگار عالم کی طرف سے بجائے انسان کے جانور کی قربانی کے عمل میں آنے کا
انتظام ہو گیا مگر اس اعلان کے ساتھ کہ آئندہ اس کا معاوضہ راہ خدا میں ایک بڑی قربانی کے ساتھ
ہونا ضروری ہے (وَقَدْ يَتَنَاهَا بِذِيحْ عَظِيمٍ) اس واقعہ کو اسلام نے بڑی اہمیت دی اور عید
قربان کی شکل میں اس کی مستقل یادگار قائم کر دی۔

اسماعیلؑ کے بارہ فرزند تھے۔ ان میں سے نابت اور قیدار کی اولاد حجاز میں آباد ہوئی اور بہت
پھیلی۔ قیدار کی اولاد میں عدنان بہت مشہور ہیں اور پیغمبر اسلامؐ انھیں کی اولاد میں سے تھے۔
حضرت کاتب نامہ آپ کی ذات سے لیکر عدنان تک متفقہ طور سے توارخ و سیر میں موجود ہے اس طرح
عدنان - مَعَد - نَزَار - مُقَرَّر - الْيَاس - مَذْرُوح - مُزَيْن - كِنَان - نَضْر - مَالِك - نَزْر - غَالِب - مَوْسَى -
كَعْب - مَرَّة - كَاتِب - قُصَي - عَجْدَنَات - مَالِشَم - عَبْد الْمُطَّلِب - عَبْد اللہ جو حضرت محمد مصطفیٰؐ کا
کے والد بزرگوار تھے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت سے عدنان تک اکیس پشتیں ہیں اور اگر
ہرنسل کا اوسط تیس سال قرار دیا جائے تو کل پشتوں کی مدت ۶۳۰ برس ہوئی۔ قریش کا لقب ان

سے قرآن مجید سورہ صافات آیت ۱۰۷-۱۰۸ الام واللوک للطبری ج ۲ صفحہ ۱۹۲۔

سے یرت ابن ہشام ج ۱ صفحہ ۶۱-۶۲ طبقات ابن سعد طبع لیدن ج ۱ صفحہ ۲۷۵-۲۸۰۔

بیٹوں میں سے دو بیٹے عبداللہ اور ابوطالب تھے۔

عبداللہ بن عبدالمطلب کی قربانی کا واقعہ بھی کتبِ تواریخ میں مذکور ہے اور مشہور ہے کہ عبدالمطلب اپنے فرزند عبداللہ کی قربانی پر تیار تھے مگر ان کے نخیال دلوں کے اصرار پر قرعہ ڈالا گیا اور تینوں کی قربانی کے بدلے میں عبداللہ کی جان بھی سیلے۔

چونکہ عبداللہ کا انتقال باپ کے سامنے ہو گیا۔ اس لیے عبدالمطلب کے تمام امتیازات و اختیارات ابوطالب کو حاصل ہوئے۔ ”شیخ البیہا“ اور ”سید القریش“ کے خطابوں سے مشہور ہوئے۔ انسانِ امانتوں کے ساتھ ساتھ جو ابراہیم واسمعیل کی منزل کہ عقیں ایک سب سے بڑی امانت جو ان کی حفاظت میں آئی وہ عبداللہ کے یتیم فرزند محمد کی ذات تھی۔

حضرت محمد مصطفیٰ کی عمر نو جوانی کی منزل میں تھی کہ آپ کی راستبازی اور امانت داری کو تمام عرب نے تسلیم کرتے ہوئے آپ کو ”امین“ کا لقب دے دیا۔ اپنی امانتیں آپ کے پاس رکھوانا شروع کر دیں۔ اہم معاملات میں آپ کے نصیحت کو قابل قبول سمجھنے لگے۔ جب آپ کی عمر بیس سال کی تھی تو قریش میں ”حلف الفضول“ کا عہد نامہ ہوا جو بے نظیر شریفانہ اصول پر مبنی تھا اور اس کی تحریک کا سربراہی ہاشم ہی کے سر پر ہوا، اس لیے کہ زبیر بن عبدالمطلب اس کے داعی تھے۔

واقعہ یہ تھا کہ عبدالمطلب کے انتقال کے بعد عرب میں مطلق العنانی اور بے آئینی کا درد دردہ ہو گیا۔ رشتہ داریوں کے لحاظ سے آپس میں کشت و خون تو نہیں ہونے پایا مگر جنسی لوگوں کے ساتھ انصاف نہیں ہوتا تھا چنانچہ قبیلہ زبید کے ایک یہی شخص نے جس سے کہ عاص بن داؤد سمی نے کوئی بیش قیمت چیز خرید کر قیمت ادا نہیں کی تھی تمام آلِ فہر کو مخاطب کر کے مؤثر انداز میں اس ظلم و ستم کا شکوہ بھی کیا۔

انہی واقعات سے متاثر ہو کر زبیر بن ہاشم، زہرہ اور اسد بن عبد العزیٰ کے قبیلے عبداللہ بن عبد العنان کے مکان میں جمع ہوئے اور متفقہ طور پر عہد کیا کہ ہم ہمیشہ مظلوم کا ساتھ دیں گے۔

۱۔ ابن ہشام ج ۱ ص ۹۰ ۲۔ طبقات ابن سعد ج ۱ ص ۶ ۳۔ ابن سعد ج ۱ ص ۶

مکانات کی ازبھر تعمیر کی اور دارالندوہ (محل مشاورت) کے نام سے ایک عمارت تیار کرائی جس میں جمہور کے کام انجام دیے جاتے تھے۔ ان کے لیے معاشرت کے قوانین منضبط کیے اور خراج کی وصولیائی اور حاجیوں کے خور و نوش کا بھی انتظام کرایا۔ انھوں نے شہر بخوار کی مذمت اور اسکی مفسدوں کا اعلان بھی کیا۔ قصی کے فرزندوں میں عبدمناف اوصاف و کمالات میں اپنے بزرگوں کے حقیقی جانشین تھے اس لیے اپنے باپ کی زندگی ہی میں انھوں نے ملکِ عرب میں شہرت و امتیاز کا درجہ حاصل کر لیا۔ عبدمناف کے فرزندوں میں ہاشم جن کا اصلی نام عمرو تھا نہایت بااثر اور ممتاز تھے۔ کعبہ کی معزز خدمتیں حاجیوں کی سیرانی اور ضیافت ان کو سپرد کی گئیں جو انھوں نے بہت قابلیت سے انجام دیں۔ انھوں نے سلطنتِ روم سے خط و کتابت کر کے کچھ خاص حقوق عربِ تجارت کے واسطے حاصل کیے تھے۔ ”ہاشم“ ان کا لقب اس وجہ سے ہوا کہ انھوں نے سب سے پہلے اہل مکہ کو روٹیوں کے ٹکڑے شوربے میں بھگو کر کھلائے۔ (عربی میں ہاشم چورا کرنے کو کہتے ہیں)

ہاشم کی وفات کے بعد ان کے بھائی ”مطلب“ جانشین ہوئے۔ اس لیے کہ ہاشم کے فرزند شیبہ اس وقت نہایت کم سن تھے۔ جب مطلب کی وفات ہوئی تو ان کی جگہ ان کے بھتیجے شیبہ نے حاصل کی جو عبدالمطلب کے نام سے مشہور ہوئے۔ یہ شرفِ عظمت اور شہرت میں اپنے بزرگوں پر بھی فوقیت لے گئے۔ اور ”سید البیہا“ کے خطاب سے مشہور ہوئے جو ان کی اولاد میں باقی رہ گیا۔ چنانچہ وہ آج تک ”سادات“ کہے جاتے ہیں۔ عبدالمطلب کا توکل اور اعتماد خدا پر اس وقت پورے طور پر ظاہر ہوا جب ابرہہ نے یمن سے بڑھ کر کعبہ کو ڈمانے کے ارادے سے مکہ پر چڑھائی کی۔ مکہ والوں کے پاس کوئی ایسی فوجی طاقت نہ تھی جس سے وہ غنیم کا مقابلہ کرتے مگر عبدالمطلب خداوندی امداد پر بھروسہ رکھتے تھے۔ آخر غیبی طاقت ہی نے اصحابِ فیل کو تباہ و برباد کر دیا۔ عبدالمطلب کے دس

۱۔ سیرت ابن ہشام ج ۱ ص ۶۹ ۲۔ الامالی للصدوق ص ۳۲ ۳۔ سیرت ابن ہشام ج ۱ ص ۶۹

۴۔ ابن ہشام ج ۱ ص ۶۹ ۵۔ طبری ج ۲ ص ۱۶۹ ۶۔ ابن ہشام ج ۱ ص ۶۹

۷۔ ابن ہشام ج ۱ ص ۶۹ ۸۔ طبری ج ۲ ص ۱۶۹ ۹۔ ابن ہشام ج ۱ ص ۶۹

دہ سے ان لوگوں کو کچھ بن نہ پڑتا تھا۔ آخر کار قریش کا ایک وفد ابوطالب کے پاس آیا۔ اس میں عقبہ ثنیہ، اوسفیان، عاص بن ہشام، ابوجہل، ولید بن مغیرہ اور عاص بن داؤد وغیرہ شریک تھے۔ ان لوگوں نے ابوطالب سے کہا تھا کہ تمہارا بھتیجا ہمارے معبودوں کو برا کہتا ہے، ہمارے مذہب کی مذمت کرتا ہے۔ ہم کو احمق ٹھہراتا ہے اور ہمارے آباد و اجداد کو گمراہ بتاتا ہے اس لیے یا تو تم اسے ان باتوں سے روک دو یا اسے ہمارے سپرد کر دو۔ پہلی بار ابوطالب نے نرمی سے ان کو ٹال دیا مگر کچھ عرصہ کے بعد جب یہ وفد پھر آیا تو اس نے نہایت سختی سے کہا کہ اب ہم اس صورت حال کو برداشت نہیں کر سکتے۔ یا تو تم انھیں روکو یا ہمارے مختارے درمیان جنگ ہو کہ ہم دونوں میں سے ایک کا فیصلہ ہو جائے۔ ابوطالب نے مناسب سمجھا کہ اب رسول اللہ سے اس کا تذکرہ کریں۔ حضرت نے پورا واقعہ تو فرمایا۔ خدا کی قسم اگر یہ لوگ میرے ایک ہاتھ میں سورج اور دوسرے میں چاند لاکر دے دیں تب بھی میں اپنے فرض سے باز نہ آؤں گا۔ خدا اس کام کو پورا کرے گا یا میں خود اس پر نثار ہو جاؤں گا۔ اور یہ کہتے کہتے آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ یہ دیکھنا تھا کہ ابوطالب کا دل بے یل گیا۔ انھوں نے کہا کہ اچھا تم اپنے فرض کو انجام دیتے رہو میں آنسو دیکھ کر تمہارا ساتھ دوں گا۔

چنانچہ ابوطالب نے حضرت محمد مصطفیٰ کی حفاظت میں کوئی دقیقہ اٹھانہ رکھا اور جب تک زندہ رہے رسول کے لئے سینہ سپر رہے۔

مگر حضرت ابوطالب اور خدیجہ کبریٰ کی وفات کے بعد اہل مکہ کی ایذا رسانی حضرت رسول کے خلاف بہت بڑھ گئی اور آپ نے ان کے راہ راست پر آنے سے بظاہر اسباب ناامید ہو جانے کی وجہ سے یہ طے کر لیا کہ اب مکہ معظمہ کو جو آپ کا آبائی وطن تھا ترک فرمادیں۔ چنانچہ رفتہ رفتہ اپنے متبعین کو مدینہ کی طرف جہاں کے کچھ لوگوں نے آپ کی پیروی قبول کر لی تھی روانہ فرماتے گئے۔ یہ دیکھ کر مکہ والے سب آپ کی جان لینے کے درپے ہو گئے اور ایک ہوا کہ رات کے وقت

ظاہر ہوئی تھیں مگر رفتہ رفتہ اس کی روشنی مشرق و غرب میں پھیل گئی اور دنیا کو روشن کر دیا۔ یہ عالمگیر مذہب اسلام تھا اور اس خداوندی پیغام کے پہنچانے کے لیے محمد مصطفیٰ منتخب ہوئے جن کے ذریعہ سے کائنات کو ایک خدائے توانا کے سامنے سر جھکانے کی تعلیم دی گئی اور غیر اللہ کی پرستش کو مٹانے کا اعلان کیا گیا۔ خواہ وہ سونے چاندی پتھر کے بت ہوں یا گوشت پوست سے بنا ہوا انسان جو الہی اقتدار کے سامنے اپنی سطوت و ہیبت کا سک جمانا چاہتا ہو اور خلق خدا کو اپنے سامنے سرنگوں ہونے پر مجبور کرے۔

اس وقت حضرت علی بن ابی طالب کی عمر دس برس کی تھی اور چونکہ علی پہلے رسول کی آنکھوں میں تربیت میں تھے اس لیے یہ کہنا بالکل درست ہے کہ علی اور اسلام میں وہی وابستگی پیدا ہوئی جو ایک آنکھ میں رہنے والے دو بچوں میں آپس میں ہونا چاہیے۔

چند سال تک رازداری کے ساتھ فرض تبلیغ کو ادا کیا گیا۔ اس کے بعد حکم آ گیا و انذار عشیرتک الا قریبین (یعنی اپنے قریبی رشتہ داروں کو تبلیغ کیجیے۔ حضرت نے اس حکم کی تعمیل میں دعوت کا انتظام کر دیا اور تمام اولاد عبدالمطلب کو جمع کر کے اپنی رسالت کا اعلان کیا۔ اور توحید الہی کا پیغام پہنچایا۔ پھر فرمایا کہ تم میں سے کون شخص اس دین کی اشاعت میں میرا دست و بازو بننے کے لیے تیار ہے؟ اس وعدہ پر کہ وہی میرا بھائی، میرا وصی اور میرا جانشین قرار پائے گا۔ مجمع تمام خاموش تھا۔ حضرت علی اگرچہ سب سے زیادہ کمسن تھے مگر آپ کھڑے ہو گئے اور کہا کہ میں آپ کا اس ہم میں ہر طرح سے مددگار ہوں آپ حضرت علی کے کاندھے پر ہاتھ رکھا اور فرمایا بس یہ میرا بھائی، میرا وصی اور میرا جانشین ہے۔ تم سب کو اس کی اطاعت لازم ہے۔

اب علانیہ بت پرستی کی مذمت ہونے لگی جس سے قریش آپ کی مخالفت پر کمر بستہ اور ایذا رسانی پر آمادہ ہو گئے مگر آپ کے چچا جناب ابوطالب کی شخصیت آپ کے سامنے سینہ سپر تھی جس کی

فداکاری کی ایک مسلسل تاریخ تیار کر رہی تھی، حسینؑ نے دیکھا نہیں مگر کانوں سے سنتے تو رہے کہ ہمارے مورث اعلیٰ ابراہیمؑ خدا کی رضا کے لیے بیٹے کے ذبح پر تیار ہو گئے۔ ہمارے پردادا عبدالمطلبؑ نے اپنے بیٹے عبد اللہؑ کو قربانگاہ عبودیت میں پیش کیا۔ ہمارے جدِ بزرگوار ہاشمؑ نے اپنے مال و دولت اور اثر کو ہمیشہ خلقِ خدا کی خدمت میں صرف کیا۔ ہمارے خاندان نے مظلوموں کی امداد اور ظالموں سے مقابلہ کا حلف اٹھایا ہے اس لیے اگر خلقِ خدا کسی ظالم کے ہاتھ سے پریشان ہو تو ہمارا فرض ہے کہ ہم مظلوموں کی دستگیری کے لیے آگے بڑھ جائیں گے۔

حسینؑ کو معلوم ہوا کہ سچائی کی خاطر تھکھارے اور مصیبتیں اٹھائیں میرے نانا رسول اللہؐ نے اور پیغمبرِ اسلامؐ کی حفاظت کے لیے سینہ سپر رہے میرے دادا ابوطالبؑ۔ اور جب اسلامؐ کی حفاظت کا مسئلہ درپیش تھا تو سب سے پہلے عہدِ فدا داری کرنے والے اور پھر تلواروں کے حصار میں بسترِ رسولؐ پر لیٹنے والے اور پھر ہر سخت موقع پر سچائی کے لیے جہاد کرنے والے میرے باپ علیؑ بن ابی طالبؑ تھے۔

یہ عام قاعدہ ہے کہ بچے جب اپنے بزرگوں کے حالات سنتے ہیں تو ان میں بچپن ہی سے دلور پیدا ہوتا ہے کہ ہمیں بھی کوئی موقع ایسے کارنامے پیش کرنے کا مل جائے۔ اس لیے عام فطرت کے تقاضوں اور ظاہری اسباب کے لحاظ سے یہ کہنا بالکل صحیح ہے کہ امام حسینؑ کے لیے علاوہ منصبی ذمہ داری کے خاندانی روایات اور بلند فطرت کا تقاضا بھی تھا کہ بچپن سے منتظر اور مشتاق رہیں کہ سچائی کی خدمت، غریبوں کی دستگیری اور مظلوموں سے ہمدردی، کوئی موقع پیش آئے اور آپ بھی حق کی حمایت میں اپنے فریقہ کو انجام دے کہ اپنی خاندانی روایات کو زندہ اور برقرار رکھیں۔

اے حلف الفضول کو امام حسینؑ اپنے پیش نظر رکھتے تھے۔ اسکا ثبوت یہ ہے کہ ایک موقع پر جب ولید بن عتبہ حاکم مدینہ نے آپؑ کے ساتھ ظلم و تعدی سے کام لیا تو آپؑ نے حلف الفضول کا حوالہ دیا تھا اور اسکی پابندی کی طرف سب کو توجہ دلائی تھی۔ جس کے نتیجے میں عبداللہ بن زبیر، سوربن محمد بن نوفل، زری اور عبدالرحمن بن عثمان بن عبید اللہ قسیمی متعدد اشخاص نے یہ اعلان کیا کہ اگر حسینؑ بن علیؑ اس معاہدہ کی بنا پر حق کو طلب کرنے کے لیے کھڑے ہوں تو ہم ساتھ ہوں گے۔ آخر ولید نے تسلیم کر دیا اور حضرت کے مطالبہ کو منظر کیا (سیرت ابن ہشام ج ۱ ص ۵۵)

آپؑ کے گھر کو گھیر کر آپؑ کو قتل کر ڈالیں۔ آپؑ اپنے چچا زاد بھائی علیؑ بن ابی طالبؑ کو یہ ہدایت فرما کر کہ وہ آپؑ کے بستر پر آپؑ کی چادر اور کھڑکے سرور میں خود مدینہ کی طرف روانہ ہو گئے۔ حضرت علیؑ نے دشمنوں کی کھینچی ہوئی تلواروں کے اندر رسولؐ کے بستر پر آپؑ کی چادر اور کھڑکے آرام کیا۔ پھر مدینہ پہنچنے کے بعد جب مخالفین اسلامؐ نے فوجی طاقتوں کے ساتھ مسلمانوں پر چڑھائی کی اور بکراؤ اور خندق وغیرہ کی لڑائیاں ہوئیں تو ان لڑائیوں میں حق و صداقت کی روحانی طاقت کے ساتھ حضرت علیؑ مرتضیٰ کی تلوار ہر موقع پر اسلامؐ کی فتح مندی کا سبب بنتی رہی۔

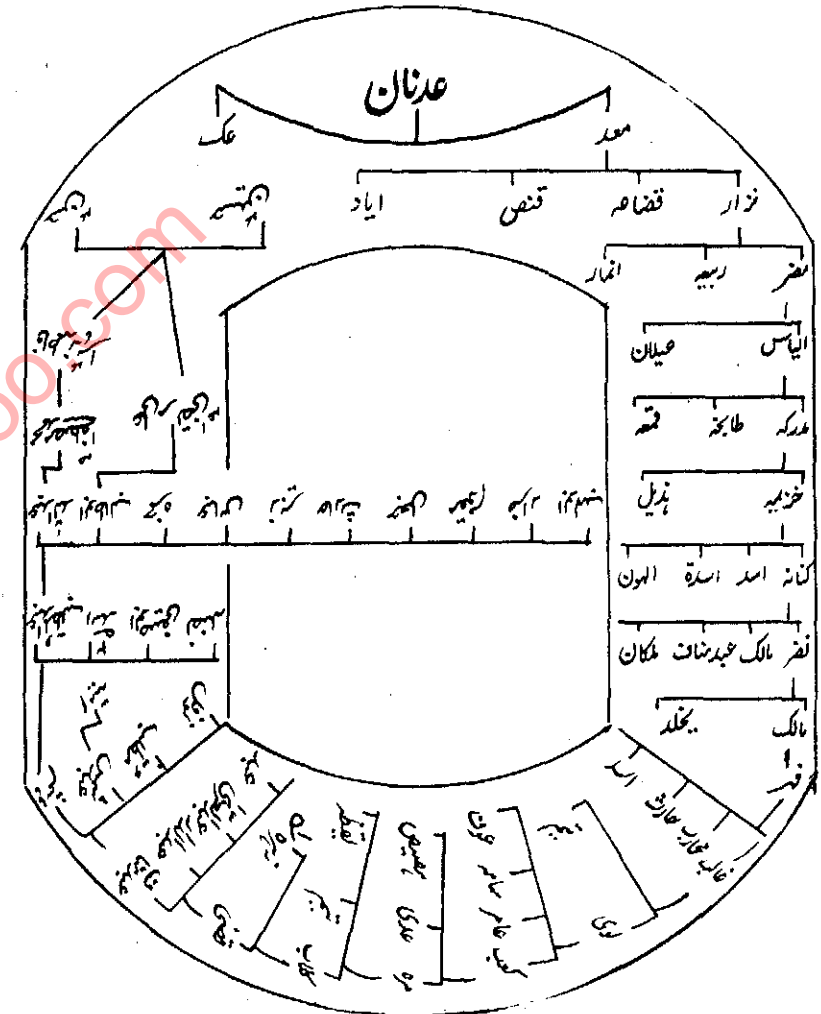
حضرت محمد مصطفیٰؐ کی ایک بیٹی تھیں فاطمہ زہراؑ جن کی ان کے بلند اوصاف کی بنا پر آپؐ اتنی عزت کرتے تھے کہ جب وہ آپؐ کے پاس آتی تھیں تو آپؐ تعظیم کے لیے کھڑے ہو جاتے تھے۔ اور بکثرت حدیثیں آپؐ نے ان کی فضیلت کے بارے میں ارشاد کیں جن میں ایک یہ تھی کہ وہ سردارِ زنانہ بنت اور سردارِ زنانِ اہل ایمان ہیں۔ اور فرمایا کہ فاطمہؑ بضعۃ کرمی (یعنی فاطمہؑ میرا ایک ٹکڑا ہے)۔

ظاہر ہے کہ ایسی بیٹی کے لیے رسولؐ ایسے ہی صاحبِ اوصاف موزوں ترین کفو کو منتخب فرما سکتے تھے۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ بہت سے پیغام اور نسبتیں آئیں مگر سب مسترد کر دی گئیں اور صرف علیؑ ہی کی ایک ذات جس کے لیے رسولؐ کا قول تھا کہ میں اور علیؑ ایک ہی نور سے ہیں۔ اس رشتہ کے لیے موزوں سمجھی گئی اور رسولؐ خدا نے فرمایا کہ یہ میرا ہی نہیں بلکہ اللہ کا انتخاب ہے۔ انہی دونوں مقدس اور بزرگ مرتبہ مالِ باپ سے دو فرزند پیدا ہوئے ایک حسنؑ اور دوسرے حسینؑ اب کی حسینؑ بھلا سکتے تھے اپنے خاندانی خصوصیات اور قدیم روایات کو؛ بقول مولانا ڈاکٹر سید مجتبیٰ حسن صاحب کاموں پوری۔ حسینؑ جس نسل کی یادگار تھے وہ صدیوں سے قربانی و

لے طبقات ابن سعد ج ۱ ص ۱۵۱۔ ابن ہشام ج ۱ ص ۲۸۹۔ ۲۹۰ طبری ج ۱ ص ۲۸۲۔ استیعاب ج ۲ ص ۲۵۲

۳ ص ۱۸۵۔ ۱۸۶۔ ۱۸۷۔ ۱۸۸۔ ۱۸۹۔ ص ۲۸۹۔ ۲۹۰۔ ۲۹۱۔ ۲۹۲۔ ۲۹۳۔ ۲۹۴۔ ۲۹۵۔ ۲۹۶۔ ۲۹۷۔ ۲۹۸۔ ۲۹۹۔ ۳۰۰۔ ۳۰۱۔ ۳۰۲۔ ۳۰۳۔ ۳۰۴۔ ۳۰۵۔ ۳۰۶۔ ۳۰۷۔ ۳۰۸۔ ۳۰۹۔ ۳۱۰۔ ۳۱۱۔ ۳۱۲۔ ۳۱۳۔ ۳۱۴۔ ۳۱۵۔ ۳۱۶۔ ۳۱۷۔ ۳۱۸۔ ۳۱۹۔ ۳۲۰۔ ۳۲۱۔ ۳۲۲۔ ۳۲۳۔ ۳۲۴۔ ۳۲۵۔ ۳۲۶۔ ۳۲۷۔ ۳۲۸۔ ۳۲۹۔ ۳۳۰۔ ۳۳۱۔ ۳۳۲۔ ۳۳۳۔ ۳۳۴۔ ۳۳۵۔ ۳۳۶۔ ۳۳۷۔ ۳۳۸۔ ۳۳۹۔ ۳۴۰۔ ۳۴۱۔ ۳۴۲۔ ۳۴۳۔ ۳۴۴۔ ۳۴۵۔ ۳۴۶۔ ۳۴۷۔ ۳۴۸۔ ۳۴۹۔ ۳۵۰۔ ۳۵۱۔ ۳۵۲۔ ۳۵۳۔ ۳۵۴۔ ۳۵۵۔ ۳۵۶۔ ۳۵۷۔ ۳۵۸۔ ۳۵۹۔ ۳۶۰۔ ۳۶۱۔ ۳۶۲۔ ۳۶۳۔ ۳۶۴۔ ۳۶۵۔ ۳۶۶۔ ۳۶۷۔ ۳۶۸۔ ۳۶۹۔ ۳۷۰۔ ۳۷۱۔ ۳۷۲۔ ۳۷۳۔ ۳۷۴۔ ۳۷۵۔ ۳۷۶۔ ۳۷۷۔ ۳۷۸۔ ۳۷۹۔ ۳۸۰۔ ۳۸۱۔ ۳۸۲۔ ۳۸۳۔ ۳۸۴۔ ۳۸۵۔ ۳۸۶۔ ۳۸۷۔ ۳۸۸۔ ۳۸۹۔ ۳۹۰۔ ۳۹۱۔ ۳۹۲۔ ۳۹۳۔ ۳۹۴۔ ۳۹۵۔ ۳۹۶۔ ۳۹۷۔ ۳۹۸۔ ۳۹۹۔ ۴۰۰۔ ۴۰۱۔ ۴۰۲۔ ۴۰۳۔ ۴۰۴۔ ۴۰۵۔ ۴۰۶۔ ۴۰۷۔ ۴۰۸۔ ۴۰۹۔ ۴۱۰۔ ۴۱۱۔ ۴۱۲۔ ۴۱۳۔ ۴۱۴۔ ۴۱۵۔ ۴۱۶۔ ۴۱۷۔ ۴۱۸۔ ۴۱۹۔ ۴۲۰۔ ۴۲۱۔ ۴۲۲۔ ۴۲۳۔ ۴۲۴۔ ۴۲۵۔ ۴۲۶۔ ۴۲۷۔ ۴۲۸۔ ۴۲۹۔ ۴۳۰۔ ۴۳۱۔ ۴۳۲۔ ۴۳۳۔ ۴۳۴۔ ۴۳۵۔ ۴۳۶۔ ۴۳۷۔ ۴۳۸۔ ۴۳۹۔ ۴۴۰۔ ۴۴۱۔ ۴۴۲۔ ۴۴۳۔ ۴۴۴۔ ۴۴۵۔ ۴۴۶۔ ۴۴۷۔ ۴۴۸۔ ۴۴۹۔ ۴۵۰۔ ۴۵۱۔ ۴۵۲۔ ۴۵۳۔ ۴۵۴۔ ۴۵۵۔ ۴۵۶۔ ۴۵۷۔ ۴۵۸۔ ۴۵۹۔ ۴۶۰۔ ۴۶۱۔ ۴۶۲۔ ۴۶۳۔ ۴۶۴۔ ۴۶۵۔ ۴۶۶۔ ۴۶۷۔ ۴۶۸۔ ۴۶۹۔ ۴۷۰۔ ۴۷۱۔ ۴۷۲۔ ۴۷۳۔ ۴۷۴۔ ۴۷۵۔ ۴۷۶۔ ۴۷۷۔ ۴۷۸۔ ۴۷۹۔ ۴۸۰۔ ۴۸۱۔ ۴۸۲۔ ۴۸۳۔ ۴۸۴۔ ۴۸۵۔ ۴۸۶۔ ۴۸۷۔ ۴۸۸۔ ۴۸۹۔ ۴۹۰۔ ۴۹۱۔ ۴۹۲۔ ۴۹۳۔ ۴۹۴۔ ۴۹۵۔ ۴۹۶۔ ۴۹۷۔ ۴۹۸۔ ۴۹۹۔ ۵۰۰۔ ۵۰۱۔ ۵۰۲۔ ۵۰۳۔ ۵۰۴۔ ۵۰۵۔ ۵۰۶۔ ۵۰۷۔ ۵۰۸۔ ۵۰۹۔ ۵۱۰۔ ۵۱۱۔ ۵۱۲۔ ۵۱۳۔ ۵۱۴۔ ۵۱۵۔ ۵۱۶۔ ۵۱۷۔ ۵۱۸۔ ۵۱۹۔ ۵۲۰۔ ۵۲۱۔ ۵۲۲۔ ۵۲۳۔ ۵۲۴۔ ۵۲۵۔ ۵۲۶۔ ۵۲۷۔ ۵۲۸۔ ۵۲۹۔ ۵۳۰۔ ۵۳۱۔ ۵۳۲۔ ۵۳۳۔ ۵۳۴۔ ۵۳۵۔ ۵۳۶۔ ۵۳۷۔ ۵۳۸۔ ۵۳۹۔ ۵۴۰۔ ۵۴۱۔ ۵۴۲۔ ۵۴۳۔ ۵۴۴۔ ۵۴۵۔ ۵۴۶۔ ۵۴۷۔ ۵۴۸۔ ۵۴۹۔ ۵۵۰۔ ۵۵۱۔ ۵۵۲۔ ۵۵۳۔ ۵۵۴۔ ۵۵۵۔ ۵۵۶۔ ۵۵۷۔ ۵۵۸۔ ۵۵۹۔ ۵۶۰۔ ۵۶۱۔ ۵۶۲۔ ۵۶۳۔ ۵۶۴۔ ۵۶۵۔ ۵۶۶۔ ۵۶۷۔ ۵۶۸۔ ۵۶۹۔ ۵۷۰۔ ۵۷۱۔ ۵۷۲۔ ۵۷۳۔ ۵۷۴۔ ۵۷۵۔ ۵۷۶۔ ۵۷۷۔ ۵۷۸۔ ۵۷۹۔ ۵۸۰۔ ۵۸۱۔ ۵۸۲۔ ۵۸۳۔ ۵۸۴۔ ۵۸۵۔ ۵۸۶۔ ۵۸۷۔ ۵۸۸۔ ۵۸۹۔ ۵۹۰۔ ۵۹۱۔ ۵۹۲۔ ۵۹۳۔ ۵۹۴۔ ۵۹۵۔ ۵۹۶۔ ۵۹۷۔ ۵۹۸۔ ۵۹۹۔ ۶۰۰۔ ۶۰۱۔ ۶۰۲۔ ۶۰۳۔ ۶۰۴۔ ۶۰۵۔ ۶۰۶۔ ۶۰۷۔ ۶۰۸۔ ۶۰۹۔ ۶۱۰۔ ۶۱۱۔ ۶۱۲۔ ۶۱۳۔ ۶۱۴۔ ۶۱۵۔ ۶۱۶۔ ۶۱۷۔ ۶۱۸۔ ۶۱۹۔ ۶۲۰۔ ۶۲۱۔ ۶۲۲۔ ۶۲۳۔ ۶۲۴۔ ۶۲۵۔ ۶۲۶۔ ۶۲۷۔ ۶۲۸۔ ۶۲۹۔ ۶۳۰۔ ۶۳۱۔ ۶۳۲۔ ۶۳۳۔ ۶۳۴۔ ۶۳۵۔ ۶۳۶۔ ۶۳۷۔ ۶۳۸۔ ۶۳۹۔ ۶۴۰۔ ۶۴۱۔ ۶۴۲۔ ۶۴۳۔ ۶۴۴۔ ۶۴۵۔ ۶۴۶۔ ۶۴۷۔ ۶۴۸۔ ۶۴۹۔ ۶۵۰۔ ۶۵۱۔ ۶۵۲۔ ۶۵۳۔ ۶۵۴۔ ۶۵۵۔ ۶۵۶۔ ۶۵۷۔ ۶۵۸۔ ۶۵۹۔ ۶۶۰۔ ۶۶۱۔ ۶۶۲۔ ۶۶۳۔ ۶۶۴۔ ۶۶۵۔ ۶۶۶۔ ۶۶۷۔ ۶۶۸۔ ۶۶۹۔ ۶۷۰۔ ۶۷۱۔ ۶۷۲۔ ۶۷۳۔ ۶۷۴۔ ۶۷۵۔ ۶۷۶۔ ۶۷۷۔ ۶۷۸۔ ۶۷۹۔ ۶۸۰۔ ۶۸۱۔ ۶۸۲۔ ۶۸۳۔ ۶۸۴۔ ۶۸۵۔ ۶۸۶۔ ۶۸۷۔ ۶۸۸۔ ۶۸۹۔ ۶۹۰۔ ۶۹۱۔ ۶۹۲۔ ۶۹۳۔ ۶۹۴۔ ۶۹۵۔ ۶۹۶۔ ۶۹۷۔ ۶۹۸۔ ۶۹۹۔ ۷۰۰۔ ۷۰۱۔ ۷۰۲۔ ۷۰۳۔ ۷۰۴۔ ۷۰۵۔ ۷۰۶۔ ۷۰۷۔ ۷۰۸۔ ۷۰۹۔ ۷۱۰۔ ۷۱۱۔ ۷۱۲۔ ۷۱۳۔ ۷۱۴۔ ۷۱۵۔ ۷۱۶۔ ۷۱۷۔ ۷۱۸۔ ۷۱۹۔ ۷۲۰۔ ۷۲۱۔ ۷۲۲۔ ۷۲۳۔ ۷۲۴۔ ۷۲۵۔ ۷۲۶۔ ۷۲۷۔ ۷۲۸۔ ۷۲۹۔ ۷۳۰۔ ۷۳۱۔ ۷۳۲۔ ۷۳۳۔ ۷۳۴۔ ۷۳۵۔ ۷۳۶۔ ۷۳۷۔ ۷۳۸۔ ۷۳۹۔ ۷۴۰۔ ۷۴۱۔ ۷۴۲۔ ۷۴۳۔ ۷۴۴۔ ۷۴۵۔ ۷۴۶۔ ۷۴۷۔ ۷۴۸۔ ۷۴۹۔ ۷۵۰۔ ۷۵۱۔ ۷۵۲۔ ۷۵۳۔ ۷۵۴۔ ۷۵۵۔ ۷۵۶۔ ۷۵۷۔ ۷۵۸۔ ۷۵۹۔ ۷۶۰۔ ۷۶۱۔ ۷۶۲۔ ۷۶۳۔ ۷۶۴۔ ۷۶۵۔ ۷۶۶۔ ۷۶۷۔ ۷۶۸۔ ۷۶۹۔ ۷۷۰۔ ۷۷۱۔ ۷۷۲۔ ۷۷۳۔ ۷۷۴۔ ۷۷۵۔ ۷۷۶۔ ۷۷۷۔ ۷۷۸۔ ۷۷۹۔ ۷۸۰۔ ۷۸۱۔ ۷۸۲۔ ۷۸۳۔ ۷۸۴۔ ۷۸۵۔ ۷۸۶۔ ۷۸۷۔ ۷۸۸۔ ۷۸۹۔ ۷۹۰۔ ۷۹۱۔ ۷۹۲۔ ۷۹۳۔ ۷۹۴۔ ۷۹۵۔ ۷۹۶۔ ۷۹۷۔ ۷۹۸۔ ۷۹۹۔ ۸۰۰۔ ۸۰۱۔ ۸۰۲۔ ۸۰۳۔ ۸۰۴۔ ۸۰۵۔ ۸۰۶۔ ۸۰۷۔ ۸۰۸۔ ۸۰۹۔ ۸۱۰۔ ۸۱۱۔ ۸۱۲۔ ۸۱۳۔ ۸۱۴۔ ۸۱۵۔ ۸۱۶۔ ۸۱۷۔ ۸۱۸۔ ۸۱۹۔ ۸۲۰۔ ۸۲۱۔ ۸۲۲۔ ۸۲۳۔ ۸۲۴۔ ۸۲۵۔ ۸۲۶۔ ۸۲۷۔ ۸۲۸۔ ۸۲۹۔ ۸۳۰۔ ۸۳۱۔ ۸۳۲۔ ۸۳۳۔ ۸۳۴۔ ۸۳۵۔ ۸۳۶۔ ۸۳۷۔ ۸۳۸۔ ۸۳۹۔ ۸۴۰۔ ۸۴۱۔ ۸۴۲۔ ۸۴۳۔ ۸۴۴۔ ۸۴۵۔ ۸۴۶۔ ۸۴۷۔ ۸۴۸۔ ۸۴۹۔ ۸۵۰۔ ۸۵۱۔ ۸۵۲۔ ۸۵۳۔ ۸۵۴۔ ۸۵۵۔ ۸۵۶۔ ۸۵۷۔ ۸۵۸۔ ۸۵۹۔ ۸۶۰۔ ۸۶۱۔ ۸۶۲۔ ۸۶۳۔ ۸۶۴۔ ۸۶۵۔ ۸۶۶۔ ۸۶۷۔ ۸۶۸۔ ۸۶۹۔ ۸۷۰۔ ۸۷۱۔ ۸۷۲۔ ۸۷۳۔ ۸۷۴۔ ۸۷۵۔ ۸۷۶۔ ۸۷۷۔ ۸۷۸۔ ۸۷۹۔ ۸۸۰۔ ۸۸۱۔ ۸۸۲۔ ۸۸۳۔ ۸۸۴۔ ۸۸۵۔ ۸۸۶۔ ۸۸۷۔ ۸۸۸۔ ۸۸۹۔ ۸۹۰۔ ۸۹۱۔ ۸۹۲۔ ۸۹۳۔ ۸۹۴۔ ۸۹۵۔ ۸۹۶۔ ۸۹۷۔ ۸۹۸۔ ۸۹۹۔ ۹۰۰۔ ۹۰۱۔ ۹۰۲۔ ۹۰۳۔ ۹۰۴۔ ۹۰۵۔ ۹۰۶۔ ۹۰۷۔ ۹۰۸۔ ۹۰۹۔ ۹۱۰۔ ۹۱۱۔ ۹۱۲۔ ۹۱۳۔ ۹۱۴۔ ۹۱۵۔ ۹۱۶۔ ۹۱۷۔ ۹۱۸۔ ۹۱۹۔ ۹۲۰۔ ۹۲۱۔ ۹۲۲۔ ۹۲۳۔ ۹۲۴۔ ۹۲۵۔ ۹۲۶۔ ۹۲۷۔ ۹۲۸۔ ۹۲۹۔ ۹۳۰۔ ۹۳۱۔ ۹۳۲۔ ۹۳۳۔ ۹۳۴۔ ۹۳۵۔ ۹۳۶۔ ۹۳۷۔ ۹۳۸۔ ۹۳۹۔ ۹۴۰۔ ۹۴۱۔ ۹۴۲۔ ۹۴۳۔ ۹۴۴۔ ۹۴۵۔ ۹۴۶۔ ۹۴۷۔ ۹۴۸۔ ۹۴۹۔ ۹۵۰۔ ۹۵۱۔ ۹۵۲۔ ۹۵۳۔ ۹۵۴۔ ۹۵۵۔ ۹۵۶۔ ۹۵۷۔ ۹۵۸۔ ۹۵۹۔ ۹۶۰۔ ۹۶۱۔ ۹۶۲۔ ۹۶۳۔ ۹۶۴۔ ۹۶۵۔ ۹۶۶۔ ۹۶۷۔ ۹۶۸۔ ۹۶۹۔ ۹۷۰۔ ۹۷۱۔ ۹۷۲۔ ۹۷۳۔ ۹۷۴۔ ۹۷۵۔ ۹۷۶۔ ۹۷۷۔ ۹۷۸۔ ۹۷۹۔ ۹۸۰۔ ۹۸۱۔ ۹۸۲۔ ۹۸۳۔ ۹۸۴۔ ۹۸۵۔ ۹۸۶۔ ۹۸۷۔ ۹۸۸۔ ۹۸۹۔ ۹۹۰۔ ۹۹۱۔ ۹۹۲۔ ۹۹۳۔ ۹۹۴۔ ۹۹۵۔ ۹۹۶۔ ۹۹۷۔ ۹۹۸۔ ۹۹۹۔ ۱۰۰۰۔ ۱۰۰۱۔ ۱۰۰۲۔ ۱۰۰۳۔ ۱۰۰۴۔ ۱۰۰۵۔ ۱۰۰۶۔ ۱۰۰۷۔ ۱۰۰۸۔ ۱۰۰۹۔ ۱۰۱۰۔ ۱۰۱۱۔ ۱۰۱۲۔ ۱۰۱۳۔ ۱۰۱۴۔ ۱۰۱۵۔ ۱۰۱۶۔ ۱۰۱۷۔ ۱۰۱۸۔ ۱۰۱۹۔ ۱۰۲۰۔ ۱۰۲۱۔ ۱۰۲۲۔ ۱۰۲۳۔ ۱۰۲۴۔ ۱۰۲۵۔ ۱۰۲۶۔ ۱۰۲۷۔ ۱۰۲۸۔ ۱۰۲۹۔ ۱۰۳۰۔ ۱۰۳۱۔ ۱۰۳۲۔ ۱۰۳۳۔ ۱۰۳۴۔ ۱۰۳۵۔ ۱۰۳۶۔ ۱۰۳۷۔ ۱۰۳۸۔ ۱۰۳۹۔ ۱۰۴۰۔ ۱۰۴۱۔ ۱۰۴۲۔ ۱۰۴۳۔ ۱۰۴۴۔ ۱۰۴۵۔ ۱۰۴۶۔ ۱۰۴۷۔ ۱۰۴۸۔ ۱۰۴۹۔ ۱۰۵۰۔ ۱۰۵۱۔ ۱۰۵۲۔ ۱۰۵۳۔ ۱۰۵۴۔ ۱۰۵۵۔ ۱۰۵۶۔ ۱۰۵۷۔ ۱۰۵۸۔ ۱۰۵۹۔ ۱۰۶۰۔ ۱۰۶۱۔ ۱۰۶۲۔ ۱۰۶۳۔ ۱۰۶۴۔ ۱۰۶۵۔ ۱۰۶۶۔ ۱۰۶۷۔ ۱۰۶۸۔ ۱۰۶۹۔ ۱۰۷۰۔ ۱۰۷۱۔ ۱۰۷۲۔ ۱۰۷۳۔ ۱۰۷۴۔ ۱۰۷۵۔ ۱۰۷۶۔ ۱۰۷۷۔ ۱۰۷۸۔ ۱۰۷۹۔ ۱۰۸۰۔ ۱۰۸۱۔ ۱۰۸۲۔ ۱۰۸۳۔ ۱۰۸۴۔ ۱۰۸۵۔ ۱۰۸۶۔ ۱۰۸۷۔ ۱۰۸۸۔ ۱۰۸۹۔ ۱۰۹۰۔ ۱۰۹۱۔ ۱۰۹۲۔ ۱۰۹۳۔ ۱۰۹۴۔ ۱۰۹۵۔ ۱۰۹۶۔ ۱۰۹۷۔ ۱۰۹۸۔ ۱۰۹۹۔ ۱۱۰۰۔ ۱۱۰۱۔ ۱۱۰۲۔ ۱۱۰۳۔ ۱۱۰۴۔ ۱۱۰۵۔ ۱۱۰۶۔ ۱۱۰۷۔ ۱۱۰۸۔ ۱۱۰۹۔ ۱۱۱۰۔ ۱۱۱۱۔ ۱۱۱۲۔ ۱۱۱۳۔ ۱۱۱۴۔ ۱۱۱۵۔ ۱۱۱۶۔ ۱۱۱۷۔ ۱۱۱۸۔ ۱۱۱۹۔ ۱۱۲۰۔ ۱۱۲۱۔ ۱۱۲۲۔ ۱۱۲۳۔ ۱۱۲۴۔ ۱۱۲۵۔ ۱۱۲۶۔ ۱۱۲۷۔ ۱۱۲۸۔ ۱۱۲۹۔ ۱۱۳۰۔ ۱۱۳۱۔ ۱۱۳۲۔ ۱۱۳۳۔ ۱۱۳۴۔ ۱۱۳۵۔ ۱۱۳۶۔ ۱۱۳۷۔ ۱۱۳۸۔ ۱۱۳۹۔ ۱۱۴۰۔ ۱۱۴۱۔ ۱۱۴۲۔ ۱۱۴۳۔ ۱۱۴۴۔ ۱۱۴۵۔ ۱۱۴۶۔ ۱۱۴۷۔ ۱۱۴۸۔ ۱۱۴۹۔ ۱۱۵۰۔ ۱۱۵۱۔ ۱۱۵۲۔ ۱۱۵۳۔ ۱۱۵۴۔ ۱۱۵۵۔ ۱۱۵۶۔ ۱۱۵۷۔ ۱۱۵۸۔ ۱۱۵۹۔ ۱۱۶۰۔ ۱۱۶۱۔ ۱۱۶۲۔ ۱۱۶۳۔ ۱۱۶۴۔ ۱۱۶۵۔ ۱۱۶۶۔ ۱۱۶۷۔ ۱۱۶۸۔ ۱۱۶۹۔ ۱۱۷۰۔ ۱۱۷۱۔ ۱۱۷۲۔ ۱۱۷۳۔ ۱۱۷۴۔ ۱۱۷۵۔ ۱۱۷۶۔ ۱۱۷۷۔ ۱۱۷۸۔ ۱۱۷۹۔ ۱۱۸۰۔ ۱۱۸۱۔ ۱۱۸۲۔ ۱۱۸۳۔ ۱۱۸۴۔ ۱۱۸۵۔ ۱۱۸۶۔ ۱۱۸۷۔ ۱۱۸۸۔ ۱۱۸۹۔ ۱۱۹۰۔ ۱۱۹۱۔ ۱۱۹۲۔ ۱۱۹۳۔ ۱۱۹۴۔ ۱۱۹۵۔ ۱۱۹۶۔ ۱۱۹۷۔ ۱۱۹۸۔ ۱۱۹۹۔ ۱۲۰۰۔ ۱۲۰۱۔ ۱۲۰۲۔ ۱۲۰۳۔ ۱۲۰۴۔ ۱۲۰۵۔ ۱۲۰۶۔ ۱۲۰۷۔ ۱۲۰۸۔ ۱۲۰۹۔ ۱۲۱۰۔ ۱۲۱۱۔ ۱۲۱۲۔ ۱۲۱۳۔ ۱۲۱۴۔ ۱۲۱۵۔ ۱۲۱۶۔ ۱۲۱۷۔ ۱۲۱۸۔ ۱۲۱۹۔ ۱۲۲۰۔ ۱۲۲۱۔ ۱۲۲۲۔ ۱۲۲۳۔ ۱۲۲۴۔ ۱۲۲۵۔ ۱۲۲۶۔ ۱۲۲۷۔ ۱۲۲۸۔ ۱۲۲۹۔ ۱۲۳۰۔ ۱۲۳۱۔ ۱۲۳۲۔ ۱۲۳۳۔ ۱۲۳۴۔ ۱۲۳۵۔ ۱۲۳۶۔ ۱۲۳۷۔ ۱۲۳۸۔ ۱۲۳۹۔ ۱۲۴۰۔ ۱۲۴۱۔ ۱۲۴۲۔ ۱۲۴۳۔ ۱۲۴۴۔ ۱۲۴۵۔ ۱۲۴۶۔ ۱۲۴۷۔ ۱۲۴۸۔ ۱۲۴۹۔ ۱۲۵۰۔ ۱۲۵۱۔ ۱۲۵۲۔ ۱۲۵۳۔ ۱۲۵۴۔ ۱۲۵۵۔ ۱۲۵۶۔ ۱۲۵۷۔ ۱۲۵۸۔ ۱۲۵۹۔ ۱۲۶۰۔ ۱۲۶۱۔ ۱۲۶۲۔ ۱۲۶۳۔ ۱۲۶۴۔ ۱۲۶۵۔ ۱۲۶۶۔ ۱۲۶۷۔ ۱۲۶۸۔ ۱۲۶۹۔ ۱۲۷۰۔ ۱۲۷۱۔ ۱۲۷۲۔ ۱۲۷۳۔ ۱۲۷۴۔ ۱۲۷۵۔ ۱۲۷۶۔ ۱۲۷۷۔ ۱۲۷۸۔ ۱۲۷۹۔ ۱۲۸۰۔ ۱۲۸۱۔ ۱۲۸۲۔ ۱۲۸۳۔ ۱۲۸۴۔ ۱۲۸۵۔ ۱۲۸۶۔ ۱۲۸۷۔ ۱۲۸۸۔ ۱۲۸۹۔ ۱۲۹۰۔ ۱۲۹۱۔ ۱۲۹۲۔ ۱۲۹۳۔ ۱۲۹۴۔ ۱۲۹۵۔ ۱۲۹۶۔ ۱۲۹۷۔ ۱۲۹۸۔ ۱۲۹۹۔ ۱۳۰۰۔ ۱۳۰۱۔ ۱۳۰۲۔ ۱۳۰۳۔ ۱۳۰۴۔ ۱۳۰۵۔ ۱۳۰۶۔ ۱۳۰۷۔ ۱۳۰۸۔ ۱۳۰۹۔ ۱۳۱۰۔ ۱۳۱۱۔ ۱۳۱۲۔ ۱۳۱۳۔ ۱۳۱۴۔ ۱۳۱۵۔ ۱۳۱۶۔ ۱۳۱۷۔ ۱۳۱۸۔ ۱۳۱۹۔ ۱۳۲۰۔ ۱۳۲۱۔ ۱۳۲۲۔ ۱۳۲۳۔ ۱۳۲۴۔ ۱۳۲۵۔ ۱۳۲۶۔ ۱۳۲۷۔ ۱۳۲۸۔ ۱۳۲۹۔ ۱۳۳۰۔ ۱۳۳۱۔ ۱۳۳۲۔ ۱۳۳۳۔ ۱۳۳۴۔ ۱۳۳۵۔ ۱۳۳۶۔ ۱۳۳۷۔ ۱۳۳۸۔ ۱۳۳۹۔ ۱۳۴۰۔ ۱۳۴۱۔ ۱۳۴۲۔ ۱۳۴۳۔ ۱۳۴۴۔ ۱۳۴۵۔ ۱۳۴۶۔ ۱۳۴۷۔ ۱۳۴۸۔ ۱۳۴۹۔ ۱۳۵۰۔ ۱۳۵۱۔ ۱۳۵۲۔ ۱۳۵۳۔ ۱۳۵۴۔ ۱۳۵۵۔ ۱۳۵۶۔ ۱۳۵۷۔ ۱۳۵۸۔ ۱۳۵۹۔ ۱۳۶۰۔ ۱۳۶۱۔ ۱۳۶۲۔ ۱۳۶۳۔ ۱۳۶۴۔ ۱۳۶۵۔ ۱۳۶۶۔ ۱۳۶۷۔ ۱۳۶۸۔ ۱۳۶۹۔ ۱۳۷۰۔ ۱۳۷۱۔ ۱۳۷۲۔ ۱۳۷۳۔ ۱۳۷۴۔ ۱۳۷۵۔ ۱۳۷۶۔ ۱۳۷۷۔ ۱۳۷۸۔ ۱۳۷۹۔ ۱۳۸۰۔ ۱۳۸۱۔ ۱۳۸۲۔ ۱۳۸۳۔ ۱۳۸۴۔ ۱۳۸۵۔ ۱۳۸۶۔ ۱۳۸۷۔ ۱۳۸۸۔ ۱۳۸۹۔ ۱۳۹۰۔ ۱۳۹۱۔ ۱۳۹۲۔ ۱۳۹۳۔ ۱۳۹۴۔ ۱۳۹۵۔ ۱۳۹۶۔ ۱۳۹۷۔ ۱۳۹۸۔ ۱۳۹۹۔ ۱۴۰۰۔ ۱۴۰۱۔ ۱۴۰۲۔ ۱۴۰۳۔ ۱۴۰۴۔ ۱۴۰۵۔ ۱۴۰۶۔ ۱۴۰۷۔ ۱۴۰۸۔ ۱۴۰۹۔ ۱۴۱۰۔ ۱۴۱۱۔ ۱۴۱۲۔ ۱۴۱۳۔ ۱۴۱۴۔ ۱۴۱۵۔ ۱۴۱۶۔ ۱۴۱۷۔ ۱۴۱۸۔ ۱۴۱۹۔ ۱۴۲۰۔ ۱۴۲۱۔ ۱۴۲۲۔ ۱۴۲۳۔ ۱۴۲۴۔ ۱۴۲۵۔ ۱۴۲۶۔ ۱۴۲۷۔ ۱۴۲۸۔ ۱۴۲۹۔ ۱۴۳۰۔ ۱۴۳۱۔ ۱۴۳۲۔ ۱۴۳۳۔ ۱۴۳۴۔ ۱۴۳۵۔ ۱۴۳۶۔ ۱۴۳۷۔ ۱۴۳۸۔ ۱۴۳۹۔ ۱۴۴۰۔ ۱۴۴۱۔ ۱۴۴۲۔ ۱۴۴۳۔ ۱۴۴۴۔ ۱۴۴۵۔ ۱۴۴۶۔ ۱۴۴۷۔ ۱۴۴۸۔ ۱۴۴۹۔ ۱۴۵۰۔ ۱۴۵۱۔ ۱۴۵۲۔ ۱۴۵۳۔ ۱۴۵۴۔ ۱۴۵۵۔ ۱۴۵۶۔ ۱۴۵۷۔ ۱۴۵۸۔ ۱۴۵۹۔ ۱۴۶۰۔ ۱۴۶۱۔ ۱۴۶۲۔ ۱۴۶۳۔ ۱۴۶۴۔ ۱۴۶۵۔ ۱۴۶۶۔ ۱۴۶۷۔ ۱۴۶۸۔ ۱۴۶۹۔ ۱۴۷۰۔ ۱۴۷۱۔ ۱۴۷

شجرہ نسب آلِ عدنان



عہ ماخوذ از سيرة النبي الشج الى محمد عبد الملك بن هشام ج ۱، مصر۔ حضرت محمد مصطفیٰ کی والدہ آمنہ بنت وہب بن عبد مناف بن زہرہ تھیں (طبقات ابن سعد، طبع ۱۸۵۷ ج ۳۔ ابن ہشام ج ۱ ص ۶۹۔ اصول کافی طبع ۱۳۸۸ ص ۲۷۸)۔
حضرت علی مرتضیٰ کی والدہ فاطمہ بنت اسد بن ہاشم تھیں۔ اسی لیے آپ کے خصوصیات میں سے ہے ”ادل ہاشمی“ والدہ ہاشمی ولدہ ہاشم تھیں۔“ پندرہ شخص ہیں جو درہیال اور نہیال دونوں طرف سے ہاشمی النسل تھے (اصول کافی طبع ۱۳۸۸ ص ۲۷۸۔ الارشاد

للمفردات ابران ص ٣)

بنی ہاشم کے بالمقابل تاریخ میں جو نام نظر آتا ہے وہ بنی امیہ ہے۔ اس قبیلہ کی بنی ہاشم سے رقابت اور مخالفت کے لیے یہ حکایت بیان کی گئی ہے کہ امیہ کا باپ عبد الشمس اور بنی ہاشم کے مورث اعلیٰ حضرت ہاشم یہ دونوں ماں کے پیٹ سے جڑواں پیدا ہوئے تھے اس طرح کہ انہی ایک کی دوسرے کی پیشانی سے چسپاں تھی۔ مجبوراً ان کو کاٹ کر الگ الگ کیا گیا جس سے خون بہنے لگا۔ اس وقت لوگوں نے اسے بدشگونیاں مان کر کہا کہ ان میں آپس میں خونریزیاں ہوتی رہیں گی یہ حکایت درست ہو یا نہ ہو لیکن اس سے یہ تو اندازہ ہوتا ہے کہ ان دونوں خاندانوں کی جنگ نے کتنی بڑ بکڑلی تھی کہ لوگ اس کو ایک ناگزیر اور قدرتی چیز سمجھنے لگے تھے۔ مگر ہم جہاں تک تاریخ کے واقعات کی چھان بین کرتے ہیں ہمیں خود عبد الشمس اور ہاشم میں جنگ یا منا زعت کی کوئی مثال نہیں ملتی۔ بے شک عبد الشمس کے بعد امیہ کی طرف سے مخالفت کی ابتدا نظر آتی ہے جبکہ وہ حضرت ہاشم سے مقابلہ کی کوشش میں ناکام ہوا اور اس وقت سے اس نے ایک شکست خوردہ فریق کی طرح انتقامی تصادم کا سلسلہ جاری رکھا۔ واقعہ یہ تھا کہ مکہ میں قحط پڑا جس میں قریش بہت تباہ حال ہو گئے حضرت ہاشم شام کی جانب گئے اور وہاں انھوں نے بہت زیادہ مقدار میں آٹا فراہم کر کے اس کی روٹیاں پکوائیں اور انھیں اونٹوں پر بار کر کے مکہ لائے۔ ان روٹیوں کو انھوں نے پورا کرایا اور ان اونٹوں کو خر کر کے شورباتیاں کرایا اور بڑی بڑی دیگوں میں اُبلدوا کر وہ تمام روٹیوں کا پورا ان دیگوں میں ڈلوا دیا۔ اس کھانے کو عرب میں "خرید" کہتے تھے۔ اس طرح انھوں نے تمام مکہ کے لوگوں کو کھانے

۱۔ طبری، ج ۲، ص ۱۸۰۔

دعوت کردی اور امیہ کو دس برس کے لیے مکہ سے جلا وطن ہونا پڑا اور وہ اس مدت تک شام میں قیام پذیر رہا۔ یہ پہلی عداوت تھی جو امیہ کی اولاد میں بنی ہاشم کے مقابلہ میں نسل در نسل برقرار رہی۔ اس کے بعد ہاشم کے فرزند جناب عبدالملک اور امیہ کے فرزند حرب میں مقابلہ ہوا۔ اس طرح کہ جناب عبدالملک کے جوار میں ایک یہودی کا قیام تھا جس کا نام آذینہ تھا۔ اسے تجارت میں بہت ترقی ہوئی جس سے وہ بہت دولت مند ہو گیا تو حرب بن امیہ کو اس سے پرخاش ہو گئی۔ اس نے کچھ لوگوں کو آمادہ کر کے اسے قتل کر دیا اور اس کا سامان لوٹا دیا۔ جناب عبدالملک کو تحقیق سے قاتلوں کا پتہ چل گیا مگر یہ معلوم ہوا کہ حرب نے انھیں کہیں چھپا دیا ہے تو انھوں نے حرب کو سمجھایا کہ قاتلوں کو حوالہ کر دو لیکن وہ اس پر تیار نہ ہوا بلکہ جناب عبدالملک سے لڑنے پر آمادہ ہو گیا۔ اس کے نتیجہ میں پھر نفیل کاہن کو ثالث بنایا گیا جس کے فیصلہ پر حرب کو یہ جرمانہ ادا کرنا پڑا کہ وہ شواؤنیاں جناب عبدالملک کے حوالے کرے جنہیں وہ اس مقتول یہودی کے وارث کو خون بہا کے طور پر دے دیں اور اس یہودی کا جو مال لوٹا گیا تھا وہ سب بھی واپس دلوا لیا۔ چند چیزیں دستیاب نہیں ہوئیں تو ان کا تاوان حضرت عبدالملک نے اپنے مال سے ادا کیا۔ سچے درپے شکست کھانے کے لازمی نتیجہ کے طور پر بنی امیہ عربی خون کی بہت سی لطافتیں کھوتے گئے اور ان میں دناؤت، فریب، احسان کمتری اور دوسرے اسی طرح کے اوصاف پیدا ہوتے گئے جو مسلسل شکست کھانے والوں کی خاصیت ہوا کرتے ہیں۔ یہاں تک کہ بنی ہاشم اور بنی امیہ کے درمیان عام افراد عرب کی ٹکا ہوں میں اتنا فرق پیدا ہوتا گیا کہ یہ چیز قابل غور بن گئی کہ یہ دونوں ایک ہی نسل کی دو شاخیں ہیں یا نہیں۔ عرب قوم کے یہ تاثرات دیکھ کر بنی امیہ بنی ہاشم کے خلاف ضربیں لگاتے تھے مگر مرتبہ انھیں ناکامی ہی ہوتی تھی۔ حضرت محمد مصطفیٰؐ بھی اٹھے تو بنی ہاشم ہی کے یہاں سے۔ یہ آخری بڑی شکست تھی جسے بنی امیہ آسانی سے سہہ نہ سکتے تھے۔ شبلی نعمانی سیرۃ النبی جلد اول میں صفحہ ۵۸ پر لکھتے ہیں کہ آنحضرتؐ کی نبوت کو خاندان بنی امیہ اپنے رقیب (ہاشم) کی فتح خیال کرتا تھا اس لیے سب سے زیادہ اسی قبیلہ نے آنحضرتؐ کی مخالفت کی۔“

ملفوظات ابن سعد بطور حدیث (مجلد ۲، ج ۲، صفحہ ۲۷۷) طبری ج ۲، صفحہ ۲۷۷، ابن اثیر طبرستان ج ۲، صفحہ ۲۷۷

سے میر کیا۔ اتفاق سے اس کے بعد ابراہیم، پانی برسا اور قحط سالی دور ہو گئی۔ ہر شخص کہنے لگا کہ اب کی پہلا بار ان رحمت کا چھینٹا وہ تھا جو ہاشم کے ذریعہ سے برسا۔ ہاشم کے معنی ہیں ردیوں کا پورا کرنے والا۔ شاعروں نے اس واقعہ کو خاص الفاظ میں نظم کیا۔ ایک شاعر نے کہا کہ عمر الذی ہشتم الشریح لعمومہ قوم بمسکة مسنتین عجیات ”عمرو (یہ ہاشم کا اصلی نام ہے) جنھوں نے اپنی قوم کے لیے روٹی کے ٹکڑے کر کے انھیں کھانا کھلایا، وہ قوم جو مکہ میں قحط سے بھوکے اور تباہ حال ہو رہی تھی۔“

امیہ دولت مند آدمی تھا۔ اس نے جو دیکھا کہ حضرت ہاشم نے یہ کیا تو اسے حسد دانگیز ہوا اور خواہ مخواہ بغرض مقابلہ اس نے بھی ہاشم کی نقل اتارنے کی کوشش کی مگر وہ کامیاب نہیں ہوا اور یہ امر قریش میں اسکی رسوائی اور بدنامی کا باعث بن گیا۔ اس بارے میں ہاشم کا کوئی تصور نہیں تھا مگر لوگوں کے طعنوں تشنیعوں سے کھسیا نے ہو کر وہ ہاشم کو برا بھلا کہنے لگا اور اس نے ہاشم کو ”مناقرت“ کی دعوت دی۔ یہ ایک طرح کا مقابلہ عربوں میں رائج تھا کہ دو شخص اپنے اپنے کارناموں کو پیش کر کے کسی ثالث کو حکم بناتے تھے کہ وہ فیصلہ کر دے کہ کون ان میں زیادہ صاحب فخر و لائق عظمت ہے۔ اس ثالثی کے لیے زیادہ تر کاہن منتخب کیے جاتے تھے جو علم قیافہ اور نجوم میں بڑے ماہر ہوتے تھے۔ حضرت ہاشم نے اپنی عمر کی بزرگی اور اپنے رتبہ کی بلندی کے لحاظ سے امیہ کے ساتھ مقابلہ سے انکار کیا مگر قریش کے عام افراد نے حضرت ہاشم کو مجبور کیا۔ آخر آپ بھی آمادہ ہو گئے اور کہا کہ میں اس شرط پر مقابلہ کرتا ہوں کہ شکست خوردہ فریق اپنے مقابل کو ۵۰ اونٹ سپاہ آنکھوں والے سپرد کرے جو سرزمین مکہ میں خریے جائیں اور دس برس کے لیے وہ مکہ سے جلا وطن ہو جائے۔ امیہ اس شرط پر رضا مند ہو گیا چنانچہ قبیلہ خزاعہ کے کاہن کو حکم مقرر کیا گیا۔ اس نے فیصلہ ہاشم کے حق میں اور امیہ کے خلاف دیا۔ حضرت ہاشم نے قرارداد کے مطابق ۵۰ اونٹ حاصل کیے اور انھیں خر کر کے پھر تمام اہل مکہ کی

لے بہرت ابن ہشام ج ۱، صفحہ ۵۸

دعوت کردی اور امیہ کو دس برس کے لیے مکہ سے علاوطن ہونا پڑا اور وہ اس مدت تک شام میں قیام پذیر رہا۔ یہ پہلی عداوت تھی جو امیہ کی اولاد بنی ہاشم کے مقابلہ میں نسل در نسل برقرار رہی۔ اس کے بعد ہاشم کے فرزند جناب عبدالمطلب اور امیہ کے فرزند حرب میں مقابلہ ہوا۔ اس طرح کہ جناب عبدالمطلب کے ہوا میں ایک یہودی کا نام تھا جس کا نام آذینہ تھا۔ اسے تجارت میں بہت ترقی ہوئی جس سے وہ بہت دولت مند ہو گیا تو حرب بن امیہ کو اس سے پر خاش ہو گئی۔ اس نے کچھ لوگوں کو آمادہ کر کے اسے قتل کر دیا اور اس کا سامان لوٹا دیا۔ جناب عبدالمطلب کو تحقیق سے قاتلوں کا پتہ چل گیا مگر یہ معلوم ہوا کہ حرب نے انھیں کہیں چھپا دیا ہے تو انھوں نے حرب کو سمجھایا کہ قاتلوں کو حوالہ کر دو لیکن وہ اس پر یار نہ ہوا بلکہ جناب عبدالمطلب سے لڑنے پر آمادہ ہو گیا۔ اس کے نتیجے میں پھر نفیس کا ہن کو لٹ بنایا گیا جس کے فیصلہ پر حرب کو یہ جرمانہ ادا کرنا پڑا کہ وہ ستواؤں بنائیں جناب عبدالمطلب کے حوالے کرے جنھیں وہ اس مقتول یہودی کے وارث کو خون بہا کے طور پر دے دیں اور اس یہودی کا جو مال لوٹا گیا تھا وہ سب بھی واپس دوا لیا گیا۔ چند چیزیں دستیاب نہیں ہوئیں تو ان کا ادا ان حضرت عبدالمطلب نے اپنے مال سے ادا کیا۔ پچھلے در پے شکست کھانے کے لازمی نتیجے کے در پر بنی امیہ عربی خون کی بہت سی لطافتیں کھوتے گئے اور ان میں دماءت فریب، احساں کمتری اور دوسرے اسی طرح کے اوصاف پیدا ہوتے گئے جو مسلسل شکست کھانے والوں کی خاصیت ہوا کرتا ہے۔ یہاں تک کہ بنی ہاشم اور بنی امیہ کے درمیان عام افراد عرب کی نگاہوں میں اتنا فرق پیدا ہوتا گیا کہ یہ چیز قابلِ بے لگنی کہ یہ دونوں ایک ہی نسل کی دو شاخیں ہیں بھی نہیں۔ عرب قوم کے یہ تاثرات دیکھ کر بنی امیہ بنی ہاشم کے خلاف ضربیں لگاتے تھے مگر مرتبہ انھیں کافی ہی ہوتی تھی حضرت محمد مصطفیٰ بھی اٹھے تو بنی ہاشم ہی کے یہاں سے۔ انہی بڑی شکست تھی جسے بنی امیہ آسانی سے سہہ نہ سکتے تھے۔ شبلی نعمانی سیوق النبی جلد اول میں ص ۵۸ پر لکھتے ہیں: ”آخرت کی نبوت کو خاندان بنی امیہ اپنے رقیب (ہاشم) کی فتح خیال کرتا تھا اس لیے سب سے زیادہ اسی قبیلہ نے آخرت کی مخالفت کی۔“

طبقات ابن سعد طبعہ جدید (تالیف: ابن سعد، ج ۲، ص ۲۴۰، طبعہ ۱۹۶۵ء، دار الفکر، بیروت)۔

سے سیر کیا۔ اتفاق سے اس کے بعد ابرار یا، پانی برسا اور قحط سالی دور ہو گئی۔ ہر شخص کہنے لگا کہ اب کی پہلا بار ان رحمت کا چھینٹا وہ تھا جو ہاشم کے ذریعہ سے برسا۔ ہاشم کے معنی ہیں روٹیوں کا پورا کرنے والا۔ شاعر دل نے اس واقعہ کو خاص الفاظ میں نظم کیا۔ ایک شاعر نے کہا: ”عمر الذی ہشع الشریذ لقومہ قوم بمکة مستین عجاف“ ”عمر وہ ہاشم کا اصلی نام ہے، جنھوں نے اپنی قوم کے لیے روٹی کے ٹکڑے کر کے انھیں کھانا کھلایا، وہ قوم جو مکہ میں قحط سے بھوکے اور تباہ حال ہو رہی تھی۔“

امیہ دولت مند آدمی تھا۔ اس نے جو دیکھا کہ حضرت ہاشم نے یہ کیا تو اسے حسد دانگیر ہوا اور خواہ مخواہ بغرض مقابلہ اس نے بھی ہاشم کی نقل اتارنے کی کوشش کی مگر وہ کامیاب نہیں ہوا اور یہ امر قریش میں اسکی رسوائی اور بدنامی کا باعث بن گیا۔ اس بارے میں ہاشم کا کوئی تصور نہیں تھا مگر لوگوں کے طعنوں تشنیعوں سے کھسیا نے ہو کر وہ ہاشم کو برا بھلا کہنے لگا اور اس نے ہاشم کو ”منافرت“ کی دعوت دی۔ یہ ایک طرح کا مقابلہ عربوں میں رائج تھا کہ دو شخص اپنے اپنے کارناموں کو پیش کر کے کسی ثالث کو حکم بناتے تھے کہ وہ فیصلہ کر دے کہ کون ان میں زیادہ صاحبِ فخر و لائقِ عظمت ہے۔ اس ثالثی کے لیے زیادہ تر کاہن منتخب کیے جاتے تھے جو علمِ قیادہ اور نجوم میں بڑے ماہر ہوتے تھے۔ حضرت ہاشم نے اپنی عمر کی بزرگی اور اپنے رتبہ کی بلندی کے لحاظ سے امیہ کے ساتھ مقابلہ سے انکار کیا مگر قریش کے عام افراد نے حضرت ہاشم کو مجبور کیا۔ آخر آپ بھی آمادہ ہو گئے اور کہا کہ میں اس شرط پر مقابلہ کرتا ہوں کہ شکست خوردہ فریق اپنے مقابل کو ۵۰ اونٹ سیاہ آنکھوں والے سپرد کرے جو سرزمین مکہ میں خر کیے جائیں اور دس برس کے لیے وہ مکہ سے علاوطن ہو جائے۔ امیہ اس شرط پر رضامند ہو گیا چنانچہ قبیلہ خزاعہ کے کاہن کو حکم مقرر کیا گیا۔ اس نے فیصلہ ہاشم کے حق میں اور امیہ کے خلاف دیا۔ حضرت ہاشم نے قرارداد کے مطابق ۵۰ اونٹ حاصل کیے اور انھیں خر کر کے پھر تمام اہل مکہ کی

لے بہرت ابن ہشام ج ۱ ص ۵۷

عمرہ قدیم خوبوں کا شاہدہ تو موجود تھا لیکن زیادہ تر اس میں بری عادتیں داخل ہو گئی تھیں۔ وہ ہر سال مکہ میں بغرض حج جمع ہوتے تھے لیکن اس مقدس فرض کی اہمیت ان کے دلوں سے محو ہو چکی تھی۔ ان کے کارواں حجاز، عراق اور شام میں اب بھی اسباب سے لدے ہوئے جاتے تھے لیکن اب ان میں صنعت و تجارت کا جوش سرد ہو چکا تھا اور انتہائی غریب نے انھیں سرلیں بنا دیا تھا۔ ان میں اللہ کا ایک دھندلا اور مضمحل تصور موجود تھا لیکن ان کے بُت ان کے نزدیک زیادہ مقدس تھے۔ وہ صلح پسند اور مطمئن زندگی کے فوائد سے واقف تھے اور جنگ سے متنفر رہنا چاہتے تھے جسے ”شعلہ درآگ“ یا اس نخوس جانور سے جس کے یہاں کثرت سے توام پید ہوتے ہیں تشبیہ دیا کرتے تھے لیکن انکی خود غرضی اور غربت ان کو آمادہ کرتی تھی کہ وہ اپنے سایہ کے مال پر دست تپا دل دیراز کریں۔ وہ اپنے مُردوں کا خوب ماتم کرتے تھے لیکن انتقام کے لیے اپنے کو باز نہ رکھ سکتے تھے نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ نسلا بعد نسل برابر خونریز جنگیں جاری رہتی تھیں۔ وہ اپنے بچوں سے محبت کرتے تھے، اس لیے کہ وہ ان کے بگڑے ٹکڑے میں جو زمین پر چلے پھرتے ہیں لیکن ان ہی میں سے بعض کو اپنی عزت کا اتنا پاس رہتا تھا کہ وہ اس خیال کو برداشت نہیں کر سکتے تھے کہ ان کی لڑکیاں کسی ظالم بھائی یا چچا کی کنیزی میں چلی جائیں یا ان کے رحم و کرم پر چلی جائیں اور اس لیے وہ ان کی ہلاکت کو اپنی عزت کے برقرار رکھنے کا بہترین ذریعہ سمجھتے تھے

یہی حالت وہ ہوتی ہے جس کی اصلاح نہایت وار ہے کیونکہ دہر بربریت و وحشت سے گزرتی ہوئی قومیں سادہ لوح ہوتی ہیں۔ ان کے دلوں پر سیا نقش بٹھایا جائے وہ آسانی سے اتر آتا ہے اس لیے کہ اس کے خلاف کوئی نقش جما ہوا نہیں ہے گرجوں کی تمدنی خرابیاں وہ انھیں جو غصہ مادی ساخت کے تمدن اور ہوس اقتدار کی پیداوار ہوتی ہیں۔ انھوں نے عربوں کی افتاد طبع کے ساتھ مل کر سونے پر سہاگے کا کام کیا تھا۔

احساس برتری قومیت سے مستقل ہو کر حب الفریض کی طرف آتا ہے تو اس کا نتیجہ ہوتا ہے باہمی رقابت اور آپس کی خانہ جنگی۔ یہ بات عربوں میں اتنا درجہ پر پہنچ گئی تھی۔ پھر اسی کا نتیجہ

تیسرا باب اسلام اور اس کا پیغام

ظہور اسلام سے قبل کا زمانہ ایام جاہلیت کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ اس کے متعلق خیال درست نہیں ہے کہ عرب اس میں وحشت اور بربریت کے دور سے گزر رہے تھے اور تمدن و تہذیب سے واقف نہیں ہوئے تھے بلکہ جس طرح ڈاکٹر وحید مرزا صاحب نے لکھا ہے واقعہ یہ ہے کہ جنوبی عرب اسلام سے صدیوں قبل ایک بڑی تہذیب کا گہوارہ اور کاروبار تجارت کا ایک خوشحال مرکز تھا۔ جمہوری بادشاہوں کے آثار قدیمہ، سد مأرب، بارخ شداد اور تخت بلقیس بلکہ سبا وغیرہ کے تذکروں میں اس کا مکمل ثبوت موجود ہے۔ اس کے علاوہ ایام جاہلیت کی شاعری جو کہ ادب کا بہترین نمونہ ہے اسی سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ ایام جاہلیت کے عرب بہت سی خوبیوں کے حامل تھے۔ مثلاً بہادری، سخاوت، ایمان نوافی، وفاداری، شہرہری محبت اور برادری انس وغیرہ رخصاصہ یہ کہ شاعری ان کے اخلاقیات کا دفتر ہے اور اس سے پتہ چلتا ہے کہ وہ شرافت کا کافی عنصر رکھتے تھے۔ ان کی شاعری بالخصوص ان میں سے چند کی اس بات کو بھی ظاہر کر دے گی کہ اگرچہ وہ اس زمانے کے الہامی مذہب کو نہ ماننے کے باعث مشرک تھے اور بت پرستی بھی کیا کرتے تھے تاہم وہ مذہب کے خاص خاص عقائد سے بالکل ناواقف و بیگانہ نہ تھے۔ وہ اپنی بت پرستی کی یہ تاویل کرتے تھے کہ ان بتوں کے ذریعہ سے ہم خدا کے واحد (اللہ) کی بارگاہ میں قرب حاصل کرتے ہیں۔ پھر یہ کہ عربوں کی ایک بڑی تعداد جناب اسمعیل کی نسل سے تعلق رکھتی تھی اور یہ ناممکن ہے کہ وہ اپنے آباؤ اجداد کے تعلیمات سے قطعاً بیگانہ ہو گئے ہوں بلکہ حقیقت یہ ہے کہ تمدنی حیثیت سے اسلام سے قبل کے زمانہ میں عرب کی جماعت ترقی کے بعد منزل کی طرف جا رہی تھی۔ اب اس میں کچھ

تھا کہ مساوات انسانی کوئی چیز نہ رہی تھی اور غلبہ طاقت اور اقتدار سب کچھ تھا اس کی ایک ادنیٰ مثال یہ ہے کہ ایک بڑے آدمی کے قتل ہو جانے پر صرف اس کے قاتل کو قتل نہ کیا جاتا تھا بلکہ اس کے قبیلہ کے سینکڑوں بے گناہ آدمیوں کو مار ڈالا جاتا۔ تب کہیں یہ سمجھا جاتا تھا کہ اس کے خون کا بدلہ ہوا۔ اس کے برخلاف اگر بڑے آدمی کے ہاتھ سے کوئی چھوٹا آدمی قتل ہوتا تھا تو اس کا خون قصاص کا مستحق نہ سمجھا جاتا تھا۔ یہ بڑے اور چھوٹے کی تفریق ہزاروں تمدنی گنہوں کا سرچشمہ تھی اور انسانیت کے پرچے اڑا رہی تھی۔ اس کا سبب یہ تھا کہ انھوں نے مادیت کو سب کچھ سمجھ لیا تھا۔ مادیات کا تخیل باقی نہ رہا تھا اس لیے مادی طاقت ہی کی بنا پر وہ انبیائے قائم کرتے تھے۔ یہی حالت کم و بیش عرب کے علاوہ دوسرے ملکوں کی بھی تھی۔

مذہبی حیثیت سے عرب نہایت پستی میں تھے۔ ان میں کوئی ایک مذہب مشترک نہ تھا بلکہ وہاں متعدد مذاہب کے افراد رہتے تھے اور بڑی جماعت بُت پرستی اور ستاروں کی پرستش کو اپنا شعار بنا ہوئے تھے چنانچہ کعبہ ہی میں تین سو ساٹھ بُت رکھے ہوئے تھے جن میں سے ایک ایک کی پرستش سال کے ایک ایک دن کی جاتی تھی کیونکہ عربی سال ۳۶۰ ہی دنوں کا ہوتا ہے۔ جو مذہب رائج تھے جیسے یہود، مجوس اور نصاریٰ وہ بھی پستی کی طرف مائل نظر آ رہے تھے۔ اعمالِ ناشائستہ، دوسری جماعتوں سے نفرت، رواداری کا مفقود ہونا، آپس کی خونریزی اور ایسی ہی بہت سی خرابیاں ان میں واضح طور پر موجود تھیں اور اس لیے فطرتِ انسانی کسی ایسی منتخب ہستی کی خواہاں تھی جو دنیا کو اس مصیبت سے نجات دلائے۔

ایسے وقت میں محمد بن عبد اللہ اسلام کا زلزلہ افگن پیغام انقلاب لے کر دنیا کے سامنے آ گئے اور مردہ انسانیت کو زندگی کا مژدہ سنایا جیسا کہ ڈاکٹر وحید مرزا صاحب نے لکھا ہے۔ ”حضرت کا کام یقیناً دشوار تھا اس لیے کہ آپ محض وحشی لوگوں کو متدین نہیں بنا رہے تھے بلکہ بگڑی ہوئی سماجی کیفیت کو سدھارنا چاہتے تھے۔ آپ کا کام ان تمام عقائد و توہمات، روایات و مراسم کا عربوں کے دلوں سے محو کرنا تھا جو ان کی زندگی کا جزوِ لاینفک بن چکی تھی۔ رسول ان لوگوں کو بردباری

نکاساری، پاکبازی اور عفو کا سبق پڑھانا چاہتے تھے۔ جن کے نزدیک معاف کر دینا کمزوری کی دلیل اور انتقام نہ لینا ذلت اور بڑھئی کی علامت سمجھا جاتا تھا۔ رسول ان لوگوں کو مساوات اور انوثت کی تعلیم دینا چاہتے تھے جو کہ اپنے خاندانی شرف پر فخر کیا کرتے تھے اور اپنے آباؤ اجداد کے پورے شجرہ کو نہایت سختی کے ساتھ محفوظ رکھا کرتے تھے۔ ان چیزوں کے علاوہ اسلام کو عربوں کے اور بہت سے دوسرے رجحانات سے برسرِ پیکار ہونا پڑا۔ مثلاً اس نے شراب کی ممانعت کر دی جس کے وہ عادی ہو چکے تھے اور جس کا استعمال وہ سخاوت کی دیں سمجھتے تھے۔ اس نے قمار بازی، بند کردی جو کہ عربوں کے نزدیک بذل و بؤیہ کی ایک قطعی علامت تھی اور بہت سی حُرَبِ اخلاقِ عادلانہ کو ممنوع قرار دیا۔ عرب اس بات کا تصور بھی نہ کر سکتے تھے کہ سب سے زیادہ مقدس انسان کیونکر خدا کی بارگاہ میں سب سے زیادہ معزز ہو سکتا ہے یا اسلام قبول کرنے کے بعد کوئی پست انسان کیونکر عرب کے شریف ترین خاندانوں کے اشخاص سے برتری کا دعویٰ کر سکتا ہے۔

خواجہ غلام السیدین صاحب نے اسے بہت اچھے لفظوں میں لکھا ہے کہ ”اسلام ایک ایسی دینا کے لیے جو بچاریوں کے قبضہٴ اقتدار اور دہمتندوں کے زیرِ حکومت مصیبت کے دن کاٹ رہی تھی پیغامِ آزادی لے آیا۔ آزادی بچاریوں کی قید سے جو عید و معبود کے درمیان واسطہ بننے کے دھندلے تھے آزادی گروہِ امرا کی حکومت سے جو نہ کسی خدائی قانون کی پروا کرتے تھے اور نہ کسی انسانی قانون کی، بلکہ بغیر روک ٹوک کے حریفانہ طریقوں پر دوسروں کی محنت و مشقت کے پھلوں سے دلطف اندوز ہو رہے تھے، آزادی غلاموں اور بیچ قاتلوں کے لیے ان کے مالکوں کے مظالم و ظلمتِ انسانیت بے رحمانہ سلوک سے، آزادی طبقہٴ نسواں کے لیے اس عملِ غلامی سے جس میں انسانی حقوق کے ابتدائی منازل سے بھی محروم کر دی گئی تھیں، آزادی عام انسانوں کے لیے بقود سے جن میں وہ ذاتِ پات، رنگ اور قوم کی تنگ نظری کی بندشوں میں مبتلا تھے جن کی حیاتِ اجتماعی فنا ہو رہی تھی اور وہ متخاصمین کے گروہ میں منقسم ہو رہے تھے گروہِ انسانی کی طرح اپنی خود ساختہ ظالمانہ قیدوں میں مقید ہو رہا تھا۔ ہندوستان کے مشہور شاعر اور فلسفین

لحاظ سے تمام افراد انسانی یکساں حیثیت رکھتے تھے۔ اس کے سوا مساوات قائم کرنے کے لیے دولت کو برابر تقسیم کر دیا جائے لیکن باز دلوں کی طاقت، موردنی و جاہت، قوم و قبیلہ کی تقسیم کس طرح کی جاسکتی ہے؟ اسلام جانتا تھا کہ خارجی مساوات ممکن نہیں اس لیے اس نے ذہنی انقلاب پیدا کرنے کی کوشش کی تاکہ اس ذہنی تبدیلی کے ذریعہ ایک انسان دوسرے انسان کو برابر سمجھے۔ اس نے صحیح طور پر سمجھا کہ برادری اور برابری کی اصل کجی کیا ہے؟ احساسِ اخوت و مساوات کی واحد بنیاد یہ ہے کہ جب کوئی کثرت کسی وحدت کی طرف مستند ہو جائے گی تو اس کے اجزاء میں برادری اور برابری کا احساس پیدا ہو جانا فطری ہے۔ دو بھائی کیوں ایک دوسرے کے ساتھ برابری کا دعویٰ رکھتے ہیں؟ اس لیے کہ ایک باپ کے بیٹے ہیں، ایک خاندان کے آدمی کیوں آپس میں برادری اور برابری کا تصور رکھتے ہیں؟ اس لیے کہ ایک مورثہ اعلیٰ کی نسل سے ہیں۔ ایک ملک کے لوگ آپس میں کیوں رابطہ اخوت محسوس کرتے ہیں اور کیوں حقوق میں برابری کے طالب ہوتے ہیں؟ اس لیے کہ ایک سرزمین کے باشندہ ہیں۔ اتنا ہی نہیں بلکہ مشرق والے آپس میں یگانگی اور مغرب والے آپس میں یکجہتی کیوں محسوس کرتے ہیں؟ اس لیے کہ وہ آفتاب کے لحاظ سے ایک سمت کے رہنے والے ہیں۔ معلوم ہوا کہ کثیر افراد میں اتحاد و مساوات کا احساس پیدا کرنے کا ذریعہ صرف وہ ایک وسیع نقطہ واحد ہے جس کی طرف زیادہ سے زیادہ افراد کیساں طور پر منسوب ہو سکتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں کلیہ یہ ہوا کہ جب کوئی کثرت وحدت کی طرف منسوب ہو تو اس کے اندر برابری اور برادری کا احساس پیدا ہو جائے گا۔ گمراہ یا دکھنا چاہیے کہ مذکورہ بالا اتحادوں میں سے ہر اتحاد اقراق کا پیش خیمہ قرار پایا یعنی جب ایک باپ کے بیٹوں میں ایسا پیدا ہوا تو دوسرے باپ کے بیٹوں کے سامنے محاذ قائم ہوا اور جب ایک خاندان کے لوگوں میں ایسا قائم ہوا تو دوسرے خاندان والوں کے سامنے محاذ قائم ہوا جس کا نتیجہ ہوا کہ تہہ قوموں کی جنگ اور ممالک کا باہمی تصادم اور فتنہ و شکست کا غیر متناہی سلسلہ جس کے کرشمے آج بھی نظر آ رہے ہیں اور جب ایک سمت والوں میں اتحاد ہوا تو دوسری سمت والوں کے سامنے محاذ قائم

اقبال نے اس منظر کی تصویر کشی ذیل کے اشعار میں کی ہے۔

بود انسان در جہاں انسان پست ناکس و نابود ماند و زیر دست
سطوت کسری و قیصر رہز نش بند باد در دست و پاؤ گرد نش
کاہن و سلطان و پاپاؤ امیر ہر یک نچیر صد نچیر گیر
از غلامی فطرت او دود شدہ نغمہ با اندر نغمہ او خون شدہ

اسلام نے اسے ایک پیغام آزادی سنایا۔ حریت و مساوات اور انسانی برادری کی تلقین کی اور توارِ بیچ انسانی میں پہلے پہل شہری اور انسانی حقوق پورے طور پر عام انسانوں کو بالعموم عطا کیے جس سے وہ بہ سبب قومیت، رنگ یا جنس کے یا بہ سبب غربت و فلاکت کے محروم تھے۔ غریب، مظلوم اور عام انسانوں کے عام طبقہ کو جواب تک بڑی بیداری سے پیدا جارا تھا انہی امیدوں اور اپنے کارآمد ہونے کا نیا احساس عطا کیا۔

تا اینے حق بہ حق داراں سپرد بندگاں را مسند خاقاں سپرد
اعتبار کاربندان را فزود خواجگی از کار فرمایاں رلود
قوت او ہر کمن پیکر شکست نوع انسان را حاصلے تازہ بست
تازہ جہاں اندر تن آدم دمید بندہ را باز از خداوندان خرید
حریت زاد از ضمیر پاک او این سنے نیشیں چکید از تاک او
ناشکبہ امتیازات آمدہ در نہاد او مساوات آمدہ
عصر نو کیں صد چراغ آوردہ است چشم در آغوش او وا کردہ است

قیمتی خیالات تھے جن کو اسلام عربوں کی زندگی میں داخل کرنا چاہتا تھا اور عربوں کی دلت سے تمام انسانوں میں پہنچانا چاہتا تھا۔

اسلام نے اس ذہنی انقلاب کے پیدا کرنے کے لیے سب سے پہلے اصلی سبب کو دور کرنا

ہوا۔ یہاں تک کہ یورپ والے ایک الگ قوم بن گئے اور ایشیا والے ایک الگ قوم اور جب اس کے ساتھ رنگ کے اتحاد نے اثر دکھایا تو گوروں اور کالوں کا ایسا افتراق پیدا ہوا کہ گوروں نے کالوں کو اپنے ساتھ ایک ہوٹل میں کھانا کھانے سے روکا بلکہ ایک عبادت گاہ میں عبادت کے لیے ایک ہی مذہب والوں کے لیے جمع ہونا تک ممنوع قرار دیا۔ یہ سب نتیجہ تھا اس کا کہ اتحاد کی دیواریں عالم انسانیت کے بیچ بن اٹھائی گئی تھیں اس لیے ہر دیوار جو اٹھی اس نے ادھر والوں کو تو متحد کیا اور ادھر والوں کو جدا کر دیا۔ اسلام نے اس اصل اصول کو لیتے ہوئے کہ اتحاد افراد کا راز اتحاد مرکزیت میں مضمر ہے ضرورت سمجھی کہ ان تمام درمیانی دیواروں کو ڈھادیا جائے اور بیچ کے ان تمام خطوط کو مٹا کر ان کی بجائے ایک وسیع احاطہ ایسا قائم کیا جائے جہاں نسل، رنگ، ملک اور قومیت کسی چیز کی تفریق نہ ہو۔ وہ احاطہ ایسا ہو جو تمام عالم انسانی کو اپنے گھیرے میں لے لے اور چونکہ اس احاطہ کے باہر کچھ رہ نہیں جائے گا اس لیے افتراق و امتیاز کا سوال ہی پیدا ہو سکے گا۔ اس کے لیے کوئی مادی چیز نقطہ مرکزی نہیں بن سکتی تھی کیونکہ جو مادی شے ہوگی وہ محدود ہوگی اور محدود ہونے کے ساتھ اس میں قرب و بعد نیز کمی اور زیادتی کے مدارج پیدا ہوں گے اس لیے ضرورت تھی کہ نگاہ کو تمام مادی چیزوں سے ہٹا کر اس غیر مادی بلند و بالا تر طاقت کی طرف موڑ دیا جائے جہاں حدود و اقدار قائم نہیں ہوتے۔ اس کا سب کے ساتھ یکساں تعلق ہے جو سب کا ہے اور سب اس کے ہیں۔ یہ خالق کی ذات ہے جسے اسلام نے معبود برحق اور خدائے کلّی ثابت کرتے ہوئے سب کا قبلہ مقصد قرار دے دیا ہے۔

اس احساس کے پیدا ہونے کے ساتھ کہ سب خدا کے بندے ہیں۔ افراد انسانی میں اس اخوت و مساوات پیدا ہونا لازمی ہے جب ایک باپ کے بیٹے آپس میں بھائی بھائی ہیں اور ایک مورث اعلیٰ کی اولاد میں برادری قائم ہو جاتی ہے اور ایک سرزمین کے رہنے والے اپنی مادر وطن کے لحاظ سے آپس میں اخوت محسوس کرتے ہیں اور ایک سمت کے رہنے والے اپنے میں یکجہتی کا تصور کرتے ہیں تو کیا وجہ ہے کہ ایک خالق کے بندے سب آپس میں بھائی بھائی نہ بن

جائیں۔ یہ تھا وہ عملی سبق جو اسلام کی توحید میں مضمر تھا۔ بعض مذاہب نے خالق کے تخلیق میں بھی مغایرت برقی تھی۔ انھوں نے خدا کو اپنا قرار دے لیا تھا اور یہ کہتے تھے کہ ہم اس کے بیٹے ہیں۔ اسلام نے ان لوگوں کے خیال یا زعم کا ذکر کرتے ہوئے ایک طنزیہ انداز میں اس کی مخالفت کی اور اس کے مقابلہ میں سمانوں کو یہ تلقین نہیں کیا کہ تم ہی اللہ کے سپوت ہو اور بس، بلکہ مسلمانوں کو اقوام عالم کے مقابلہ میں یہ کہنے کی تعلیم دی کہ ہوریتنا و سریت کھلت اعمالنا و لکھ اعمالکھ (یعنی) وہ ہمارا بھی پروردگار ہے اور تمھارا بھی۔ ہمارے لیے ہمارے اعمال ہیں اور تمھارے لیے تمھارے اعمال، اس طرح اسلام نے سب کو مساوات کا درجہ دیتے ہوئے ایک معیار امتیاز کا بھی قائم کر دیا اور وہ انسانی کردار ہے۔ اب سابق کے تمام تفوق اور بلندی کے امتیازات مٹ کر ایک نیا معیار امتیاز کا قائم ہو گیا اور وہ یہ کہ جو شخص فرائض انسانی کو سب سے زیادہ انجام دیتا ہو وہ سب سے بہتر ہے۔ ان کو مکتھم عند اللہ التاکھم اس اصول کے ماتحت غلبہ طاقت، اقتدار، قوم و قبیلہ کی زیادتی اور تعداد کی اکثریت یہ تمام باتیں کچھ نہ رہیں بلکہ یہ اصول قائم ہو گیا کہ ایک انسان کو دوسرے انسان پر فقط اس فرائض کی بنا پر فضیلت حاصل ہوتی ہے۔ اس کے ماتحت اخلاق پر بہت زور دیا گیا۔ یہاں تک کہ بانی اسلام نے اپنا مقصد رسالت ہی یہ قرار دیا اور اعلان کیا انما بعثت لاقتم مکالم الاخلاق۔ دوسری لفظوں میں انما بعثت لاقتم حسن الاخلاق یعنی میری بعثت محض انسان سدھار اور اچھے اخلاق کی تکمیل کی غرض سے ہے۔ یہ مسلمانوں سے صاف کہہ دیا گیا کہ یہ خیال نہ کرنا کہ تمھیں تمھارے اعمال کی سزا ملے گی بلکہ جو جیسے اعمال کرے گا ویسا ہی پائے گا۔ مسلمان وہ ہے جو احکام خدا کے آگے سرنگوں ہو جائے۔ سرکشی مسلم کی شان نہیں ہے۔ تم اللہ کے دوست جب ہی کہلائے جا سکتے ہو جب اس کے احکام کی تعمیل کرو ورنہ اس کی رحمت کے حقدار نہیں اور نہ امت مرحومہ میں شامل ہونے کے قابل۔

استعمال" کا نام نہیں ہے بلکہ سیاست ملک و ملت کے صحیح نظم و ضبط اور امور خلق کے بہترین طریقہ پر چلانے کا نام ہے۔ اس لحاظ سے سیاسی حکومت مذہبی قیادت سے الگ نہیں ہو سکتی اور اس کی مثال خود حضرت پیغمبر کی ذات گرامی ہے۔

مگر یاد رکھنے کی بات ہے کہ حضرت محمد مصطفیٰؐ نے اس مکمل اقتدار کے باوجود جس کے ماتحت اعلان کر دیا گیا کہ "ان کو ہر شخص پر خود اس کی ذات سے زیادہ حق اور اختیار ہے" کبھی اپنے کو بادشاہ کہا یا کبھی جانا پسند نہیں کیا بلکہ اس سے انکار فرمایا۔ چنانچہ ایک مرتبہ ایک شخص آپ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ بول ہی آپ کے سامنے کھڑا ہوا رعب سے کانپنے لگا۔ آپ نے فرمایا: "اپنے آپ میں آؤ میں کوئی بادشاہ نہیں ہوں۔ میں تو ایک قرشی عورت کا بیٹا ہوں" جو شور بے میں رونے لگا کہ (غریبانہ کھانا) کھاتی تھی۔

یہ اس لیے تھا کہ مسلمانوں میں شریعت الہیہ کی رہبری سے الگ حکمران کا تخیل پیدا نہ ہو اور سوا خداوندی اقتدار کے کسی اقتدار کے آگے مسلمانوں کی گردنیں نہ جھکیں۔

معاشرت کے باب میں اس بات پر زور دیا گیا کہ سب انسان ذات اور اصلیت کے لحاظ سے ایک ہی ہیں (خلقکم من نفس واحدة) قابل اور اقوام میں ان کی تقسیم صرف تعارف اور شناخت کے لیے ہے (وجعلناکم شعوبا وقبائل لتعارفوا) مگر فضیلت و بلندی کا تعلق ذات اور قومیت سے بالکل نہیں ہے۔ لاخیر للقرشی علی غیر القرشی ولا للہجری علی غیر الہجری۔ فضیلت و بزرگی صرف پرہیزگاری اور تقویٰ یعنی انسانی اعمال اور فرائض کی بجائے آدمی کے ساتھ وابستہ ہے (ان اکرمکم عند اللہ اتقاکم) اس کو پیغمبر نے صرف قولاً نہیں بلکہ عملاً بھی دکھایا۔ آپ نے اپنا مؤذن بلال حبشی کو قرار دیا اور جب کسی نے اسے دیکھ کر ناک بھونچڑھائی اور کہا "یہ کالے رنگ کا غلام بھی بھلا اس قابل ہے کہ اذان دے؟" تو قرآن کی آیت اتری (یا ایہا الناس انا خلقناکم من ذکر و انثیٰ) یعنی سب آدمی یکساں ہیں، ان میں کوئی فرق نہیں ہے جیسا کہ عبدالحامد صاحب بدایونی نے کہا ہے۔ "اسلام دراصل حکومت الہیہ کا قیام چاہتا ہے۔ اسلامی حکومت کا دار و مدار عدل و انصاف قرار دیا گیا ہے۔ چنانچہ قرآن مجید نے اس بارے میں فرمایا ہے۔ واذا حکمتم بین الناس ان تحکموا بالعدل ان اللہ نعما یعظکم بہ (سورۃ نساء) ولا یحرمکم منکم شنآن قوم علی الا تعدوا اعدوا هو اقرب للتقویٰ واتقوا اللہ (بائہ) یعنی اگر تو غیر مسلمین کے بارے میں فیصلہ کرے تو انصاف سے فیصلہ کر۔ بے شک خدا انصاف کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔ اسلامی قانون میں شاہ و گدا یکساں حیثیت رکھتے ہیں۔ چنانچہ حضور انور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔ لیس لاحد علی احد فضل الا بالہ وتقویٰ (مشکوٰۃ) اسی کا نتیجہ یہ ہے کہ اسلام میں سیاست "حصول اقتدار کے کامیاب راہوں کے" سے اس نے تم کو ایک نفس سے پیدا کیا۔ تم نے تمہیں مختلف خاندانوں اور قبیلوں میں اس لیے قرار دیا کہ آپس میں شناسائی پیدا ہو۔ قرشی کو غیر قرشی اور عرب کو غیر عرب پر کوئی فخر نہیں۔ سب تم میں اللہ کے نزدیک سب سے زیادہ معزز وہ ہے جو تم میں سب سے زیادہ پرہیزگار ہو۔ وہ اللہ کے سچے مخلص ہیں۔

لوگوں کے رویہ پر تھا۔ انھوں نے اسلامی تعلیم پر عمل پیرا ہو کر اپنا ماتھ کھینچ لیا اور وہ اب ایک پیسہ سود کے نام سے دینے پر تیار نہیں۔ اس کے علاوہ اسلام کی تعلیم کہ افراد انسانی میں امتیاز صرف اخلاق حسنہ و فرائض الہیہ کی بنا پر ہے۔ دوسری کسی حیثیت سے فضیلت و تفوق حاصل نہیں ہو سکتا ان لوگوں کے اقتدار پر کاری ضرب تھی جو اس کے پہلے نسلی تفوق یا مال و دولت یا قوم و قبیلہ کی کثرت کی بنا پر غلبہ و اقتدار کی جائیداد پر قبضہ کیے ہوئے تھے۔ اسلام نے نظریہ تفوق و امتیاز بدل کر اس ملکیت میں داخل خارج کر دیا۔ اس طرح کے صاحبان اقتدار جتنے تھے وہ چونکہ اسلامی معیار عزت کے لحاظ سے صفر کا درجہ رکھتے تھے اس لیے وہ کچھ نہ رہے اور جو لوگ پر دیسی یا محتاج یا ان لوگوں کی نظر میں نیچ ذات ہونے کی وجہ سے نگاہ اٹھا کر بات کرنے کے قابل نہ سمجھے جلتے تھے وہ بڑے صاحب عزت ہو گئے۔ اس لیے کہ وہ عمل کی کسوٹی پر پورے اُترتے تھے اور پرہیزگاری اور تقویٰ میں درجہ کمال پر فائز تھے۔ یہ بات ان لوگوں کو ٹھنڈے دل سے کیونکر گوارا ہو سکتی تھی جواب تک عزت کی مسندوں پر اطمینان کے ساتھ براجم رہے تھے اور جو خلق خدا کو خدا کے بدلے خود اپنا غلام بنائے ہوئے تھے۔

بنی امیہ کے لیے ان تمام محرکات کے علاوہ ان کی دیرینہ محاصرت بنی ہاشم کے ساتھ اور ذاتی رشک و حسد بھی تھا جس کے ماتحت ان کے سرگروہ ابوسفیان نے تقریباً تمام عرب کو حضرت محمد مصطفیٰ ص کے خلاف براہیجھنے کر دیا۔

آپ کو طرح طرح کی تکلیفیں دی جانے لگیں۔ جسم پر پتھر مارے گئے۔ سر پر گڑا پھینکا گیا۔ نجاستیں ڈالی گئیں اور قتل کی دھمکیاں دی گئیں۔ یہاں تک کہ جب خطرہ بہت بڑھ گیا تو حضرت کے چچا ابوطالب نے آپ کو اپنے ایک محفوظ مکان میں جو پہاڑ کی گھاٹی میں ایک قلعہ کی صورت پر تھا منتقل کر دیا۔ تمام قریش نے باہم ایک تحریری معاہدہ کیا کہ بنی ہاشم سے نہ صرف شادی بیاہ ترک کر دیا جائے بلکہ ان کے ساتھ خرید و فروخت بھی نہ کی جائے گی۔ اس کے ماتحت محصورین تک ضروریات زندگی پانی اور کھانا تک پہنچنا تقریباً غیر ممکن بنا دیا گیا تھا۔ یہ واقعہ بعثت کے ساتویں سال کا ہے جو چار

چوتھا باب

اسلام کا مزاحم طاقتوں سے تصادم

جہاں تک کہ آئین اور نظام کی تشکیل کا تعلق ہے پیغمبر اسلام کی زندگی میں یہ مقصد حاصل ہو گیا اور لاکھوں آدمی اس کے تسلیم کرنے والے اور اس کو حق کہنے والے ہو گئے اور یہ ایک انقلاب کی کوئی کم کامیابی نہیں ہے۔ مگر اس انقلاب پیدا کرنے میں رسول کو کتنی دقتیں درپیش ہوئیں اور کن طاقتوں سے مقابلہ کرنا پڑا۔ یوں تو کچھ لوگ وہ ہوتے ہیں جو جذبات کے لحاظ سے ہر قدیم شے کے ساتھ الفت رکھتے ہیں اس لیے انھیں ہر انقلاب کے محرک سے "بغض للشی" ہوتا ہے۔ بغض للشی کا مطلب یہ ہے کہ چاہے اس انقلاب کا ان کی ذات سے کوئی تعلق نہ ہو اور انھیں اس سے کوئی نقصان بھی نہ پہنچتا ہو مگر وہ انقلاب سے صرف اس لیے دشمنی رکھتے ہیں کہ وہ انقلاب ہے لیکن کچھ لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جن کے خود غرضانہ مفاد قدیم رسم و رواج کے ساتھ وابستہ ہیں اور انھیں اس انقلاب سے اپنے منافع کا خون ہوتے ہوئے نظر آتا ہے۔ چنانچہ اسلام جو انقلاب لے کر آیا تھا اور اس نے زندگی کے ہر شعبہ میں جو تبدیلیاں کر دی تھیں ان سے بہت سی قسم کے لوگوں کو ذاتی نقصان پہنچ رہے تھے۔ یہ نقصانات مالی بھی تھے اور وجاہت و اقتدار کے بھی۔ مثال کے طور پر اسلام کی معاشی تعلیم کہ سود خواری ممنوع ہے، اس سے کیا تمام عرب کے ان ہما جڑوں کا دیوالہ نہیں نکل گیا۔ جن کی زندگی ہی حاجت مند مخلوق کا خون چوس کر اپنی ہوس دولت مندی کے پورا کرنے پر مبنی تھی۔ پھر اگر صرف یہ ہوتا کہ سود لو نہیں تو یہ ممکن تھا کہ یہ لوگ اسلام نہ قبول کر کے اپنے کو اس حکم کی پابندی سے محفوظ رکھتے مگر وہاں تو یہ تھا کہ نہ سود لو اور نہ سود دو۔ ظاہر ہے کہ سود دینا کام ہوتا ہے کم حیثیت ہی لوگوں کا جو مقناطیسی کشش کے ساتھ اسلام کے غریب پرور تعلیمات کی طرف کھینچے چلے جا رہے تھے۔ اب اگر میرا یہ دار خود اسلام نہ بھی قبول کریں تو کیا فائدہ، جب ان کی زندگی کا دار ویدار جن

پڑا۔ اس کے بعد ابوسفیان نے عہد کیا کہ وہ اس وقت تک نہائے گا نہیں جب تک کہ رسول م پر پڑھائی نہ کرے۔ مگر اب مشرکین میں عام طور پر مقابلہ کی ہمت نہ تھی۔ مجبوراً ابوسفیان نے صرف بوائے نام اپنی قوم کو پورا کرنے کے لیے دو سو سوار قریش کے اکٹھا کیے اور ان کو لے کر مدینہ کی طرف روانہ ہوا۔ مدینہ کے حدود میں پہنچ کر اس نے رسول م کے دو پیروں کو قتل کر ڈالا اور کھجور کے درختوں کو تباہ کر دیا۔ حضرت مؐ مع اپنے پیروں کے جنگ کے لیے نکل آئے مگر ابوسفیان مع اپنے ساتھیوں کے خوف کھا کر پہلے ہی فرار ہو چکا تھا اور سب بھاگنے کی جلدی میں اپنے سامان کے گھروں کو راستے میں پھینکے گئے تھے۔ اس میں زیادہ تر ستونہ بندھے ہوئے تھے جو مسلمانوں کو حاصل ہوئے۔ اسی وجہ سے اس کو ”جنگ سوتی“ کہتے ہیں کیونکہ عربی میں سولہ کے معنی ستون کے ہیں۔ ہجرت کے تیسرے سال وہ نہایت اہم لڑائی پیش آئی جس کو اُحد کی جنگ کہتے ہیں۔ عکرمہ بن ابی اہل، ابوسفیان اور ہند کو اس وقت تک چین کہاں آسکتا تھا جب تک کہ وہ رینہ والوں سے انتقام نہ لیتے۔ مکہ والوں نے بڑی بڑی تیاریاں کی تھیں۔ ان کی فوج میں قریش کے علاوہ خاندان کنانہ اور ہاشم کا گنہگار تھا بھی شامل تھے۔ فوج میں تین ہزار مسلح سپاہی تھے۔ ان میں سات سو زرہ پوش تھے۔ ان کے بالمقابل رسول خدا م کے ساتھ سات سو آدمی تھے جن میں صرف سو زرہ پوش تھے اور فوج میں فقط دو گھوڑے تھے۔ عکرمہ اور خالد بن ولید دونوں فوج کے سر تھے اور ان بات یہ تھی کہ فوج کے عقب میں ابوسفیان کی بیوی ہند مکہ کی دوسری عورتوں کے سا میدان جنگ میں ڈھول بجا کر سپاہیوں کی حوصلہ افزائی کر رہی تھی۔ ہند کے اشعار اس موقع کے جو وہ پڑھ رہی تھی کتب تاریخ میں محفوظ ہیں۔

ہند کے انتقامی جذبات کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ اُحد کی جنگ میں جب رسول م کے چچا حضرت حمزہ شہید ہوئے تو ہند جذبات انتقام میں اپنی صفت بلکہ انسانیت کی حدود سے گزر گئی۔ اس نے اس بربریت

لہ ابن ہشام ج ۲ ص ۵۵ طبری ج ۲ ص ۲۹۹ لہ ابن ہشام ج ۲ ص ۲۵۲ لہ ابن ہشام ج ۲ ص ۲۵۲

برس تک قائم رہا۔ چار برس کی طویل مدت کے بعد یہ ترک مولات ختم ہوا اور یہ لوگ قلعہ سے باہر نکلے۔ اب کچھ دن تک مخالفتیں ٹھنڈی رہیں مگر پھر ایک ہی سال کے اندر ابوطالب اور خدیجہ دونوں کی وفات کے بعد اس مخالفت نے انتہائی زور پکڑا یہاں تک کہ اہل مدینہ تک اسلام کی روشنی پھیلی اور انھوں نے آپ کو مدینہ کی طرف تشریف لے جانے کی دعوت دی اور آپ نے بہت سے مسلمانوں کو وہاں بھیج دیا۔ تو اب مشرکین نے آپ کو قتل کر دینے کا پورا منصوبہ تیار کر لیا۔ جس کے بعد آپ نے مدینہ کی طرف ہجرت فرمائی۔

مدینہ میں آکر بھی مخالفین نے چین سے نہ بیٹھنے دیا۔ ایک طرف تو ان لوگوں کو جو آپ پر ایمان لائے تھے اور مجبوراً مکہ میں رہ گئے تھے طرح طرح کی تکلیفیں پہنچانی جاتیں۔ دوسری طرف آپ کے بجائے پناہ مدینہ منورہ پر فروغ کشتی کے انتظامات ہونے لگے۔ آپ کو اپنی حفاظت اور اپنے سے زیادہ ان لوگوں کے گھربار کی حفاظت کے لیے جنھوں نے آپ کو پناہ دی تھی میدان مقابلہ میں نکل آنا پڑا۔

سب سے پہلی جنگ جو مدینہ میں آکر ہوئی بدر کی لڑائی تھی۔ اس موقع پر مسلمان بالکل تیار نہ تھے۔ صرف تین سو تیرہ آدمی جن کے پاس سوار ہونے کو صرف تین گھوڑے تھے۔ اور چند تلواریں۔ مگر بنی ہاشم کی تلوار نے مقابل والوں کے دانت کھٹے کر دیے۔ حمزہ بن عبد المطلب، عبیدہ بن حارث اور علی بن ابیطالب نے وہ کارہائے نمایاں دکھائے کہ مخالفوں کی ہمت پست ہو گئی۔ اگرچہ اسلام کو بالخصوص بنی ہاشم کو یہ بڑا نقصان پہنچا کہ عبیدہ اس جنگ میں شہید ہو گئے مگر مکہ والوں کو اور بالخصوص بنی امیہ کو بہت زیادہ نقصانات سے دوچار ہونا پڑا۔ اس میں ابوسفیان کو علی بن ابیطالب کے ہاتھ سے محض اپنے بیٹے خطلہ کے قتل ہی پر ماتم کرنا نہیں پڑا بلکہ آپ نے اس کے ایک دوسرے بیٹے عمرو کو قید بھی کیا۔ اس کے علاوہ اس کی بیوی ہند کو اپنے باپ عقبہ اور اپنے چچا شیبہ اور بھائی ولید کا قتل کرنا

لہ طبری ج ۱ ص ۲۲۹ لہ طبری ج ۲ ص ۲۵۲ لہ ابن ہشام ج ۲ ص ۲۵۲ لہ ابن ہشام ج ۲ ص ۲۵۲

لہ ابن ہشام ج ۲ ص ۲۵۲ لہ ابن ہشام ج ۲ ص ۲۵۲ لہ ابن ہشام ج ۲ ص ۲۵۲

مقام تک رسولؐ کا راستہ رد کرنے کے لیے نکل آئے۔

ظاہر ہے کہ مسلمانوں کی ہمیت اس کے قبل کی حاصل شدہ پلے درپلے فتوحات سے بڑھی ہوئی تھیں اور سامنے وہی شکست خوردہ جماعت تھی جو اس وقت جنگ کے لیے کوئی تیاری بھی نہ کر سکی تھی اس لیے یہ بہت آسان تھا کہ آپؐ مقابلہ کا حکم دے دیتے اور فاتحانہ صورت سے مکہ میں داخل ہوتے مگر پیغمبر اسلامؐ کو امن پسندی کا ثبوت دینا تھا جو نہی گرد و غبار اٹھاتا نظر آیا آپؐ نے فرمایا: اس راستے کو چھوڑ دو کسی دوسرے راستے سے آگے نکل چلو۔ چنانچہ دائیں جانب کا رخ کیا گیا اور آپؐ حمص کی پشت پر سے "نقۃ المراء" ہوتے ہوئے حدیبیہ کو جو راستہ جاتا ہے ادھر متوجہ ہوئے۔

آپؐ کی اس امن پسندی کے مظاہرہ کا جماعت مخالفت کو اس حد تک احساس ہوا کہ وہ بھی واپس چلی گئی اور اس نے اب نامہ و پیام کا سلسلہ شروع کیا۔ چنانچہ عروہ بن مسعود ثقفی نے اگر گفتگوئے صلح کا آغاز کیا اور حضرت رسول خداؐ کی صلح پسندانہ باتوں سے ایسی خوشگوار فضا قائم ہوئی کہ سہیل بن عمرو قریش کا نمائندہ بنا کر گفتگوئے صلح کے لیے حضرت کے پاس بھیجا گیا اور اس نے اپنی عہدت کے مطالبات پیش کر دیے۔ یہ مطالبات سب مشرکین کے حق میں تھے اور ان کے ذریعہ سے بظاہر پیغمبر اسلامؐ کو دبا جا جا رہا تھا مگر آپؐ نے ان سب باتوں کو منظور فرمایا اور صلح نامہ مرتب ہو گیا۔ اس صلح نامہ کے شرائط حسب ذیل تھے:-

- ۱۔ رسولؐ اس سال مع اپنے تابعین کے بغیر زیارت کیے ہوئے واپس جائیں۔
- ۲۔ دس سال تک آپؐ میں جنگ نہ ہو۔
- ۳۔ جو شخص قریش میں سے اپنے ولی کی اجازت کے بغیر رسول اللہؐ کے پاس چلا جائے اس کو آپؐ واپس کر دیں گے مگر جب آپؐ کے پاس سے کوئی نکل کر قریش کے پاس چلا جائے تو قریش واپس نہ کریں گے۔

۴۔ جو قبیلہ رسولؐ کا حلیف ہو نا چاہے وہ آپؐ کے ساتھ معاہدہ دوستی کر لے اور جو قبیلہ

لہ طبری ج ۳ ص ۵۷

کا ثبوت دیا کہ جناب حمزہؓ کا پہلو چاک کر کے ان کا جگر نکلوایا در اسے منہ میں رکھ کر چبانے کی کوشش کی اور کشتوں کے کان اور ناک وغیرہ اعضائے جسم کا گلوبند اور سینہ بند بنایا۔ بلکہ بعض راویوں نے تو یہاں تک بیان کیا ہے کہ اس نے حضرت حمزہؓ کے جگر کو بھون کر کھا لیا۔ اس سے اُس عناد اور دشمنی کا اندازہ کیا جاسکتا ہے جو اس خاندان کے مردوں اور عورتوں کے دلوں میں نبی ہاشم پیغمبر اسلامؐ اور اسلام کے خلاف پایا جاتا تھا۔

اس جنگ میں اگرچہ عام طور پر مسلمانوں کی جماعت میں بڑی ابتری پیدا ہو گئی تھی مگر آخر میں نبی ہاشمؐ اور بالخصوص علیؓ بن ابیطالبؓ کی تلوار نے مخالف جماعت کو شکست دی اور وہ ہزیمت خوردہ صورت میں واپس گئی۔ اب ان کی انفرادی طاقت رسولؐ کے مقابلہ میں نامانی ثابت ہو چکی تھی۔ اس لیے شکست میں آخری کوشش انھوں نے یہ کی کہ جتنی جماعتیں ملک عرب میں اسلام کے خلاف ان کو مل سکتی تھیں سب کو متحد کیا۔ یہاں تک کہ یہود کو ساز باز کر کے اپنے ساتھ ملایا اور اجتماعی طاقت سے دس ہزار کے لشکر کے ساتھ وہ اس جنگ کے لیے آئے جس کو اسی جتھے بندی کی وجہ سے "جنگ احزاب" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ ان کے مقابلہ میں مسلمان تین ہزار تھے مگر فوج مخالفت کو اس مرتبہ بھی شکست کا روز بد دیکھنا نصیب ہوا اور ان کا مایہ ناز سورما عمرو بن عبدود ابن ابی قیس عامری، علیؓ بن ابیطالبؓ کے ہاتھ سے تلوار کے گھاٹ اتر آئے۔ ابوسفیانؓ کو باہمال خستہ دتیاہ مگر واپس جانا پڑا اور اب بہت مقابلہ لشکر کشی ختم ہو گئی مگر دل میں ان شکستوں سے جو گھاؤ پڑے تھے وہ کبھی بھی بھرنے نہ سکے تھے۔

پیغمبر اسلامؐ نے جب کچھ عرصہ تک یہ دیکھا کہ اب مشرکین قریش کی طرف سے کوئی جنگی کاروائی نہیں ہوتی تو آپؐ نے سلمہ میں خانہ کعبہ کی زیارت (عمہ) کا ارادہ کیا اور مسلمانوں کی جماعت کے ساتھ مکہ کی طرف روانہ ہوئے۔ آپؐ کے پاس بُرنے (قربانی کے اونٹ) تھے جس سے ظاہر تھا کہ آپؐ ثرائی کے لیے نہیں جا رہے ہیں۔ مگر جب قریش کو رسولؐ کے آنے کی خبر پہنچی تو وہ خالد بن ولیدؓ کی قیادت میں کراع نعیمؓ

لہ ابن ہشام ج ۲ ص ۲۳ طبری ج ۳ ص ۵۷ استیعاب ج ۲ ص ۵۷ طبری ج ۳ ص ۵۷

لہ ابن ہشام ج ۲ ص ۲۳ طبری ج ۳ ص ۵۷ استیعاب ج ۲ ص ۵۷ طبری ج ۳ ص ۵۷

لہذا آپ نے اس کا موقع نہ دیا اور صلح کے شرائط کی پابندی اس حد تک فرمائی کہ ابھی یہ تحریر خشک نہ ہونے پائی تھی کہ خود ہستی بن عمرو (جو مشرکین کی طرف سے نمائندہ صلح تھا) کا لڑکا جو پہلے سے مسلمان ہو چکا تھا اور اسے صرف اسلام لانے کی وجہ سے گھر والوں نے لوہے میں جکڑ دیا تھا۔ اس وقت موقع پا کر باہر زنجیر ہونے ہی کی حالت میں واحمدہ، واحمدہ کہتا ہوا آیا اور اپنے کو رسول کے سامنے ڈال دیا۔ ہتھیل نے جو یہ دیکھا تودہ کھڑا ہو گیا، اسے طمانچہ لگایا اور گریبان کپڑے کھینچتا ہوا لے چلا۔ اس نے پکار کر آواز دی۔ کیوں مسلمانو! کیا میں پھر مشرکین ہی کی طرف واپس کر دیا جاؤں گا کہ وہ مجھے دین سے منحرف کرنے کی کوشش کریں۔ مگر حضرت نے کوئی تعرض نہیں فرمایا اور کہا، اے ابو جندل! صبر کر یہ چند دن کی تکلیف ہے۔ اللہ تیرے لیے اور تمام کمزور مسلمانوں کے لیے جو مشرکین کے پنجوں گرفتار ہیں کوئی کنش کی صورت پیدا کرے گا۔ اس وقت تو ہم نے اس قوم کے ساتھ ایک معاہدہ کر لیا ہے اور اس معاہدہ کی مخالفت ہم نہیں کریں گے۔

غرض پیغمبر اسلام نے ان غیر سادہ شرائط پر صلح کر کے مکہ سے واپسی اختیار کی اور دوسرے سال معاہدہ کے مطابق مکہ کی زیارت کے لیے تشریف لے گئے۔ مشرکین نے تین دن کے لیے شہر خالی کر دیا اور رسولؐ اپنے ساتھیوں سمیت مکہ میں داخل ہوئے۔ مراسم زیارت بجالائے اور پھر حسب معاہدہ تین دن کے بعد مکہ کو چھوڑ دیا اور مدینہ واپس چلے گئے۔ مگر مکہ والے اس کے بعد معاہدہ کے دوسرے دفعات عدم تعرض پر قائم نہیں رہے۔

معاہدہ میں قبائلی کو جو اختیار دیا گیا تھا کہ وہ جس کے ساتھ چاہیں شریک ہو جائیں۔ اس کے تحت قبیلہ خزاعہ پیغمبر اسلام کا حلیف ہوا تھا اور بنی کبر نے مشرکین کے ساتھ حلیف ہونے کا اعلان کیا تھا چونکہ ان دونوں قبیلوں میں قدیم عداوت تھی اس لیے دونوں ہمیشہ ایک دوسرے کے خلاف تیار رہتے تھے۔ مگر اب جو ان میں ہر ایک ایک جناب معاہدہ کے رو سے منسلک ہو

۱۔ طبری ج ۳ ص ۸۰۔ ۲۔ ابن ہشام ج ۲ ص ۲۴۹۔ ۳۔ طبری ج ۳ ص ۱۵۱۔ بخاری

۴۔ مسلم ج ۲ ص ۱۵۵

قریش کے ساتھ معاہدہ دوستی کرنا چاہے وہ ان کے ساتھ ہو جائے۔

۵۔ آئندہ سال مسلمان مکہ کی زیارت کے لیے آسکیں گے اس طرح کہ باشندگان مکہ تین دن کے لیے مکہ کو خالی کر دیں گے مگر مسلمانوں کو لازم ہوگا کہ تین دن کے اندر مکہ سے باہر نکل جائیں اور ایک آدمی بھی تین دن کے بعد مکہ میں رہنے نہ پائے۔

۶۔ مسلمان اپنے ساتھ اس طرح کے اسلحہ لاسکیں گے جیسے مسافر اپنے ساتھ رکھتے ہیں یعنی تلواریں نیام کے اندر رکھی ہوئی۔

یہ ایسی غیر متوازن شرطیں تھیں کہ پیغمبر اسلام کے اکثر ساتھ والوں میں جو رسولؐ کے بند مصالح کی تہ تک پہنچنے سے قاصر تھے۔ شدید بے چینی پیدا ہو گئی تھی۔ تاریخ کے الفاظ یہاں تک ہیں کہ لوگوں کے دلوں میں امر عظیم پیدا ہوا یہاں تک کہ قریب تھا کہ وہ ہلاکت میں مبتلا ہو جائیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ان کے عقائد میں تزلزل ہو گیا، ایسا کہ قریب تھا کہ وہ اسلام سے منحرف ہی ہو جائیں۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ جب پیغمبر خداؐ نے معاہدہ کی تکمیل کے بعد اصحاب سے فرمایا کہ اٹھو، قربانیاں کرو اور پھر سردوں کے بال منڈوا کر واپس چلو۔ تو عالم یہ تھا کہ رسولؐ حکم دے رہے تھے اور مجمع کی اکثریت خاموش تھی۔ کوئی تعمیل کے لیے اٹھتا نہ تھا۔ یہاں تک کہ جب حضرت نے ان کی طرف سے بے اعتنائی اختیار کر کے خود جاکر قربانی کی اور بال منڈوائے تو مجبوراً دوسرے لوگ بھی کھڑے ہوئے اور سردوں کے بال منڈونا یا تراشنا شروع کیے مگر رنج اور صدمہ کا یہ عالم تھا کہ معلوم ہوتا تھا ایک دوسرے کو قتل کر رہا ہے۔

لیکن رسولؐ نے اپنے ساتھیوں کے ان جذبات کا کوئی لحاظ نہ کیا اور کفار کے ان جابرانہ شرائط کو منظور کر کے واپسی اختیار فرمائی۔ اس خیال سے کہ اگر اس موقع پر جنگ کر کے مکہ کو فتح کیا جاتا تو کہنے کو ہوتا کہ رسول اسلامؐ چڑھائی کر کے آئے۔ اس طرح جابرانہ حملہ کا الزام آپ پر عائد کیا جاتا

۱۔ سیرت ابن ہشام ج ۲ ص ۲۱۶۔ ۲۔ طبری ج ۳ ص ۹۹۔ ۳۔ طبری ج ۲ ص ۹۹

۴۔ طبری ج ۳ ص ۱۵۵

ڈال دینے مناسب سمجھے اور اسی مجبوری کے عالم میں ابوسفیان نے بھی ظاہری طور پر اسلام قبول کر لیا۔ جس کا واقعہ یہ ہے کہ عباس بن عبدالمطلب اور ابوسفیان میں پرانے زمانے کی دوستی تھی۔ اس رات کو جب رسولؐ مکہ کے قریب پہنچ چکے تھے اور مشرکین پر ہراس چھایا ہوا تھا ابوسفیان مع چند آدمیوں کے رسولؐ خدا کی نقل و حرکت کا حال معلوم کرنے کے لیے شہر سے باہر نکلا۔ اسی وقت عباس اس فکر میں نکلے تھے کہ اگر قریش نے پیغمبرؐ خدا کی مخالفت برقرار رکھی تو یہ سب آج مارے جائیں گے۔ ابوسفیان کو وہاں پا کر انھوں نے کہا، کچھ خبر ہے؟ رسولؐ دس ہزار مسلمانوں کی جمعیت کے ساتھ آئے ہیں، تم ان کا مقابلہ ہرگز نہیں کر سکتے۔ ابوسفیان نے کہا پھر آپ کی کیا رائے ہے؟ مجھے کیا کرنا چاہیے؟ انھوں نے کہا۔ اؤ میرے ساتھ اونٹ پر بیٹھ جاؤ اور رسولؐ کے پاس چل کر امان حاصل کر لو ورنہ اگر تم ان کے ہاتھ آگے تو بغیر قتل کیے نہ چھوڑیں گے۔ ابوسفیان کو یہ ذریعہ غنیمت معلوم ہوا وہ ناقہ پر بٹھ چکے اور عباس اسے لیے ہوئے پیغمبرؐ کے پاس حاضر آئے۔ رسولؐ خدا سے اس کے لیے امان چاہی پیغمبرؐ نے فرمایا کہ اچھا اس وقت امان ہے۔ صبح کو انھیں پھر میرے پاس لائیے گا۔ حسبِ حکم صبح کو عباس نے ابوسفیان کو حاضر کیا۔ حضرتؐ نے اس کو اسلام کی دعوت دی۔ وہ پس و پیش کرنے لگا۔ عباس نے کہا اسلام قبول کرو نہیں تو جان کی خیر نہیں۔ یمن کر ابوسفیان نے اسلام قبول کیا۔

بخاری کی روایت سے ظاہر ہوتا ہے کہ ابوسفیان اور اس کے ساتھی جب معلومات حاصل کرنے باہر نکلے تو اتفاق سے لشکرِ اسلام کے پہرہ داروں کے ہاتھوں میں گرفتار ہو گئے اور رسولؐ کی خدمت میں حاضر کیے گئے۔ اس وقت ابوسفیان نے اسلام قبول کیا۔

پیغمبرؐ خدا کی یہ وسعتِ قلبی تھی کہ آپؐ نے ابوسفیان کی نہ صرف جان بخشی فرمائی بلکہ اعلان کر دیا کہ جو ابوسفیان کے گھر میں پناہ لے لے اے بھی امان ہے اور جو مسجدِ احرام میں داخل ہو جائے اسے امان ہے اور جو اپنے گھر کا دروازہ بند کر کے بیٹھ جائے وہ بھی امان میں ہے۔ دوسری روایت

گیا اور بڑے پا گیا کہ دس برس تک جانیں میں جنگ نہ ہوگی تو خزاہ کے لوگ مطمئن ہو گئے۔ انھوں نے اسلحہ ہم سے اتار دیے اور جنگ کی تیاریاں ترک کر دیں۔ بنی بکر نے اس موقع کو غنیمت سمجھا اور بنی خزاہ پر اس وقت جب کہ وہ ایک چشمہ کے کنارے مقیم تھے حملہ کر دیا اور بہت سے لوگوں کو قتل کر ڈالا۔

قریش کے آدمیوں نے بھی علانیہ نہیں تو خفیہ بنی بکر کو مدد پہنچائی اور وہ بھی خزاہ کی تباہی کے شریک ہوئے۔

مجبوراً قبیلہ خزاہ کا ایک آدمی جس کا نام عمرو بن سالم تھا فریاد کرتا ہوا مدینہ گیا اور اس وقت جب پیغمبرؐ خدا اصحاب کے درمیان مسجد میں تشریف رکھتے تھے اس نے انتہائی درد انگیز اشعار میں اپنے قبیلہ کی رودادِ غم سنائی جس کے آخر میں حسبِ ذیل مضمون نظم تھا:-

”اے خدا کے رسولؐ! آپ کو معلوم ہو کہ قریش نے آپ سے عہد شکنی کی۔ بنی بکر نے ہمارے قبیلہ پر چشمہ کے کنارے کین گاہ سے حملہ کر دیا۔ وہ سمجھتے تھے کہ ہمارا کوئی فریاد رس نہیں ہے۔ اگر ہم جنگ کے لیے تیار ہوتے تو ان کی کیا مجال تھی کہ وہ ہم سے مقابلہ کرتے۔ وہ تعداد میں بھی کم اور طاقت میں بھی ہمارے مقابلہ میں ہمیشہ سبک ثابت ہوئے۔ مگر ہم تو نماز شب میں مصروف تھے۔ انھوں نے رکوع و سجود کی حالت میں اگر ہم کو قتل کر دیا۔“

ان اشعار کے پڑھنے کے دوران میں آپؐ کی ہمدردی کے تاثرات اتنے شدید ہو گئے تھے کہ آپؐ نے جواب میں کوئی طویل کلام سننے کے انتظار کی زحمت بھی دینا نہ چاہی اور اشعار ختم ہوتے ہی آپؐ کی زبان سے جو حمد نکلا وہ یہ تھا کہ ”قد نصرت یا عمرہ بن مسالحہ“ اس کے نتیجہ میں آپؐ تمام حجت کے درمیان کچھ مراحل طے کرنے کے بعد مسلمانوں کو لے کر مکہ معظمہ کی طرف روانہ ہو گئے۔ اب تیور بد لے ہوئے تھے۔ مشرکین میں طاقتِ مقابلہ تو اب تھی ہی نہیں۔ انھوں نے ہتھیار

پانچواں باب حسین بن علی کی ولادت اور ابتدائی زندگی

۳۳۔ ۳۴۔ ۳۵۔

حضرت محمد مصطفیٰ کو مکہ سے ہجرت کر کے مدینہ آئے ہوئے تیسرا برس تھا کہ ۵ شعبان کو حسین بن علی کی ولادت ہوئی۔

حضرت فاطمہ زہرا اپنے پدر بزرگوار رسالت کی خدمت میں مولود کو لے کر حاضر ہوئیں حضرت نے حسین نام رکھا اور ایک مہینہ کی قربانی کے ساتھ عقیدہ کیا۔

اب پیغمبر اسلام کی گود جو اسلام کی تربیت کا گوارہ تھی ان دو بچوں کی پرورش کامرکز بنی، ایک حسن اور دوسرے حسین۔

ان کی آنکھوں کے سامنے ایک طرف نانا کا اسوۂ حسنہ تھا جو بانی اسلام تھے، دوسری طرف باپ جو مجاہد و محافظ اسلام تھے اور تیسری طرف ماں بھطیہ خواتین کے لیے تعلیمات پیغمبر کی عملی ترجمان بننے کے لیے پیدا ہوئی تھیں۔ بقول اقبالؔ

مزرع تسلیم حاصل بقولؔ مادران را اسوۂ کامل بقولؔ

مجددین پانچوں وقت نماز جماعت پیغمبر کے بصیرت آفریں مواعظ اور خطبے، مسلمانوں کا ذوق و شوق اور جوش و خروش اور گھر میں رات دن عبادت و ذکر الہی کی آوازیں، تکبیر کی صدا، وحی کی آیتیں، غزوات کے تذکرے، اسلام کو ترقی دینے کے مشورے اور یا پھر غریبوں کی خبر گیری، کمزوروں کی دیکھ بھال اور مظلوموں کی دادرسی بس ہر وقت یہی ذکر ہے یہی فکر۔ یہی قصہ ہیں اور یہی

لہ کافی ج ۳۹۵ ۳۹۶ ۳۹۷ ۳۹۸ ۳۹۹ ۴۰۰ ۴۰۱ ۴۰۲ ۴۰۳ ۴۰۴ ۴۰۵ ۴۰۶ ۴۰۷ ۴۰۸ ۴۰۹ ۴۱۰ ۴۱۱ ۴۱۲ ۴۱۳ ۴۱۴ ۴۱۵ ۴۱۶ ۴۱۷ ۴۱۸ ۴۱۹ ۴۲۰ ۴۲۱ ۴۲۲ ۴۲۳ ۴۲۴ ۴۲۵ ۴۲۶ ۴۲۷ ۴۲۸ ۴۲۹ ۴۳۰ ۴۳۱ ۴۳۲ ۴۳۳ ۴۳۴ ۴۳۵ ۴۳۶ ۴۳۷ ۴۳۸ ۴۳۹ ۴۴۰ ۴۴۱ ۴۴۲ ۴۴۳ ۴۴۴ ۴۴۵ ۴۴۶ ۴۴۷ ۴۴۸ ۴۴۹ ۴۵۰ ۴۵۱ ۴۵۲ ۴۵۳ ۴۵۴ ۴۵۵ ۴۵۶ ۴۵۷ ۴۵۸ ۴۵۹ ۴۶۰ ۴۶۱ ۴۶۲ ۴۶۳ ۴۶۴ ۴۶۵ ۴۶۶ ۴۶۷ ۴۶۸ ۴۶۹ ۴۷۰ ۴۷۱ ۴۷۲ ۴۷۳ ۴۷۴ ۴۷۵ ۴۷۶ ۴۷۷ ۴۷۸ ۴۷۹ ۴۸۰ ۴۸۱ ۴۸۲ ۴۸۳ ۴۸۴ ۴۸۵ ۴۸۶ ۴۸۷ ۴۸۸ ۴۸۹ ۴۹۰ ۴۹۱ ۴۹۲ ۴۹۳ ۴۹۴ ۴۹۵ ۴۹۶ ۴۹۷ ۴۹۸ ۴۹۹ ۵۰۰ ۵۰۱ ۵۰۲ ۵۰۳ ۵۰۴ ۵۰۵ ۵۰۶ ۵۰۷ ۵۰۸ ۵۰۹ ۵۱۰ ۵۱۱ ۵۱۲ ۵۱۳ ۵۱۴ ۵۱۵ ۵۱۶ ۵۱۷ ۵۱۸ ۵۱۹ ۵۲۰ ۵۲۱ ۵۲۲ ۵۲۳ ۵۲۴ ۵۲۵ ۵۲۶ ۵۲۷ ۵۲۸ ۵۲۹ ۵۳۰ ۵۳۱ ۵۳۲ ۵۳۳ ۵۳۴ ۵۳۵ ۵۳۶ ۵۳۷ ۵۳۸ ۵۳۹ ۵۴۰ ۵۴۱ ۵۴۲ ۵۴۳ ۵۴۴ ۵۴۵ ۵۴۶ ۵۴۷ ۵۴۸ ۵۴۹ ۵۵۰ ۵۵۱ ۵۵۲ ۵۵۳ ۵۵۴ ۵۵۵ ۵۵۶ ۵۵۷ ۵۵۸ ۵۵۹ ۵۶۰ ۵۶۱ ۵۶۲ ۵۶۳ ۵۶۴ ۵۶۵ ۵۶۶ ۵۶۷ ۵۶۸ ۵۶۹ ۵۷۰ ۵۷۱ ۵۷۲ ۵۷۳ ۵۷۴ ۵۷۵ ۵۷۶ ۵۷۷ ۵۷۸ ۵۷۹ ۵۸۰ ۵۸۱ ۵۸۲ ۵۸۳ ۵۸۴ ۵۸۵ ۵۸۶ ۵۸۷ ۵۸۸ ۵۸۹ ۵۹۰ ۵۹۱ ۵۹۲ ۵۹۳ ۵۹۴ ۵۹۵ ۵۹۶ ۵۹۷ ۵۹۸ ۵۹۹ ۶۰۰ ۶۰۱ ۶۰۲ ۶۰۳ ۶۰۴ ۶۰۵ ۶۰۶ ۶۰۷ ۶۰۸ ۶۰۹ ۶۱۰ ۶۱۱ ۶۱۲ ۶۱۳ ۶۱۴ ۶۱۵ ۶۱۶ ۶۱۷ ۶۱۸ ۶۱۹ ۶۲۰ ۶۲۱ ۶۲۲ ۶۲۳ ۶۲۴ ۶۲۵ ۶۲۶ ۶۲۷ ۶۲۸ ۶۲۹ ۶۳۰ ۶۳۱ ۶۳۲ ۶۳۳ ۶۳۴ ۶۳۵ ۶۳۶ ۶۳۷ ۶۳۸ ۶۳۹ ۶۴۰ ۶۴۱ ۶۴۲ ۶۴۳ ۶۴۴ ۶۴۵ ۶۴۶ ۶۴۷ ۶۴۸ ۶۴۹ ۶۵۰ ۶۵۱ ۶۵۲ ۶۵۳ ۶۵۴ ۶۵۵ ۶۵۶ ۶۵۷ ۶۵۸ ۶۵۹ ۶۶۰ ۶۶۱ ۶۶۲ ۶۶۳ ۶۶۴ ۶۶۵ ۶۶۶ ۶۶۷ ۶۶۸ ۶۶۹ ۶۷۰ ۶۷۱ ۶۷۲ ۶۷۳ ۶۷۴ ۶۷۵ ۶۷۶ ۶۷۷ ۶۷۸ ۶۷۹ ۶۸۰ ۶۸۱ ۶۸۲ ۶۸۳ ۶۸۴ ۶۸۵ ۶۸۶ ۶۸۷ ۶۸۸ ۶۸۹ ۶۹۰ ۶۹۱ ۶۹۲ ۶۹۳ ۶۹۴ ۶۹۵ ۶۹۶ ۶۹۷ ۶۹۸ ۶۹۹ ۷۰۰ ۷۰۱ ۷۰۲ ۷۰۳ ۷۰۴ ۷۰۵ ۷۰۶ ۷۰۷ ۷۰۸ ۷۰۹ ۷۱۰ ۷۱۱ ۷۱۲ ۷۱۳ ۷۱۴ ۷۱۵ ۷۱۶ ۷۱۷ ۷۱۸ ۷۱۹ ۷۲۰ ۷۲۱ ۷۲۲ ۷۲۳ ۷۲۴ ۷۲۵ ۷۲۶ ۷۲۷ ۷۲۸ ۷۲۹ ۷۳۰ ۷۳۱ ۷۳۲ ۷۳۳ ۷۳۴ ۷۳۵ ۷۳۶ ۷۳۷ ۷۳۸ ۷۳۹ ۷۴۰ ۷۴۱ ۷۴۲ ۷۴۳ ۷۴۴ ۷۴۵ ۷۴۶ ۷۴۷ ۷۴۸ ۷۴۹ ۷۵۰ ۷۵۱ ۷۵۲ ۷۵۳ ۷۵۴ ۷۵۵ ۷۵۶ ۷۵۷ ۷۵۸ ۷۵۹ ۷۶۰ ۷۶۱ ۷۶۲ ۷۶۳ ۷۶۴ ۷۶۵ ۷۶۶ ۷۶۷ ۷۶۸ ۷۶۹ ۷۷۰ ۷۷۱ ۷۷۲ ۷۷۳ ۷۷۴ ۷۷۵ ۷۷۶ ۷۷۷ ۷۷۸ ۷۷۹ ۷۸۰ ۷۸۱ ۷۸۲ ۷۸۳ ۷۸۴ ۷۸۵ ۷۸۶ ۷۸۷ ۷۸۸ ۷۸۹ ۷۹۰ ۷۹۱ ۷۹۲ ۷۹۳ ۷۹۴ ۷۹۵ ۷۹۶ ۷۹۷ ۷۹۸ ۷۹۹ ۸۰۰ ۸۰۱ ۸۰۲ ۸۰۳ ۸۰۴ ۸۰۵ ۸۰۶ ۸۰۷ ۸۰۸ ۸۰۹ ۸۱۰ ۸۱۱ ۸۱۲ ۸۱۳ ۸۱۴ ۸۱۵ ۸۱۶ ۸۱۷ ۸۱۸ ۸۱۹ ۸۲۰ ۸۲۱ ۸۲۲ ۸۲۳ ۸۲۴ ۸۲۵ ۸۲۶ ۸۲۷ ۸۲۸ ۸۲۹ ۸۳۰ ۸۳۱ ۸۳۲ ۸۳۳ ۸۳۴ ۸۳۵ ۸۳۶ ۸۳۷ ۸۳۸ ۸۳۹ ۸۴۰ ۸۴۱ ۸۴۲ ۸۴۳ ۸۴۴ ۸۴۵ ۸۴۶ ۸۴۷ ۸۴۸ ۸۴۹ ۸۵۰ ۸۵۱ ۸۵۲ ۸۵۳ ۸۵۴ ۸۵۵ ۸۵۶ ۸۵۷ ۸۵۸ ۸۵۹ ۸۶۰ ۸۶۱ ۸۶۲ ۸۶۳ ۸۶۴ ۸۶۵ ۸۶۶ ۸۶۷ ۸۶۸ ۸۶۹ ۸۷۰ ۸۷۱ ۸۷۲ ۸۷۳ ۸۷۴ ۸۷۵ ۸۷۶ ۸۷۷ ۸۷۸ ۸۷۹ ۸۸۰ ۸۸۱ ۸۸۲ ۸۸۳ ۸۸۴ ۸۸۵ ۸۸۶ ۸۸۷ ۸۸۸ ۸۸۹ ۸۹۰ ۸۹۱ ۸۹۲ ۸۹۳ ۸۹۴ ۸۹۵ ۸۹۶ ۸۹۷ ۸۹۸ ۸۹۹ ۹۰۰ ۹۰۱ ۹۰۲ ۹۰۳ ۹۰۴ ۹۰۵ ۹۰۶ ۹۰۷ ۹۰۸ ۹۰۹ ۹۱۰ ۹۱۱ ۹۱۲ ۹۱۳ ۹۱۴ ۹۱۵ ۹۱۶ ۹۱۷ ۹۱۸ ۹۱۹ ۹۲۰ ۹۲۱ ۹۲۲ ۹۲۳ ۹۲۴ ۹۲۵ ۹۲۶ ۹۲۷ ۹۲۸ ۹۲۹ ۹۳۰ ۹۳۱ ۹۳۲ ۹۳۳ ۹۳۴ ۹۳۵ ۹۳۶ ۹۳۷ ۹۳۸ ۹۳۹ ۹۴۰ ۹۴۱ ۹۴۲ ۹۴۳ ۹۴۴ ۹۴۵ ۹۴۶ ۹۴۷ ۹۴۸ ۹۴۹ ۹۵۰ ۹۵۱ ۹۵۲ ۹۵۳ ۹۵۴ ۹۵۵ ۹۵۶ ۹۵۷ ۹۵۸ ۹۵۹ ۹۶۰ ۹۶۱ ۹۶۲ ۹۶۳ ۹۶۴ ۹۶۵ ۹۶۶ ۹۶۷ ۹۶۸ ۹۶۹ ۹۷۰ ۹۷۱ ۹۷۲ ۹۷۳ ۹۷۴ ۹۷۵ ۹۷۶ ۹۷۷ ۹۷۸ ۹۷۹ ۹۸۰ ۹۸۱ ۹۸۲ ۹۸۳ ۹۸۴ ۹۸۵ ۹۸۶ ۹۸۷ ۹۸۸ ۹۸۹ ۹۹۰ ۹۹۱ ۹۹۲ ۹۹۳ ۹۹۴ ۹۹۵ ۹۹۶ ۹۹۷ ۹۹۸ ۹۹۹ ۱۰۰۰ ۱۰۰۱ ۱۰۰۲ ۱۰۰۳ ۱۰۰۴ ۱۰۰۵ ۱۰۰۶ ۱۰۰۷ ۱۰۰۸ ۱۰۰۹ ۱۰۱۰ ۱۰۱۱ ۱۰۱۲ ۱۰۱۳ ۱۰۱۴ ۱۰۱۵ ۱۰۱۶ ۱۰۱۷ ۱۰۱۸ ۱۰۱۹ ۱۰۲۰ ۱۰۲۱ ۱۰۲۲ ۱۰۲۳ ۱۰۲۴ ۱۰۲۵ ۱۰۲۶ ۱۰۲۷ ۱۰۲۸ ۱۰۲۹ ۱۰۳۰ ۱۰۳۱ ۱۰۳۲ ۱۰۳۳ ۱۰۳۴ ۱۰۳۵ ۱۰۳۶ ۱۰۳۷ ۱۰۳۸ ۱۰۳۹ ۱۰۴۰ ۱۰۴۱ ۱۰۴۲ ۱۰۴۳ ۱۰۴۴ ۱۰۴۵ ۱۰۴۶ ۱۰۴۷ ۱۰۴۸ ۱۰۴۹ ۱۰۵۰ ۱۰۵۱ ۱۰۵۲ ۱۰۵۳ ۱۰۵۴ ۱۰۵۵ ۱۰۵۶ ۱۰۵۷ ۱۰۵۸ ۱۰۵۹ ۱۰۶۰ ۱۰۶۱ ۱۰۶۲ ۱۰۶۳ ۱۰۶۴ ۱۰۶۵ ۱۰۶۶ ۱۰۶۷ ۱۰۶۸ ۱۰۶۹ ۱۰۷۰ ۱۰۷۱ ۱۰۷۲ ۱۰۷۳ ۱۰۷۴ ۱۰۷۵ ۱۰۷۶ ۱۰۷۷ ۱۰۷۸ ۱۰۷۹ ۱۰۸۰ ۱۰۸۱ ۱۰۸۲ ۱۰۸۳ ۱۰۸۴ ۱۰۸۵ ۱۰۸۶ ۱۰۸۷ ۱۰۸۸ ۱۰۸۹ ۱۰۹۰ ۱۰۹۱ ۱۰۹۲ ۱۰۹۳ ۱۰۹۴ ۱۰۹۵ ۱۰۹۶ ۱۰۹۷ ۱۰۹۸ ۱۰۹۹ ۱۱۰۰ ۱۱۰۱ ۱۱۰۲ ۱۱۰۳ ۱۱۰۴ ۱۱۰۵ ۱۱۰۶ ۱۱۰۷ ۱۱۰۸ ۱۱۰۹ ۱۱۱۰ ۱۱۱۱ ۱۱۱۲ ۱۱۱۳ ۱۱۱۴ ۱۱۱۵ ۱۱۱۶ ۱۱۱۷ ۱۱۱۸ ۱۱۱۹ ۱۱۲۰ ۱۱۲۱ ۱۱۲۲ ۱۱۲۳ ۱۱۲۴ ۱۱۲۵ ۱۱۲۶ ۱۱۲۷ ۱۱۲۸ ۱۱۲۹ ۱۱۳۰ ۱۱۳۱ ۱۱۳۲ ۱۱۳۳ ۱۱۳۴ ۱۱۳۵ ۱۱۳۶ ۱۱۳۷ ۱۱۳۸ ۱۱۳۹ ۱۱۴۰ ۱۱۴۱ ۱۱۴۲ ۱۱۴۳ ۱۱۴۴ ۱۱۴۵ ۱۱۴۶ ۱۱۴۷ ۱۱۴۸ ۱۱۴۹ ۱۱۵۰ ۱۱۵۱ ۱۱۵۲ ۱۱۵۳ ۱۱۵۴ ۱۱۵۵ ۱۱۵۶ ۱۱۵۷ ۱۱۵۸ ۱۱۵۹ ۱۱۶۰ ۱۱۶۱ ۱۱۶۲ ۱۱۶۳ ۱۱۶۴ ۱۱۶۵ ۱۱۶۶ ۱۱۶۷ ۱۱۶۸ ۱۱۶۹ ۱۱۷۰ ۱۱۷۱ ۱۱۷۲ ۱۱۷۳ ۱۱۷۴ ۱۱۷۵ ۱۱۷۶ ۱۱۷۷ ۱۱۷۸ ۱۱۷۹ ۱۱۸۰ ۱۱۸۱ ۱۱۸۲ ۱۱۸۳ ۱۱۸۴ ۱۱۸۵ ۱۱۸۶ ۱۱۸۷ ۱۱۸۸ ۱۱۸۹ ۱۱۹۰ ۱۱۹۱ ۱۱۹۲ ۱۱۹۳ ۱۱۹۴ ۱۱۹۵ ۱۱۹۶ ۱۱۹۷ ۱۱۹۸ ۱۱۹۹ ۱۲۰۰ ۱۲۰۱ ۱۲۰۲ ۱۲۰۳ ۱۲۰۴ ۱۲۰۵ ۱۲۰۶ ۱۲۰۷ ۱۲۰۸ ۱۲۰۹ ۱۲۱۰ ۱۲۱۱ ۱۲۱۲ ۱۲۱۳ ۱۲۱۴ ۱۲۱۵ ۱۲۱۶ ۱۲۱۷ ۱۲۱۸ ۱۲۱۹ ۱۲۲۰ ۱۲۲۱ ۱۲۲۲ ۱۲۲۳ ۱۲۲۴ ۱۲۲۵ ۱۲۲۶ ۱۲۲۷ ۱۲۲۸ ۱۲۲۹ ۱۲۳۰ ۱۲۳۱ ۱۲۳۲ ۱۲۳۳ ۱۲۳۴ ۱۲۳۵ ۱۲۳۶ ۱۲۳۷ ۱۲۳۸ ۱۲۳۹ ۱۲۴۰ ۱۲۴۱ ۱۲۴۲ ۱۲۴۳ ۱۲۴۴ ۱۲۴۵ ۱۲۴۶ ۱۲۴۷ ۱۲۴۸ ۱۲۴۹ ۱۲۵۰ ۱۲۵۱ ۱۲۵۲ ۱۲۵۳ ۱۲۵۴ ۱۲۵۵ ۱۲۵۶ ۱۲۵۷ ۱۲۵۸ ۱۲۵۹ ۱۲۶۰ ۱۲۶۱ ۱۲۶۲ ۱۲۶۳ ۱۲۶۴ ۱۲۶۵ ۱۲۶۶ ۱۲۶۷ ۱۲۶۸ ۱۲۶۹ ۱۲۷۰ ۱۲۷۱ ۱۲۷۲ ۱۲۷۳ ۱۲۷۴ ۱۲۷۵ ۱۲۷۶ ۱۲۷۷ ۱۲۷۸ ۱۲۷۹ ۱۲۸۰ ۱۲۸۱ ۱۲۸۲ ۱۲۸۳ ۱۲۸۴ ۱۲۸۵ ۱۲۸۶ ۱۲۸۷ ۱۲۸۸ ۱۲۸۹ ۱۲۹۰ ۱۲۹۱ ۱۲۹۲ ۱۲۹۳ ۱۲۹۴ ۱۲۹۵ ۱۲۹۶ ۱۲۹۷ ۱۲۹۸ ۱۲۹۹ ۱۳۰۰ ۱۳۰۱ ۱۳۰۲ ۱۳۰۳ ۱۳۰۴ ۱۳۰۵ ۱۳۰۶ ۱۳۰۷ ۱۳۰۸ ۱۳۰۹ ۱۳۱۰ ۱۳۱۱ ۱۳۱۲ ۱۳۱۳ ۱۳۱۴ ۱۳۱۵ ۱۳۱۶ ۱۳۱۷ ۱۳۱۸ ۱۳۱۹ ۱۳۲۰ ۱۳۲۱ ۱۳۲۲ ۱۳۲۳ ۱۳۲۴ ۱۳۲۵ ۱۳۲۶ ۱۳۲۷ ۱۳۲۸ ۱۳۲۹ ۱۳۳۰ ۱۳۳۱ ۱۳۳۲ ۱۳۳۳ ۱۳۳۴ ۱۳۳۵ ۱۳۳۶ ۱۳۳۷ ۱۳۳۸ ۱۳۳۹ ۱۳۴۰ ۱۳۴۱ ۱۳۴۲ ۱۳۴۳ ۱۳۴۴ ۱۳۴۵ ۱۳۴۶ ۱۳۴۷ ۱۳۴۸ ۱۳۴۹ ۱۳۵۰ ۱۳۵۱ ۱۳۵۲ ۱۳۵۳ ۱۳۵۴ ۱۳۵۵ ۱۳۵۶ ۱۳۵۷ ۱۳۵۸ ۱۳۵۹ ۱۳۶۰ ۱۳۶۱ ۱۳۶۲ ۱۳۶۳ ۱۳۶۴ ۱۳۶۵ ۱۳۶۶ ۱۳۶۷ ۱۳۶۸ ۱۳۶۹ ۱۳۷۰ ۱۳۷۱ ۱۳۷۲ ۱۳۷۳ ۱۳۷۴ ۱۳۷۵ ۱۳۷۶ ۱۳۷۷ ۱۳۷۸ ۱۳۷۹ ۱۳۸۰ ۱۳۸۱ ۱۳۸۲ ۱۳۸۳ ۱۳۸۴ ۱۳۸۵ ۱۳۸۶ ۱۳۸۷ ۱۳۸۸ ۱۳۸۹ ۱۳۹۰ ۱۳۹۱ ۱۳۹۲ ۱۳۹۳ ۱۳۹۴ ۱۳۹۵ ۱۳۹۶ ۱۳۹۷ ۱۳۹۸ ۱۳۹۹ ۱۴۰۰ ۱۴۰۱ ۱۴۰۲ ۱۴۰۳ ۱۴۰۴ ۱۴۰۵ ۱۴۰۶ ۱۴۰۷ ۱۴۰۸ ۱۴۰۹ ۱۴۱۰ ۱۴۱۱ ۱۴۱۲ ۱۴۱۳ ۱۴۱۴ ۱۴۱۵ ۱۴۱۶ ۱۴۱۷ ۱۴۱۸ ۱۴۱۹ ۱۴۲۰ ۱۴۲۱ ۱۴۲۲ ۱۴۲۳ ۱۴۲۴ ۱۴۲۵ ۱۴۲۶ ۱۴۲۷ ۱۴۲۸ ۱۴۲۹ ۱۴۳۰ ۱۴۳۱ ۱۴۳۲ ۱۴۳۳ ۱۴۳۴ ۱۴۳۵ ۱۴۳۶ ۱۴۳۷ ۱۴۳۸ ۱۴۳۹ ۱۴۴۰ ۱۴۴۱ ۱۴۴۲ ۱۴۴۳ ۱۴۴۴ ۱۴۴۵ ۱۴۴۶ ۱۴۴۷ ۱۴۴۸ ۱۴۴۹ ۱۴۵۰ ۱۴۵۱ ۱۴۵۲ ۱۴۵۳ ۱۴۵۴ ۱۴۵۵ ۱۴۵۶ ۱۴۵۷ ۱۴۵۸ ۱۴۵۹ ۱۴۶۰ ۱۴۶۱ ۱۴۶۲ ۱۴۶۳ ۱۴۶۴ ۱۴۶۵ ۱۴۶۶ ۱۴۶۷ ۱۴۶۸ ۱۴۶۹ ۱۴۷۰ ۱۴۷۱ ۱۴۷۲ ۱۴۷۳ ۱۴۷۴ ۱۴۷۵ ۱۴۷۶ ۱۴۷۷ ۱۴۷۸ ۱۴۷۹ ۱۴۸۰ ۱۴۸۱ ۱۴۸۲ ۱۴۸۳ ۱۴۸۴ ۱۴۸۵ ۱۴۸۶ ۱۴۸۷ ۱۴۸۸ ۱۴۸۹ ۱۴۹۰ ۱۴۹۱ ۱۴۹۲ ۱۴۹۳ ۱۴۹۴ ۱۴۹۵ ۱۴۹۶ ۱۴۹۷ ۱۴۹۸ ۱۴۹۹ ۱۵۰۰ ۱۵۰۱ ۱۵۰۲ ۱۵۰۳ ۱۵۰۴ ۱۵۰۵ ۱۵۰۶ ۱۵۰۷ ۱۵۰۸ ۱۵۰۹ ۱۵۱۰ ۱۵۱۱ ۱۵۱۲ ۱۵۱۳ ۱۵۱۴ ۱۵۱۵ ۱۵۱۶ ۱۵۱۷ ۱۵۱۸ ۱۵۱۹ ۱۵۲۰ ۱۵۲۱ ۱۵۲۲ ۱۵۲۳ ۱۵۲۴ ۱۵۲۵ ۱۵۲۶ ۱۵۲۷ ۱۵۲۸ ۱۵۲۹ ۱۵۳۰ ۱۵۳۱ ۱۵۳۲ ۱۵۳۳ ۱۵۳۴ ۱۵۳۵ ۱۵۳۶ ۱۵۳۷ ۱۵۳۸ ۱۵۳۹ ۱۵۴۰ ۱۵۴۱ ۱۵۴۲ ۱۵۴۳ ۱۵۴۴ ۱۵۴۵ ۱۵۴۶ ۱۵۴۷ ۱۵۴۸ ۱۵۴۹ ۱۵۵۰ ۱۵۵۱ ۱۵۵۲ ۱۵۵۳ ۱۵۵۴ ۱۵۵۵ ۱۵۵۶ ۱۵۵۷ ۱۵۵۸ ۱۵۵۹ ۱۵۶۰ ۱۵۶۱ ۱۵۶۲ ۱۵۶۳ ۱۵۶۴ ۱۵۶۵ ۱۵۶۶ ۱۵۶۷ ۱۵۶۸ ۱۵۶۹ ۱۵۷۰ ۱۵۷۱ ۱۵۷۲ ۱۵۷۳ ۱۵۷۴ ۱۵۷۵ ۱۵۷۶ ۱۵۷۷ ۱۵۷۸ ۱۵۷۹ ۱۵۸۰ ۱۵۸۱ ۱۵۸۲ ۱۵۸۳ ۱۵۸۴ ۱۵۸۵ ۱۵۸۶ ۱۵۸۷ ۱۵۸۸ ۱۵۸۹ ۱۵۹۰ ۱۵۹۱ ۱۵۹۲ ۱۵۹۳ ۱۵۹۴ ۱۵۹۵ ۱۵۹۶ ۱۵۹۷ ۱۵۹۸ ۱۵۹۹ ۱۶۰۰ ۱۶۰۱ ۱۶۰۲ ۱۶۰۳ ۱۶۰۴ ۱۶۰۵ ۱۶۰۶ ۱۶۰۷ ۱۶۰۸ ۱۶۰۹ ۱۶۱۰ ۱۶۱۱ ۱۶۱۲ ۱۶۱۳ ۱۶۱۴ ۱۶۱۵ ۱۶۱۶ ۱۶۱۷ ۱۶۱۸ ۱۶۱۹ ۱۶۲۰ ۱۶۲۱ ۱۶۲۲ ۱۶۲۳ ۱۶۲۴ ۱۶۲۵ ۱۶۲۶ ۱۶۲۷ ۱۶۲۸ ۱۶۲۹ ۱۶۳۰ ۱۶۳۱ ۱۶۳۲ ۱۶۳۳ ۱۶۳۴ ۱۶۳۵ ۱۶۳۶ ۱۶۳۷ ۱۶۳۸ ۱۶۳۹ ۱۶۴۰ ۱۶۴۱ ۱۶۴۲ ۱۶۴۳ ۱۶۴۴ ۱۶۴۵ ۱۶۴۶ ۱۶۴۷ ۱۶۴۸ ۱۶۴۹ ۱۶۵۰ ۱۶۵۱ ۱۶۵۲ ۱۶۵۳ ۱۶۵۴ ۱۶۵۵ ۱۶۵۶ ۱۶۵۷ ۱۶۵۸ ۱۶۵۹ ۱۶۶۰ ۱۶۶۱ ۱۶۶۲ ۱۶۶۳ ۱۶۶۴ ۱۶۶۵ ۱۶۶۶ ۱۶۶۷ ۱۶۶۸ ۱۶۶۹ ۱۶۷۰ ۱۶۷۱ ۱۶۷۲ ۱۶۷۳ ۱۶۷۴ ۱۶۷۵ ۱۶۷۶ ۱۶۷۷ ۱۶۷۸ ۱۶۷۹ ۱۶۸۰ ۱۶۸۱ ۱۶۸۲ ۱۶۸۳ ۱۶۸۴ ۱۶۸۵ ۱۶۸۶ ۱۶۸۷ ۱۶۸۸ ۱۶۸۹ ۱۶۹۰ ۱۶۹۱ ۱۶۹۲ ۱۶۹۳ ۱۶۹۴ ۱۶۹۵ ۱۶۹۶ ۱۶۹۷ ۱۶۹۸ ۱۶۹۹ ۱۷۰۰ ۱۷۰۱ ۱۷۰۲ ۱۷۰۳ ۱۷۰۴ ۱۷۰۵ ۱۷۰۶ ۱۷۰۷ ۱۷۰۸ ۱۷۰۹ ۱۷۱۰ ۱۷۱۱ ۱۷۱۲ ۱۷۱۳ ۱۷۱۴ ۱۷۱۵ ۱۷۱۶ ۱۷۱۷ ۱۷۱۸ ۱۷۱۹ ۱۷۲۰ ۱۷۲۱ ۱۷۲۲ ۱۷۲۳ ۱۷۲۴ ۱۷۲۵ ۱۷۲۶ ۱۷۲۷ ۱۷۲۸ ۱۷۲۹ ۱۷۳۰ ۱۷۳۱ ۱۷۳۲ ۱۷۳۳ ۱۷۳۴ ۱۷۳۵ ۱۷۳۶ ۱۷۳۷ ۱۷۳۸ ۱۷۳۹ ۱۷۴۰ ۱۷۴۱ ۱۷۴۲ ۱۷۴۳ ۱۷۴۴ ۱۷۴۵ ۱۷۴۶ ۱۷۴۷ ۱۷۴۸ ۱۷۴۹ ۱۷۵۰ ۱۷۵۱ ۱۷۵۲ ۱۷۵۳ ۱۷۵۴ ۱۷۵۵ ۱۷۵۶ ۱۷۵۷ ۱۷۵۸ ۱۷۵۹ ۱۷۶۰ ۱۷۶۱ ۱۷۶۲ ۱۷۶۳ ۱۷۶۴ ۱۷۶۵ ۱۷۶۶ ۱۷۶۷ ۱۷۶۸ ۱۷۶۹ ۱۷۷۰ ۱۷۷۱ ۱۷۷۲ ۱۷۷۳ ۱۷۷۴ ۱۷۷۵ ۱۷۷۶ ۱۷۷۷ ۱۷۷۸ ۱۷۷۹ ۱۷۸۰ ۱۷۸۱ ۱۷۸۲ ۱۷۸۳ ۱۷۸۴ ۱۷۸۵ ۱۷۸۶ ۱۷۸۷ ۱۷۸۸ ۱۷۸۹ ۱۷۹۰ ۱۷۹۱ ۱۷۹۲ ۱۷۹۳ ۱۷۹۴ ۱۷۹۵ ۱۷۹۶ ۱۷۹۷ ۱۷۹۸ ۱۷۹۹ ۱۸۰۰ ۱۸۰۱ ۱۸۰۲ ۱۸۰۳ ۱۸۰۴ ۱۸۰۵ ۱۸۰۶ ۱۸۰۷ ۱۸۰۸ ۱۸۰۹ ۱۸۱۰ ۱۸۱۱

جس کا نام "مباہلہ" ہے یعنی دونوں فریق اللہ سے دعا کریں کہ جھوٹے پر عذاب نازل ہو۔ اس موقع پر رسول تشریف لے گئے تو اس طرح کہ ہاتھ میں علی بن ابی طالب کا ہاتھ تھا۔ حسن و حسین آگے آگے تھے اور فاطمہ زہرا پیچھے آرہی تھیں۔ نجران والے یہ نورانی منظر دیکھ کر مرعوب ہوئے اور خراج دینے کے لیے آمادہ ہو گئے۔ ظاہر ہے کہ پیغمبر خدا اس ہم کو تنہا سر کر سکتے تھے۔ پھر قرآن کی تصریح کے مطابق رسول اللہ اپنے اہلبیت کو ساتھ لے جانے پر کیوں مامور ہوئے؟ اس کا مقصد ایک طرف حق کے کامل نمایندوں کا خلق سے تعارف تھا تو دوسری طرف تعلیم و تربیت کا انداز بھی تھا۔ گویا نبی سے خاندان رسول کی ان ہستیوں پر ذمہ داری کا بار ڈالا جا رہا تھا کہ ضرورت کے وقت حفاظت اسلام کی ان ہی سے امید ہے۔ رسول ان میں سے ایک ایک کا ہاتھ پکڑ کر کہہ رہے تھے کہ دیکھو آج تو میں خود موجود ہوں۔ میں تم کو اپنے ساتھ لیے جا رہا ہوں لیکن اگر کسی وقت میں میں موجود نہ ہوں تو تم اسی طرح حفاظت اسلام کے لیے نکل کھڑے ہو نا جس طرح میں نکلا ہوں۔ آج کے اس عمل سے یہ بھی واضح ہو گیا کہ اسلام کی نصرت اور خدمت کے موقع پر مرد و عورت، جوان و بچہ کوئی مستثنیٰ نہیں ہو سکتا اور ضرورت پر ہر ایک کو اس مقصد میں صرف ہونا لازم ہے۔ سب سے کم سن اس جماعت میں حسین تھے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جیسے ان کا اس موقع پر ساتھ لانا قدرت کی طرف سے اس مستقبل کی تمہید ہے کہ انہی کو عملی طور پر دوبارہ اس مثال کے پیش کرنے کا موقع ملے گا جسے آج پیش کیا گیا۔ حضرت محمد مصطفیٰ سے بڑھ کر کوئی شخص جو ہر شے نہیں ہو سکتا تھا۔ آپ جانتے تھے کہ آپ کے تعلیمات کی حفاظت کن کے ذریعہ سے ہوگی۔ اس لیے مختلف صورتوں سے اپنی امت کو ہدایت دیا کہ میرے اہلبیت کی پیروی کرتے رہنا۔ کبھی فرمایا کہ میں تم میں دو گراں قدر چیزیں چھوڑتا ہوں۔ جب تک تم ان سے تمسک رکھو گے گمراہی سے محفوظ رہو گے۔ ان میں سے ایک قرآن ہے اور دوسرے میرے اہل بیت اور کبھی فرمایا کہ میرے اہلبیت کی مثال کشتی نوح کی سی ہے، جو اس کشتی پر ہمارا ہونا اس نے نجات پائی اور جو روگرداں ہوا وہ دریائے ہلاکت میں غرق ہوا۔

۱۵۰ ارشاد مکتہ ۱۵۰ سورۃ النجم آیت ۶۱ ۱۵۰ سند احمد حنبل ۱۵۰ معارف ابن قتیبہ

کہانیاں۔ ایک طرف نفرت کے مخصوص عطیے، دوسری جانب یہ نورانی اور روحانی ماحول اور اس پر تربیت پیغمبر الیہ بند معتمد کی جن کا مقصد رسالت ہی قرآن کے اعلان کے مطابق تزکیہ نفوس اور تعلیم کتاب و حکمت تھا۔ اور آپ نے خود بھی اعلان کیا تھا کہ مکالمہ اخلاق کی تکمیل میرا اصلی منصب العین ہے۔ پھر کیونکر ممکن تھا کہ رسول اپنے اہل بیت کی تربیت میں اس فرض کو نظر انداز کر دیتے جو بحیثیت معتمد اخلاق کے بحیثیت بزرگ خاندان کے اور بحیثیت ایک پیغمبر کے آپ پر عائد ہوتا تھا چنانچہ حضرت نے اس کسبی ہی کے عالم میں ان بچوں کو اپنے اخلاق و اوصاف کا نمونہ بنا دیا اور ان آئینوں میں جو قدرت کی طرف سے کمال کا جو ہر لے کر آئے تھے انہی سیرت کا پورا عکس آنا دیا۔

انہی ذات و صفات کی مخصوص بلندیوں کا یہ نتیجہ تھا کہ رسول ان اپنے نواموس کے ساتھ غیر معمولی محبت رکھتے تھے جس کے مظاہرات تاریخ اور حدیث کی کتابوں میں یکساں طور پر درج ہیں۔ اس کے علاوہ آپ دوسروں کو بھی ان سے محبت کی تاکید فرماتے تھے۔ آپ کا قول تھا کہ جس نے حسن و حسین سے محبت رکھی، اس نے مجھ سے محبت رکھی اور جس نے ان کو دشمن رکھا اس نے مجھے دشمن رکھا۔ آپ اللہ کو گواہ کرتے تھے کہ میں ان سے انتہائی محبت کرتا ہوں۔ مگر ان تمام باتوں کے ساتھ ساتھ حسین اپنے نانا کی بلند سیرت، فرائض کے بارے میں اہتمام اور اسلام کے متعلق آپ کے انہماک کو دیکھتے ہوئے یہ مشاہدہ کرتے تھے کہ رسول اللہ ہم کو بہت چاہتے ہیں مگر ہم سے زیادہ آپ اپنے دین یعنی اسلام اور اس کے آئین و شریعت کو چاہتے ہیں اس لیے اگر اس دین اور شریعت پر کوئی وقت پڑے تو پیغمبر تیار ہوں گے کہ ہم کو اس پر نثار کر دیں۔

۱۵۰ سلمہ میں نجران (مین) کے عیسا بنوں کے ساتھ ایک طرح کے روحانی مقابلہ کا موقع آیا

۱۵۰ سلمہ قرآن کریم سورۃ بقرہ آیت ۱۲۹ و ۱۵۱ - آل عمران آیت ۱۶۵ - جمعہ آیت ۲

۱۵۰ سلمہ سنن ابن ماجہ ج ۳ ص ۳۳ - ۳۴ صحیح مسلم ج ۲ ص ۲۵۲

۱۱۰ - ۱۲۰

یہ بھی کھٹی ہوئی بات ہے کہ پیغمبرؐ کی حیات میں ان کی غیر معمولی محبتوں کو دیکھ کر نیران کے ان متواتر اعلانات کی دہر سے کہ جو مجھ سے محبت رکھتا ہے اسے حسین سے محبت کرنا چاہیئے، عام مسلمان جو بھی رسولؐ کے ساتھ حقیقت اور محبت کا دم بھرتے تھے اور ان کے پسینے پر خون بہانے کا دعویٰ رکھتے تھے پیغمبرؐ کے سامنے ان کے ان فرزندوں کے ساتھ انتہائی لطیف ترین جذبات محبت و نیاز مندی کا اظہار کرتے تھے اور اگر ذرا سا بھی اس میں کمی کا شائبہ پیدا ہوتا تھا تو پیغمبرؐ کی تیوریوں پر بل دکھائی دینے لگتے تھے۔ ایک کھٹا ہوا ثبوت اس کا اس واقعہ سے ملتا ہے جب رسولؐ صحنِ محبتیؐ کو کاندھے پر سوار کیے ہوئے تھے اور ایک صحابی نے کہہ دیا کہ "اے صاحبزادے کتنا اچھا مرکب ہے

اس کے ساتھ خاص امام حسینؑ کے بارے میں جو حدیثیں ہیں ان میں سے ایک یہ ہے کہ حسینؑ مجھ سے ہے اور میں حسینؑ سے ہوں۔ یعنی میرا کام اور میرا نام دنیا میں حسینؑ کی بدولت قائم رہے گا۔ اس کے علاوہ بکثرت حدیثیں ہیں جو فضائل و مناقب کی کتابوں میں درج ہیں انفسوس کہ حسینؑ کے لیے اس لطف و محبت، بے پایاں سکون اور اطمینان کی عطیہ الٰہی نہیں ہو سکی۔ ابھی آپ کا سن سات برس کا بھی پورا نہ ہوا تھا کہ ربیع الاول ۱۱ھ میں حضرت محمد مصطفیٰؐ کی وفات ہو گئی اور حسینؑ رسول اللہؐ کے سایہ عاطفت سے محروم ہو گئے۔

تھارا۔ رسولؐ نے فوراً ٹوک دیا اور فرمایا: ”یہ باتیں ایسی نہ تھیں جن کے بعد مزاج نبوت میں کچھ بھی درخور رکھنے والے مسلمان یا آپ کے چشم و ابرو پر چلنے والے نیا نیا مردانہ صاحبزادوں کی خاطر داری اور ان کے ساتھ اظہارِ محبت میں ذرا بھی فروگزاشت کرتے۔ اس طرح یہ کہنا ہرگز مبالغہ نہیں ہے کہ اس دور میں حسینؑ ایک پیراغ تھے جن کے گرد پروانے طواف کرتے تھے یا ایک آفتاب جس کے گرد ستارے چکر لگاتے تھے۔ عقیدت کی ایک دنیا ان کے قدموں پر نثار ہوتی تھی اور محبت کا ایک آسمان تھا جو ان کے سر پر سایہ لگن تھا مگر دنیا ایک حال پر نہیں رہی۔ وہ انقلاب کا مجموعہ ہے۔ آج وہ مرکز جسکی مقناطیسی کشش دنیا کو جذب کیے ہوئے تھی قبر میں پہنچ چکا تھا۔ وہ ایک کیا گیا کہ حسینؑ کی دنیا بالکل بدل گئی۔ وہ ماحول بھی بالکل تبدیل ہو گیا جو آپ کے سامنے رہا تھا۔ صبح ہوئی اور رسولؐ نے دروازہ پر آکر آواز دی: الصلوٰۃ، الصلوٰۃ۔ اے میرے بھائی! عجب عنکم الرجس اهل البيت ويطهرکم تطهیراً (یعنی) اٹھو نماز کا وقت آگیا اور پھر یہ قرآن کی آیت پڑھتے تھے (جو آیتِ تطہیر کے نام سے مشہور ہے یعنی) ”اللہ کو منظور یہی ہے کہ اے اہل بیت تم سے ہر طرح کی نجاست کو دور رکھے اور تم کو پاک رکھے جو پاک رکھنے کا حق ہے۔“ سب فوراً اٹھ بیٹھے باپ اور بھائی کی طرح حسینؑ نے بھی فوراً وضو کیا۔ مسجد میں پہنچے مسلمانوں کا اجتماع ہوا۔ پیغمبرؐ نے نماز پڑھا لی۔ پھر ظہر، عصر، مغرب اور عشاء ہر وقت یہی سماں۔ نمازوں کے بعد یا پہلے اور ضرورت کی صورت میں مختلف اوقات پر پیغمبرؐ کے خطبے۔ شریعتِ اسلام کی تعلیم حاصل کرنے والوں کا ہجوم۔ قبائل عرب اور سلاطین دنیا کے وفود اور سفراء کا دور۔ مختلف جماعتوں کی سرگرمیوں کا تذکرہ اور اس کے مدافعتی انتظامات، دیوانی اور فوجداری کے مقدمات کا پیش ہونا، گواہوں کے بیانات، بحث اور جرح اور مقدمات کا فیصلہ۔ مجرموں کی سزاؤں۔ زکوٰۃ و خمس اور اموالِ غنیمت کا آنا اور مقربہ اصول و قواعد کے مطابق تقسیم۔ غرض یہ کہ دین اور دنیا کے تمام مسائل اس ایک نقطہ پر مجتمع نظر آتے تھے۔ حسینؑ اپنے نانا کے پاس تقریباً ہر وقت موجود رہتے تھے اور انکھ

کھول کر اسی عالم سے روشناس ہوئے تھے۔ اب پیغمبرؐ کی وفات کے بعد یہ تمام سماں آنکھوں سے اوجھل ہو گیا۔ انقلاب اور عظیم الشان انقلاب۔ انہوں نے کہ رسولؐ کی خلافت کا مسئلہ اتنا اختلافی بن گیا کہ آج تک اسکی بنیاد پر شیعہ اور سنی کا تفرق قائم ہے۔ اس کتاب میں جو واقعات کر بلا کو غیر نزاعی طور پر دنیا کے سلسلے میں پیش کرنے کے لیے لکھی جا رہی ہے اس پر بحث کرنا منظور نہیں ہے۔ نہ ان ناگوار واقعات کا کوئی مستقل تذکرہ مقصود ہے۔ بہر حال متفق علیہ تاریخی حقیقت ہے کہ رسولؐ کے بعد کچھ افراد امت نے متفق ہو کر سیاسی اقتدار خاندانِ رسولؐ سے ہٹا دیا۔ اس انقلاب کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ سرکارِ رسالت کے بعد ڈیڑھ صی کی چل چل اور روفی سناٹے سے تبدیل ہو گئی اور وہ ماحول جس میں حسینؑ زندگی بسر کر رہے تھے ایک دم بالکل بدلا ہوا نظر آیا۔

حسینؑ ماں کے پاس جاتے تو یہ دیکھتے کہ سوا اوقات نماز کے ہر وقت گریہ و زاری سے کام ہے کچھ دن تک تو گھر ہی پر رہ دیا کرتی تھیں پھر اہل مدینہ کی اس شکایت پر کہ آپ کے نالہ و شیون نے ہم پر غمِ خواب و نور حرام کر دیا ہے آپ جنتہ البقیع میں چلی جاتی تھیں اور اس قبرستان میں گریہ کرتی رہتی تھیں۔ حسینؑ باپ کے پاس آتے تو یہ دیکھتے کہ انھوں نے اہل زمانہ کی بے رحمی کو دیکھتے ہوئے گھر سے نکلنا اور لوگوں سے ملنا جلنا ترک کر دیا ہے۔ آپ ہر وقت ایک گوشہ میں بیٹھے قرآن مجید کے متفرق اجزا کو اصلی ترتیب اور شانِ نزول کے مطابق کتابی شکل میں مرتب کرتے رہتے ہیں اور فرطے ہیں کہ میں نے عہد کیا ہے کہ عبادِ دوش پر نہ ڈالوں گا جب تک کہ قرآن جمع نہ کر لوں۔ کیا اس صورتِ حال کو دیکھ کر حسینؑ کا دل نہ ٹھٹھا ہوگا۔ وہ سوچتے ہوں گے کہ اے خدا یہ کیسا اندمیر ہے جو ایک دم ہماری آنکھوں کے سامنے چھا گیا۔ بہر حال اپنے باپ کے طرزِ عمل میں یہ نصب العین نمایاں پایا کہ چاہے حالات کتنے ہی ناساگوار ہوں مگر میں اسلام کی خدمت سے ہاتھ نہیں اٹھانا چاہیے۔ ہمارا اور قرآن کا ساتھ ہے اس لیے قرآن کی حفاظت ہمارا فرض ہے اور اس فرض کو کسی وقت نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔

ابن ابی طالبؑ اور بھی دل شکستہ ہو گئے اور حسنؑ و حسینؑ کے لیے ہر محبت کی دنیا بڑی حد تک ویران نظر کرنے لگی۔ اب ان کے لیے گوارہ شفقت و تربیت صرف ایک تھا اور وہ ان کے بزرگ مرتبہ باب کی ذات۔ سات برس کی عمر سے لیکر چھتیس سال کی عمر تک انیس سال براہِ حسینؑ اپنے دہی کمالات کے ماوراء حضرت علیؑ بن ابیطالبؑ ایسے حکیم الہی عالم ربانی معلم اخلاق انسانی اور مجموعہ فضائل انسانی کے علمی اور عملی فیوض سے بہرہ ور ہوتے رہے اور یہی وہ زمانہ ہے جس میں عام نظام اسباب کی دنیا میں انسانیت کی حقیقی تعمیر ہوتی ہے۔ اس عمر کے آغاز سے بلوغ کی مدت تک اوصاف و ملکات کی داغ بیلیں پڑتی ہیں۔ نوجوانی کے زمانہ میں اُن پر دیواریں اٹھتی ہیں اور جوانی کے اختتام تک یہ عمارت مکمل ہو کر اس پر نقش و نگار بن جاتے ہیں اور وہ ساز و سامان اور شیشہ آلات سے بھی آراستہ ہو جاتی ہے۔ حسینؑ کے لیے ان تمام منازل کی ظاہری تکمیل علیؑ بن ابیطالبؑ کی نگرانی میں ہو رہی تھی۔

حسینؑ نے دیکھا کہ ان کے والد بزرگوار علیؑ بن ابیطالبؑ باوجود دیکھ زمانہ کی بے توجہی، حق فراموشی اور سردہری سے بکریہ خاطر ضرور تھے لیکن جب کسی علمی مسئلہ میں کسی ہم کے متعلق مشورہ میں، کسی معتمد کے فیصلہ میں اُنکی ضرورت پڑ جاتی ہے اور ان سے امداد کی خواہش کی جاتی ہے تو وہ فوراً بلا غدر انداز کرنے کے لیے تیار ہو جاتے ہیں۔ یہ جذباتی انسانوں کے رویہ کے بالکل خلاف ہے۔ وہ اگر کسی منصب کے حصول سے جس کے حقدار ہوں محروم کر دیے جائیں تو وہ متعلقہ افراد سے خفا ہو کر الگ ہو جائیں گے اور اگر اس منصب سے تعلق رکھنے والے معاملات میں اُن سے مدد طلب کی جائے تو وہ اپنی دلی رنجش کی بنا پر تعاون سے انکار کر دیں گے۔ اس سے طبیعت کے ہر فرد کے سامنے یہ نمونہ پیش ہو رہا تھا کہ ہم چاہے مسلمانوں کے معاملات سے کتنے ہی غیر متعلق کر دیے جائیں مگر ہمیں کبھی اپنے کو غیر متعلق سمجھنا نہیں چاہیے۔ ہمیں ہر ایسے موقع کا منتظر رہنا چاہیے کہ جس وقت ہمارے ذریعہ سے اسلامی مفاد کو حقیقی فائدہ پہنچ سکتا ہو تو اس موقع پر فوراً ہمیں اپنے فرض کو انجام دینا چاہیے اور اسلام کی خدمت کو اپنا نصب العین سمجھنا چاہیے۔

حسینؑ نے یہ بھی دیکھا کہ لوگ میرے باپ کے پاس آتے ہیں اور وہ انھیں جوش دلانا چاہتے ہیں کہ آپ اسلامی حکومت کے حصول کے لیے کوشش کیجیے جو واقعی آپ کا حق ہے۔ اچھے اور ہم آپ کی امداد کے لیے تیار ہیں۔ ان میں سچے دوست بھی ہیں اور نمائشی بھی۔ ایک طرف رسولؐ کے چچا عباس بن عبدالمطلبؑ کہتے ہیں کہ اپنا ہاتھ بڑھاؤ، میں تمہاری بیعت کر لوں اس کا مسلمانوں پر بڑا اثر پڑے گا۔ از روہ کہیں گے کہ پیغمبرؐ کے چچا نے ان کے ابن عم کی بیعت کر لی، پھر کسی کو غدر نہ ہوگا اور دوسری طرف بنی امیہ کا سردار ابوسفیان بن حربؓ ہے اور وہ آکر کہتا ہے کہ کتنے غضب کی بات ہے کہ آپ کے ہوتے ہوئے عرب کے ایک رذیل ترین خاندان نے غلبہ حاصل کر لیا۔ خدا کی قسم اگر آپ چاہیں تو میں آپ کی امداد کے لیے مدینہ کو سوار اور پیادوں سے بھر دوں۔ مگر چونکہ آپ کی ذات جذبات سے بلند اور نفسانیت کے لوٹ سے پاک تھی اور آپ اسلام کا حقیقی درد اپنے سینہ میں رکھتے تھے اس لیے آپ اپنا حق سمجھتے ہوئے بھی ان لوگوں کے کہنے میں نہیں آئے اور آپ نے ابوسفیان کو اس طرح ڈانٹ کر جواب دیا کہ خدا کی قسم تم ہمیشہ اسلام اور اہل اسلام کے دشمن رہے ہو۔ یہ اس کا عملی اظہار تھا کہ چاہے ہمارے حقوق ہاتھ سے جائیں۔ ہمارے شخصی مفاد کو نقصان پہنچے مگر ہم کو ہمیشہ اجتماعی اور اسلامی مفاد پر نظر رکھنا چاہیے اور اس کے لیے ہر طرح کی قربانی کے لیے تیار رہنا چاہیے۔ یہ نتیجہ بھی اس واقعہ سے ظاہر تھا کہ ابوسفیان اور اس کے خاندان کے لوگوں کا اسلام صرف نمائشی حیثیت رکھتا ہے اور ان سے اسلام کے متعلق ہمیشہ نقصان رسانی کا اندیشہ موجود ہے۔ اسی کے ساتھ یہ بھی کہ اسلام کو اس کے کھلم بولے دشمنوں کے ہاتھوں اتنا نقصان نہیں پہنچ سکتا جتنا ان نمائشی دوستوں سے پہنچ سکتا ہے اس لیے اگر اسلام کا تحفظ کرنا ہے تو ہمیشہ اس جماعت کی نقل و حرکت پر نظر رکھنا چاہیے اور کوئی موقع نہ آنے دینا چاہیے کہ یہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو جائے۔

افسوس ہے کہ رسولؐ کی وفات سے چند ہی مہینوں کے بعد گونا گوں مصائب و تکالیف اٹھانے کے ساتھ حسینؑ سے ان کی بزرگ مرتبہ مال بھی جدا ہو گئیں۔ حضرت فاطمہ زہراؑ کی وفات سے علیؑ بن

شہر بانو یا شاہ زمان مشہور ہے حسین کے عقد میں آئیں اور اس طرح انھوں نے اسلام کی اس تعلیم کو زندہ رکھا جو ملکی تفریق کو مٹا دینے کی علمبردار ہے۔

تیسرے خلیفہ عثمان کے دور کا آخری حصہ بڑی بے اطمینانی اور کشمکش میں گزرا مسلمانوں کو ان سے شکایتیں پیدا ہوئیں اور آخر اقدامات کی حد تک پہنچیں مگر حضرت علی بن ابی طالب نے ان اقدامات کو تقویت پہنچانے کے بجائے پوری کوشش کے ساتھ ان کو روکنے کی سعی فرمائی۔ کئی مرتبہ بیچ میں پڑ کر صلح کر لی۔ مخالفت جماعت کی شکایات دور کرائیں اور اسے سمجھا بھجا کر منتشر کیا۔ مگر مروان جو اس دور میں کاتب^۱ کے عہدہ پر تھا اس کی شرارتوں نے ان کوششوں کو کامیاب نہ ہونے دیا اور آخر اس جماعت نے حاکم وقت کے مکان کا محاصرہ کر لیا۔ اس وقت بھی حضرت علی بن ابی طالب نے یہ سہرہ دی کی کہ جب آپ کو معلوم ہوا کہ محاصرہ کرنے والوں نے پانی بند کر دیا ہے تو آپ نے حسن اور حسینؑ اپنے دونوں فرزندوں کو کچھ مشکوں کے ساتھ روانہ کیا اور ان دونوں صاحبزادوں نے اپنے کو خطرہ میں ڈال کر پانی قصر حکومت کے اندر پہنچا دیا۔ بہر حال نظم حکومت کا پیمانہ لبریز تھا اور پانی سرسے ادبھا ہو چکا تھا۔ حملہ آور جماعت نے دارالحکومت کی منزلیں کو خلیفہ کے خون سے رنگیں اور ان کے رشتہ جیٹا کو قطع کر دیا۔ حیرت کا امر ہے کہ اتنا بڑا مسلم اکثریت کا مسلم الثبوت فرمانروا خود اپنے دارالسلطنت میں ایک مہینہ انیس دن محصور رہا اور آخر تلوار کے گھاٹ اتار دیا گیا اور اس دارالسلطنت کے لوگوں میں جو بغیر تیر کا دارالہجرت اور مسلمانوں کا سب سے بڑا مرکز تھا اور جہاں کے اہل حل و عقد خلیفہ گری کے کام کا اپنے کو واحد ذمہ دار سمجھتے تھے کوئی ہوش متاومت پیدا نہ ہوا۔ اس سے زیادہ تعجب کی یہ بات ہے کہ لاش تین دن تک بے گور و کفن رہی اور عالمہ مسلمین دفن کی طرف

لے طبری ج ۵ ص ۹۶۵ - ۹۶۶ - ۱۱۰ - ۱۱۱ د ۱۲۲

۱۔ کاتب کا درجہ اس دور میں "وزیر" کا سا ہوتا تھا۔ وہ حاکم کا راز دار و مشیر کار اس کی جملہ امانتدار اور اس کی طرف سے خط و کتابت کا ذمہ دار ہوتا تھا۔ ۲۔ ابویار و الکتاب ص ۱۱۱ - طبری ج ۵ ص ۱۱۲

۳۔ طبری ج ۵ ص ۱۱۳ - ۱۱۴

تیسرے خلیفہ کے انتخاب کے موقع پر ایسا وقت آیا کہ حضرت علی بن ابی طالب تحت حکومت کو حاصل کر لیتے جبکہ خلیفہ دوم نے اپنے انتقال کے وقت چھ آدمیوں کی کمیٹی بنا کر خلافت کو ان میں منقسم کر دیا اور ان میں سے ایک حضرت علی بن ابی طالب کو بھی قرار دیا تھا۔ تمام دوسرے ارکان حضرت علی کو خلافت کے منصب پر نامزد کرنے کے لیے تیار تھے بشرطیکہ آپ کتاب و سنت کے علاوہ شیخین (ابو بکر و عمر) کی سیرت پر عمل کا بھی عہد کریں۔ مگر حسینؑ نے دیکھا کہ ان کے حقیقت پر درجہ بلند ہمت اور منفعتی طبیعت باپ نے اس موقع کو اپنے ہاتھ سے دے دیا۔ اس بنا پر کہ وہ کتاب اور سنت پر عمل کے علاوہ کسی دوسری شرط کو ماننے کے لیے تیار نہیں ہوئے جس کے نتیجے میں وہ ظاہری خلافت کا ہما جو ان کے سر ہالوں پر چکر لگا رہا تھا ایک طویل عرصہ تک کے لیے ان سے علیحدہ ہو گیا۔

حسینؑ نے اس میں ایک بڑے اہم سبق کا عملی نمونہ دیکھا جس پر ان کے آئندہ اقدامات کی بنیاد قائم تھی اور وہ یہ کہ شریعت اور مسلمان حکمرانوں کی سیرت دو الگ الگ چیزیں ہیں۔ ایسا نہیں ہے کہ جو حکومت وقت کا آئین اور اس کا عمل ہو اس کو شریعت کی رو سے بھی صحیح ماننا پڑے بلکہ شریعت کے مستقل اصول ہیں جن میں مقتدا ہونا چاہیے اور حکومت کے عمل کو ان کا ماتحت ہونا چاہیے اور جب ایسا نہ ہو تو ایک مسلمان کا فرض ہے کہ وہ شریعت کو تسلیم کرے اور حکام کے عمل کو تسلیم نہ کرے اور اگر کسی وقت ایسا موقع پیش آئے کہ حکام کا عمل کھلم کھلا شریعت کے خلاف اور آئین مذہب میں بنیادی تبدیلی کا باعث ہو تو مسلمان کا فرض ہے کہ وہ شریعت کی حمایت میں کمر بستہ ہو جائے اور اس کے لیے بشرط ضرورت کسی قربانی سے دریغ نہ کرے۔ اسی دور میں ۳۵ھ میں تیرہ ہجرت بادشاہ ایران کا سر اٹھا کر کس مہر سی کے عالم میں ایک ایرانی ہی کے ہاتھ سے خاتمہ ہوا۔ جس کے بعد شاہزادیاں بحیثیت قیدی کے مدینہ بھیجی گئیں اور اس موقع پر جبکہ فہیم ملک کی شاہزادیوں کو قید دیکھ کر بہت سے آدمی خوش ہو رہے ہوں گے حضرت علیؑ اور ان کے عالی دماغ شاہزادہ حسینؑ نے انھیں کینیزی کی ذلت سے بچا ہی نہیں کیا بلکہ انھیں خاندانِ رسول کے گھر کی ملکہ کا تاج پہنا دیا۔ چنانچہ وہ شاہزادی جن کا نام

مگر اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مملکت میں خلفشار رہے گا اور بحیثیت ایک حاکم کے میرا دور ناکامیاب سمجھا جائیگا۔ آپ نے پورے طور پر انکار کیا مگر مسلمانوں کا اصرار اتمامِ حجت کی صورت اختیار کر گیا یعنی وہ علی بن ابی طالبؑ پر یہ ذمہ داری عائد کرنے لگے کہ دنیا آپ سے ہدایت و اصلاح کی طالب ہے اور آپ اس سے گریز کرتے ہیں۔ ایک داعی حق کو یہ بھی زیبا نہیں ہے کہ وہ خلیفہ خدا پر ہے اعتماد کی آڑ پکڑ کر ان کی درخواست کو ٹھکراتا رہے اور ان کی ہدایت کی ذمہ داری کو پورا کر کے ان پر حجت تمام نہ کرے۔ مجبوراً حضرت علی بن ابی طالبؑ کو یہ ذمہ داری قبول فرمانا پڑی۔ بلے شک آپ نے دنیا کو دھوکے میں مبتلا نہ رکھنے کے لیے صاف اعلان کر دیا کہ دیکھو جب تم ذمہ داری کو میرے سپرد کر رہے ہو تو میں جو ٹھیک راستہ سمجھوں گا اسی پر تمہیں چلاؤں گا اور کسی کے اعتراض اور نکتہ چینی کی پروا نہ کروں گا۔ لوگوں نے اس کا اقرار کر کے ذی الحجہ ۳۵ھ میں علی بن ابی طالبؑ کی بیعت کی اور خلیفۃ المسلمین تسلیم کر لیے گئے۔ اس سے ایک طرف یہ ثابت کیا گیا کہ دنیا کی فضا اب اہمیت کے حکومت و اقتدار کے لیے موزوں نہیں ہے۔ دوسری طرف یہ کہ اگر اللہ کے بندے وفاداری کے عہد کے ساتھ رہنمائی کے طالب ہوں تو جب تک حجت ان پر پورے طور سے تمام نہ ہو جائے ہمارا فرض یہ ہے کہ ہم بظاہر ان کے عہد و پیمان کو باور کریں اور ان کی خواہش رہنمائی کی تکمیل کے لیے قدم آگے بڑھائیں۔

خلافت کی ذمہ داری قبول کرنے کے بعد وہی ہوا جو حضرت علی بن ابی طالبؑ پہلے سے سمجھے ہوئے تھے کہ دنیا آپ کے تعلیمات کی پیروی کے لیے نیا نہیں ہوتی۔ کچھ لوگوں نے تو بیعت سے پہلو تہی کی جیسے اسام بن زید، حسان بن ثابت، عبداللہ بن عمر اور سعد بن ابی وقاص وغیرہ۔ حضرت علیؑ نے ان کے ساتھ کوئی سختی نہیں کی حالانکہ تمام مسلمانوں کے نقطہ نظر سے آپ کی بیعت مکمل ہو چکی تھی اور اس لیے ان کا بیعت سے انحراف ان سب کے نزدیک غلط تھا مگر جب تک وہ عملی طور سے کوئی مخالفت نہ کرتے اور اس نظام میں خلل نہ ڈالتے،

متوجہ نہیں ہوئے آخر میں توں رات "حش کوکب" نام کے مقام پر جو مسلمانوں کے قبرستان سے الگ تھا سپرد خاک کیے گئے۔

اس عبرت خیز مرقع سے ایک حساس انسان کس قدر اہم نتائج اخذ کر سکتا تھا؟ سلطنتِ دنیا کی بے ثباتی، جمہور کی وفاداری پر عدم اعتماد نیز مردان اور دوسرے بنی امیہ کے ہاتھوں اسلام کے شیرازہ کی اتاری یہ سب کچھ حسینؑ نے دیکھا اور اپنی آئندہ زندگی کے سب سے اہم کارنامہ کی بنیادوں کو مستحکم بنانے میں ان میں سے ہر ایک پہلو کا لحاظ رکھا جس کے سننے اور سمجھنے کیلئے ایک مستقبل کا انتظار کرنا چاہیے۔ حالات بہت تیزی سے تبدیل ہوتے ہیں اور ان حالات کے لحاظ سے جمہور کے رجحانات بھی بدلتے رہتے ہیں۔ اس ہنگامی انقلاب کے نتیجے میں مسلمانوں کی آنکھیں کھلیں اور ان کے انتخاب کی نگاہیں حضرت علی بن ابی طالبؑ کے چہرہ پر جم گئیں۔ انھوں نے آپ کے پاس آکر خلافتِ اسلامی کی ذمہ داری کو سنبھالنے کی درخواست کی۔ یہ بات حیرت میں ڈالنے والی تھی کہ حضرت علیؑ باوجودیکہ اس کے پہلے ہمیشہ خلقِ خدا کی ہدایت اور ان کے نظم و نسق کی اصلاح کے لیے بے چین اور خلافتِ رسولؐ کے لیے اپنے استحقاق کا اعلان فرماتے رہے تھے۔ آج مسلمانوں کی اس متفقہ ملتجیانہ پیشکش کو مسترد فرما رہے تھے۔ اور اس کے لیے کسی طرح تیار نہیں تھے حسینؑ خوب جانتے تھے کہ اس کا سبب کیا ہے؟ حکومت اور عملِ حکومت کے رقبہ کی بدولت مسلمانوں کی عاداتیں گہری جھکیں اور زاویہ نگاہ میں تبدیلی ہو چکی تھی۔ اسلامی حکومت بڑی حد تک دنیوی اقتدارِ سلطنت کے قالب میں ڈھل گئی تھی اور کسرویت و قیصریت کے آثار اس میں نمودار ہو گئے تھے۔ یہ چیز کسی طرح اس سادگی اور مساوات کے ساتھ سازگار نہ تھی جسے پیغمبر اسلامؐ نے دنیا میں پھیلایا تھا اور جس پر حضرت علی بن ابی طالبؑ نہایت سختی کے ساتھ عامل تھے اُن لیے حضرت خوب جانتے تھے کہ اگر میں اس وقت حکومت کی باگ کو سنبھالوں تو یا تو مجھے زمانہ کے ساتھ ساز کر کے ہوا کے لُرخ پر چلنا پڑے گا اور اس کے لیے میرا ضمیر مجھ کو اجازت نہیں دے سکتا اور یا میں زمانہ کے ساتھ جنگ کروں گا۔ بیشک اگر میں ذمہ داری اپنے سر لے لوں تو مجھے ایسا ہی کرنا چاہیے۔

اور اس کے بعد میرے لیے چارہ کار باقی نہ رہا۔ یہ واقعات بہت طویل ہیں۔ بہر حال جو ہونا تھا وہ ہوا اور اب جو حالات پیش ہیں وہ آنکھوں کے سامنے ہیں۔ اب تم وہاں کے لوگوں سے بیعت حاصل کرو اور اپنے یہاں کے آدمیوں کے ایک وفد کے ساتھ میرے پاس حاضر ہو۔

معاویہ اگر مخالفت پر پہلے ہی سے تلے ہوئے نہ ہوتے تو اس خط کے مضمون پر انھیں عمل کرنا چاہیے تھا مگر وہاں تو عناد و مخالفت کی چنگا ریاں پہلے سے لٹکی رہی تھیں۔ آخر آپ کے مقابلہ میں قتل عثمان کا غلط الزام تراشا گیا اور اس بہانہ سے آپ کی مخالفت کا جھنڈا اونچا کیا گیا۔

معاویہ نے شام والوں کو حضرت علی بن ابیطالب کے خلاف اس غلط تممت کو ان کے ذہن نشین کر کے پورے طور پر مشتمل کر دیا۔ مسجد جامع دمشق میں ماتی جلے کے گئے، مقتول خلیفہ کا خون بھرا کرتا منبر پر ڈال دیا گیا اور عالم یہ تھا کہ پچاس ساٹھ ہزار کا مجمع اسے دیکھ دیکھ کر نالہ و زاری کرتا اور اس جوش رقت میں ان سے کہا جاتا تھا کہ اب تمہیں علی سے اس خون کا بدلہ لینا ہے۔ اب حضرت علی شام کی ہم کے تدارک کا سامان کرنا چاہ رہے تھے جو یک بیک یہ خبر آئی کہ طلحہ اور زبیر نے زوہر رسول عائشہ بنت ابی بکر کو آمادہ کر کے آپ کے خلاف محاذ تیار کر لیا ہے۔

وہ لوگ جو پچیس برس تک حضرت علی کو میدان جنگ سے بالکل علیحدہ رہتے ہوئے خاموشی کی زندگی گزارتے دیکھ چکے تھے انھیں یقین ہوگا کہ حضرت علی کسی نہ کسی طرح اس قضیہ کو رفع دفع کر دیں گے اور جنگ کی نوبت نہ آنے دیں گے مگر انھوں نے دیکھ لیا کہ وہی علی جو اپنی تلوار کو اتنے عرصہ تک نیام میں رکھ چکے تھے کہ جوانی گزر کے بڑھاپا آگیا تھا، آج وہ ذمہ داری اپنے اوپر عائد ہو جانے کے بعد آئین و اصول اور حق کی حفاظت کے لیے جنگ پر بالکل تیار ہیں۔ بیشک امام حسین نے دیکھا کہ ان کے پدر بزرگوار نے اس اصول کی سختی کے ساتھ پابندی فرمائی کہ جب تک فریق مخالفت عملاً جنگ کی ابتداء نہ کر دے اس وقت تک تلوار نیام سے نہ نکالی جائے چنانچہ مجمل کے میدان میں یہی سوا کہ جب صفوف لشکر مقب

۱۔ منہج البلاغہ ج ۲ ص ۱۳۳ ۲۔ مہر ج ۵ ص ۱۶۳ ۳۔ مہر ج ۵ ص ۱۶۳ ۴۔ منہج البلاغہ ج ۲ ص ۱۳۳ ۵۔ منہج البلاغہ ج ۲ ص ۱۳۳ ۶۔ منہج البلاغہ ج ۲ ص ۱۳۳ ۷۔ منہج البلاغہ ج ۲ ص ۱۳۳ ۸۔ منہج البلاغہ ج ۲ ص ۱۳۳ ۹۔ منہج البلاغہ ج ۲ ص ۱۳۳ ۱۰۔ منہج البلاغہ ج ۲ ص ۱۳۳

مذہب میں دستور یہ ہے کہ لاکراہ فی الدین تو خلافت کے تسلیم کرانے میں اکراہ کے کیا معنی؟

لیکن بعض لوگوں کا یہ مشورہ کہ معاویہ اور جتنے عثمان کے زمانہ کے عامل ہیں ان سب کو آپ برقرار رکھیں اور جب وہ مطمئن ہو جائیں اور آپ کی گرفت میں آجائیں تو پھر چاہے سب کو معزول کر دیں۔ اسے آپ نے منظور نہیں فرمایا اور اپنے کہا اور مذہبی ذمہ داری کے لحاظ سے آپ اس کے سوا کہہ ہی کیا سکتے تھے کہ سیاست دنیا کے لحاظ سے تو بیشک یہی بہتر ہے جو تم کہتے ہو مگر جب میں جانتا ہوں کہ وہ ظالم اور نااہل ہیں تو انھیں اپنی طرف سے حکومت کا پیدا نہ بھیج کر میں ان کے مظالم میں شریک ہوں۔ یہ کیونکر ہو سکتا ہے۔

یہ بڑا دور رس واقعہ ہے۔ اگر علی بن ابی طالب اپنی ماتمی میں معاویہ ایسے شخص کی حکومت کو دیتی فریغہ کے ماتحت برداشت نہیں کر سکتے تھے تو اس کے بعد کبھی حسین بیعت کر کے معاویہ سے بڑھ کر بڑا ایسے شخص کی حکومت کیونکر تسلیم کر سکتے ہیں؟

پھر بھی حضرت علی بن ابیطالب نے معاویہ کے نام جو خط لکھا اس میں کوئی سختی و درشتی، البتہ لہجہ کی تلخی اور جنگجویانہ انداز نہ تھا بلکہ ایک برسر اقتدار آنے والے حاکم اعلیٰ کو اپنے کسی عامل کو جس طرح کا خط لکھنا چاہیے دیا ہی تھا۔ اس خط کا مضمون جو مشہور مؤرخ و اقدی کی کتاب المجل سے منقول ہے حسب ذیل ہے:-

”تم کو معلوم ہوگا کہ میں نے مسلمانوں کے معاملات میں اپنے دامن کو کس طرح صاف رکھا اور کس طرح سخت مخالفت سے بے اعتنائی اختیار کرنا رہا۔ یہاں تک کہ وہ ہوا جو ٹل نہ سکتا تھا (قتل عثمان)

۱۔ پیغمبر اسلام کا ارشاد ہے کہ جو شخص مسلمانوں کی حکومت کا ذمہ دار ہو پھر وہ اپنی جانب سے کسی شخص کو دالی قرار دے درنا لیکر اس سے بہتر شخص مسلمانوں کے مفاد کے لیے موجود ہو تو اس نے خدا و رسول سے خیانت کی۔ دوسری حدیث میں ہے کہ جو شخص کسی آدمی کو کوئی منصب عطا کرے کسی جماعت کے اندر حالانکہ اس جماعت میں اس آدمی سے زیادہ پسندیدہ شخص موجود ہے تو۔ خدا اور اس کے رسول اور تمام مومنین کی خیانت کی (السیارۃ الشریعہ فی اصلاح الراعی والراعیۃ)

چاہیے اور اگر فرض ہمارا عملی اقدام کا ہو تو چاہیے بڑھاپے کا اضطلاع جسمانی قوتوں کو متاثر بھی کیے ہو مگر
ہیں عزم و ارادہ کے قدموں پر کھڑا ہونا چاہیے اور وہ کرنا چاہیے جو جو افراد نہ ہمت کا تقاضا ہے۔
اُدھر شام میں اشتعال انگیزی مسلسل جاری رہی۔ جناب عثمان کا خون بھرا گڑا اور ان کی زوجہ نامہ کی
کٹی ہوئی انگلیاں منبر پر آویزاں اور اس کے سامنے گریہ و زاری، یہ سلسلہ ایک سال تک برابر جاری رہا بہت
سے اہل شام نے قسم کھائی کہ وہ عورتوں کے قریب نہ جائیں گے سوا غیل واجب کے کسی دن نہائیں گے نہیں
اور بچھونے پر سوئیں گے نہیں جب تک ان آدمیوں کو جو قتل عثمان میں شریک تھے قتل نہ کر لیں گے۔ اس
طرح معاویہ نے پورے شام کو حضرت علی بن ابیطالب کے خلاف براہِ نیغہ کر دیا مگر آپ نے اپنی جانب
سے اصلاح کی کوشش جاری رکھی۔ چنانچہ اسی کے لیے آپ نے جریر بن عبداللہ بجلي کو دشمن بھیجا مگر اس
کا کوئی بھی نتیجہ نہ نکلا۔ آخر کو صفین کی جنگ کے لیے فوجیں میدان میں آگئیں۔ اب بھی آپ نے فہمائش
اور نصیحت کا سلسلہ موقوف نہیں کیا۔ بشیر بن عمرو بن محسن الفزاری، سعید بن قیس ہمدانی اور شہب
بن ربعی تمیمی ان تین آدمیوں کو معاویہ کے پاس روانہ فرمایا کہ وہ جا کر اتحاد و اتفاق اور اطاعت و
اجتماع کی طرہٴ دعوت دیں۔ مگر اس امن پسندانہ پیش قدمی کا جواب یہ ملا کہ پٹ جاؤ میرے پاس
سے کیونکہ میرے ہمارے درمیان بس تلوار سے فیصلہ ہو گا۔ کہاں تو حاکم شام کے یہ جنگجو یا نہ انداز اور
کہاں حضرت علی کی وہ گفتگو جو آپ نے نائندگان شام حبیب بن مسلم فہری، شریح بن سبط اور معن بن
یزید بن احنس کے سامنے فرمائی تھی جس میں آپ نے کہا تھا "میں تم لوگوں کو کتابِ خدا اور سنتِ رسول
باطل کو پامال کرنے اور حق کو زندہ کرنے کی جانب دعوت دیتا ہوں" لیکن آپ کی یہ دعوت منتر و
کردی گئی اور بالآخر مسلمانوں کا خون بے دریغ بہایا جانے لگا۔

اس جنگ کا آغاز اتنا ر اور انجام میں بہت سے جاذبِ توجہ امور پیش آتے رہے۔ پہلے یہ کہ
اس جنگ میں بھی حضرت علی نے اپنی فوج کو ہدایت کر دی کہ جب تک دشمن ابتداء نہ کرے تم
جنگ نہ کرنا۔ آپ نے ان تمام معرکوں میں جو نام نہاد مسلمانوں کے ساتھ پیش آئے ہیں برابر

۳۳۵ھ ۲ طبری ج ۲ ۲۴۵ھ ۳ طبری ج ۶ ۲۴۵ھ ۳ طبری ج ۵ ۲۳۵ھ

ہو چکے تو حضرت علی بن ابیطالب نے ایک قرآن ہاتھ میں لے کر اپنے ساتھیوں سے فرمایا کہ کون ہے جو اس
قرآن کو لے جا کر انھیں اس پر عمل کرنے کی دعوت دے مگر یہ بتائے دیتا ہوں کہ وہ قتل کر دیا جائے گا۔ یہ سکر
اہل کوفہ میں سے ایک جوان جس کا نام مسلم تھا کھڑا ہو گیا۔ کہا میں جاؤنگا حضرت نے سکوت فرمایا اور پھر
بلند آواز سے کہا کون ہے جو اس قرآن کو لے جا کر انھیں اس پر عمل کی دعوت دے مگر وہ قتل ہو جائے گا۔
پھر کھڑا ہوا تو وہی جوان حضرت نے پھر سکوت کیا اور پھر وہی الفاظ بلند آواز سے کہے جب پھر وہی جوان
کھڑا ہوا تو آپ نے وہ قرآن اس کے سپرد کیا وہ اسے لے کر صفوتِ مخالفت کے سامنے گیا۔ ظالموں نے
اس کا داہنا ہاتھ قطع کر دیا تو اس نے قرآن کو دونوں کٹے ہوئے بازوؤں سے تھام کر سینے سے لگا لیا۔
اس حالت میں کہ خواہ کی اس کے کپڑوں پر بارش ہو رہی تھی۔ اس کے بعد وہ قتل کر دیا گیا۔ علی بن ابیطالب
پکارے کہ اب ان سے جنگ حلال ہو گئی۔ اب دنیا نے دیکھا کہ وہی تلوار جو بدر، احد، خندق اور
خیبر میں کسی دقت چمک چکی تھی مجل کے میدان میں چمکنے لگتی ہے۔ وہی ہاتھ ہے اور ہاتھ کی صفائی
وہی دل ہے اور دل کی طاقت۔ یہاں تک کہ جمل کا معرکہ فریقِ مخالفت کی شکست پر ختم ہوا اس وقت
حضرت علی بن ابیطالب نے فریقِ مخالفت کی سرگردہ ام المومنین عائشہ کے ساتھ وہ شریفانہ اور
باغزت برتاؤ کیا جیسا کہ کسی فاتح نے اپنے مفتوح فریق کے ساتھ نہیں کیا ہو گا۔ یہ معرکہ روزِ پنجشنبہ
۱۰ جمادی الثانیہ ۳۲ھ کو پیش ہوا۔

ظاہر ہے کہ عام اسباب کے لحاظ سے اب جناب امیر کا سن لڑائیوں کی انگلیوں کا متقاضی نہیں
تھا۔ انسٹھ برس کی عمر تھی مگر آپ کا پچیس برس کی خاموشی کے بعد اب میدانِ جنگ میں آجانا اعلان
کر رہا تھا کہ حقیقتاً ہمارا حرکت و سکون سب فرض کے احساس کا نتیجہ ہونا چاہیے۔ فرض کی پکار پر
ہمیں ہمیشہ جواب دینا چاہیے۔ اصول اور فرض کے حدود میں جذبات کا تقاضا اور بس کا اختلاف
کوئی چیز نہیں ہے۔ اگر فرض ہمارا خاموشی کا ہو تو چاہیے جوانی کی تمام انگلیں قدم اٹھانے پر آمادہ کر
رہی ہوں پھر بھی ہم کو اپنی زندگی خاموشی کے ساتھ گزار دینا چاہیے اور جوانی سکون کے عالم میں بسر کرنا

۳ طبری ج ۵

کے آگے آگے تھے اس لیے کہ ان کا ضمیر مطمئن تھا۔ وہ شہادت کے شائق تھے۔ ان کا تو قول تھا کہ میں موت کے ساتھ اس سے زیادہ مانوس ہوں جتنا بچہ آغوشِ مادر سے مانوس ہوتا ہے۔ بیشک وہ اس موت کو ناپسند کرتے تھے جو زندگی کے ساتھ لیٹر راحت پر ہو۔ چنانچہ اصحاب سے فرماتے تھے کہ یاد رکھو اگر تم قتل نہ ہوئے تو اپنی موت مرد کے اور قسم اس خدا کی جس کے قبضے میں میری جان ہے کہ ہزار ضربیں تلوار کی جو سر پر پڑیں آسان ہیں فرشِ خواب پر ایڑیاں رگڑ کر مرنے سے۔ چنانچہ ان کا طرزِ عمل ہمیشہ اسی کا منظر رہا تھا۔ ابتدائے شباب میں جب ہر انسان کو زندگیِ اتمائی عزیز ہوتی ہے، رسولؐ کا ارشاد کہ علیؑ میرے بستر پر سو رہو اور علیؑ کا سر و چشم آمادہ ہو جانا اس کا تذکرہ پہلے ہو چکا ہے۔ یہ کوئی معمولی بات نہیں تھی معلوم تھا کہ خون کے پیاسے دشمن کھنچی ہوئی تلواریں لیے قتل پر آمادہ ہیں۔ مگر وہاں راہِ حق میں موت تو خوشگوار سمجھی جاتی تھی۔

اسی جنگِ صفین میں ایک موقع پر امامِ حسنؑ سے فرمایا:

"تمہارے باپ کو کوئی پردہ انہیں ہے کہ موت اس پر گر رہی ہے یا وہ خود موت کے اوپر گر رہا ہے۔" پھر ایسے باپ کے جو بیٹے ہوں جن کے سامنے یہ سیرت ہو اور جن کے کانوں میں یہ باتیں پڑ رہی ہوں انہیں موت کا اندیشہ کیونکر رہ سکتا ہے۔ چنانچہ حسینؑ اپنے بھائی حسنؑ اور محمد بن حنفیہ کے ساتھ اس جنگ میں برابر سے حصہ لے رہے تھے اور سخت سے سخت موقعوں پر ثباتِ قدم کے جوہر دکھلا رہے تھے۔ تاریخ نے ایک ایسے موقع کی تصویر کشی کرتے ہوئے کہ جب علی بن ابیطالبؑ کے لشکر کا بڑا حصہ شکست کھا چکا تھا لکھا ہے کہ اس وقت نہیں رہ گئے تھے علیؑ کے پاس مگر بڑے فرض شناس اور پرجہاد افراد اس وقت آپؑ نے اپنے گھوڑے کا رخ میسر کی جانب پھیرا کہ جدھر قبیلہٴ ربیعہ کے لوگ اب تک دشمنوں کا مقابلہ کر رہے تھے۔ راوی جن کا نام زید بن وہب جہنی ہے بیان کرتا ہے کہ میں دیکھ رہا تھا علیؑ کو کہ آپؑ ربیعہ کی فوج کی طرف جا رہے تھے اور آپ کے فرزند حسنؑ، حسینؑ اور محمد حنفیہ آپ کے ساتھ ساتھ تھے اور زید بن علیؑ کے

اپنی فوج کو یہ ہدایت فرمائی کہ اس وقت تک جنگ نہ چھیڑنا جب تک کہ وہ ابتداء نہ کریں۔ اس لیے لکھناری حجت محمد اللہ حقانیت کے لحاظ سے تو تمام ہے ہی اب یہ تمہارا جنگ میں ابتداء نہ کرنا اور ادھر سے ابتداء ہونا ان کے مقابلہ میں مزید اتمامِ حجت کا باعث ہو جائے گا اور جب لڑائی چھڑ جائے اور پھر دشمن کو شکست ہو تو کسی بھاگتے ہوئے کا پیچھا نہ کرنا۔ کسی زخمی پر ہاتھ نہ اٹھانا۔ کسی عورت کی بے حرمتی نہ کرنا۔ کسی مقتول کے اعضاء قطع نہ کرنا۔ خیمہ میں بلا اجازت داخل نہ ہونا۔ مسلمان کے مال و اسباب کو نہ لوٹنا اور دشمنوں کی عورتیں تمہیں اور تمہارے سرداروں کو گالیاں بھی دیں تو انہیں کوئی ایذا نہ پہنچانا۔

اس کے علاوہ یہ بھی ایک واقعہ سامنے آیا کہ معاویہ کے مقدمہ ہمیشہ ابوالاعور سلمیٰ نے نہ فرات پر قبضہ کر لیا اور حضرت علیؑ کے لشکر پر پانی بند کر دیا۔ مجبوراً آپؑ نے پانی کے لیے جنگ کا حکم دیا۔ آپ کے لشکر نے ابوالاعور سلمیٰ کی فوج سے گھاٹ چھین لیا اور یہ ارادہ کیا کہ اب دشمن کی فوج پر اسی طرح پانی بند کر دیا جائے جیسے اس نے ہم پر بند کیا تھا۔ مگر حضرت علیؑ بن ابیطالبؑ نے اس کو گوارا نہ فرمایا۔ آپؑ نے کہا کہ وہ اٹکا فعل تھا مگر تم انہیں پانی سے نہ روکو۔ اطمینان کے ساتھ سیراب ہونے دو۔ اس سے یہ سبق دیا جا رہا تھا کہ ہماری مخالفت جماعتِ انسانیت اور اخلاق میں کتنی ہی پست ہو جائے مگر ہم کو ہمیشہ بلند ظرفی سے کام لینا چاہیے اور اس کے کمینہ طرزِ عمل کا معاوضہ اس کے مثل سے نہیں کرنا چاہیے بلکہ ہمیں انسانیت کی بلندی کا تحفظ کرنا ضروری ہے۔

جنگِ صفین میں حضرت علی بن ابی طالبؑ کو مسلمانوں کی خونریزی سے بڑی تکلیف محسوس ہو رہی تھی چنانچہ آپؑ نے پکار کر امیرِ شام سے کہا کہ اس سے کیا حاصل ہے کہ عام مسلمانوں کا خون فیاضی کے ساتھ بہ رہا ہے۔ بس تم نکلی آؤ میدان میں اور میں آجاؤں اور اس جنگ کا فیصلہ ہو جائے۔ مگر معاویہ نے اس خطرہ کو اپنی ذات کے لیے مول نہ لیا۔ وہ دوسروں کے گلے کٹواتے رہے اور خود کبھی مقابلے کے لیے میدان میں نہیں آئے۔ برخلاف اس کے حضرت علیؑ جان کو جان نہ سمجھتے ہوئے برابر مجاہدین کی صفوں

اور چال بازی سے آگاہ کیا اور عاف فرمایا کہ یہ لوگ نہ اہل دین ہیں نہ اہل قرآن۔ مگر آپ کی فوج کے بہت سے لوگ آپ سے مخوف ہو کر اس بات پر مضرب ہو گئے کہ اب تلوار روک لیجیے۔ نہیں تو ہمارے آپ کے درمیان تلوار چلے گی۔ یہ بڑی کشمکش کا موقع تھا۔ دشمن سے مقابلہ کے ہنگام میں ایسی صورت پیدا ہو جانا کہ خود اپنی فوج میں تلوار چلنے لگے ایک انتہائی ہولناک صورت حال تھی جسے حضرت علی بن ابی طالب گوارا نہ کر سکتے تھے۔ مجبوراً آپ نے جنگ کے التوا کا حکم دیا اور طے پایا کہ ایک حکم اہل شام کی طرف سے نامزد ہوا اور ایک اہل کوفہ کی طرف سے۔ مگر اہل شام کی طرف سے عمرو بن عاص ایسا امیر شام کا نفس ناطقہ مقرر کیا گیا اور جب حضرت علی بن ابی طالب نے چاہا کہ مالک اشتر یا عبداللہ بن عباس یا کسی دوسرے ایسے ہی اپنے مخلص اور خیر خواہ کو اپنی جانب سے مقرر کریں تو وہی اپنی فوج والے پھر بکڑ گئے کہ یہ لوگ تو بالکل اس جنگ کے ذمہ دار ہیں ہم ان کو کیونکر مقرر کریں؟ آخر سب نے ابو موسیٰ اشعری کو جو پہلے ہی حضرت علی کی موافقت سے گریز کر چکے تھے اپنی جانب سے مقرر کیا۔ مصلحت وقت یہی تھی کیونکہ اپنی جماعت میں غوزیری کا انسداد اسی پر موقوف تھا کہ حضرت بادل ناخواستہ اس کو برداشت کر لیں۔ یہاں تک کہ نتیجہ سب کی آنکھوں کے سامنے آجائے تاہم آپ جو صلح نامہ لکھوایا اسکا مضمون حسب ذیل تھا:-

”علی بن ابی طالب ذمہ لیتے ہیں اہل کوفہ اور تمام ان مسلمانوں کا جو ان کے ساتھ ہیں اور معاویہ نے ذمہ داری لے لی ہے اہل شام اور تمام اپنے طرفداروں کی کہ ہم اللہ اور اس کی کتاب کے فیصلہ پر دار و مدار رکھتے ہیں اور سوا کتاب خدا کے کوئی شے ہم میں فیصلہ کن نہیں ہوگی اور کتاب خدا ہمارے سامنے رہے گی۔ شروع سے لے کر آخر تک ہم زندہ کریں گے اسی بات کو جسے خدا زندہ کرے۔ اور مردہ کریں گے اس کو جسے کتاب خدا مردہ کرے۔ لہذا حکمیں کو لازم ہوگا کہ وہ کتاب خدا پر نظر کریں اور جو کچھ اس میں ملے اس پر عمل کریں اور اگر کتاب خدا میں انھیں کوئی ہدایت

کان اور شانوں کے پاس سے گزر رہے تھے مگر آپ کے فرزند بڑھ بڑھ کر سپر بن جاتے تھے اور اپنے باپ کی حفاظت کرتے تھے۔ کیا یہ جذبہ فداکاری اور قربانی کا معمولی مظاہرہ ہے جو علی کی آنکھوں کے سامنے ان صاحبزادوں سے ظاہر ہو رہا تھا؟ کیا اس کے بعد کبھی یہ خیال کیا جاسکتا ہے کہ علی کے یہ بہادر بیٹے موت کے ڈر سے کسی فرض میں کوتاہی کریں یا کسی باطل طاقت کے سامنے جان کے خوف سے سر جھکائیں؟

اسی صفین کے میدان میں ایک اور منظر کا بھی مشاہدہ ہوا۔ وہ یہ کہ عین جنگ کی حالت میں حضرت علی بن ابی طالب کی نگاہ آفتاب پر تھی۔ ابن عباس نے سبب دریافت کیا۔ حضرت نے فرمایا کہ دیکھتا ہوں نماز ظہر کا وقت آیا یا نہیں۔ ابن عباس نے عرض کیا کیا یہ نماز کا موقع ہے؟ جنگ تو ہو رہی ہے آپ نے فرمایا کہ اور یہ ہماری جنگ کس بات کے لیے ہے؟ اسی نماز کے لیے تو جنگ کر رہا ہوں یہ عبادت الہی کے فرض کی اہمیت کا ایک بے مثل عملی درس تھا کہ تیروں کی بارش ہو یا آگ برس رہی ہو جب نماز کا وقت آئے تو لازم ہے کہ اس فرض کے ادا کرنے کے لیے کھڑے ہو جائیں۔ جنگ کو بہت طول ہو چکا تھا۔ آخر ایک دن حضرت علی بن ابی طالب نے طے کر لیا کہ اب مکمل فتح حاصل کرنے کے بعد ہی جنگ کو موقوف کیا جائیگا۔ ایک دن اور رات مسلسل جنگ دار و گیر برپا رہا جس کے نتیجے میں فوج شام کے قدم اکھڑنے لگے اور معاویہ کو شکست کا یقین ہو گیا مگر عمر بن العاص نے اس دن کے لیے ایک چال اٹھا رکھی تھی۔ وہ یہ کہ فوراً قرآن نیردوں پر بلند کر دیے گئے اور ندادی گئی کہ بھائیو یہ کتاب خدا ہی ہمارے اور تمہارے درمیان فیصلہ کر دے گی۔ شام والے سب ہلاک ہو گئے تو شام کے حدود کا کون نگہبان ہوگا۔ حالانکہ آغاز جنگ سے پہلے ہی حضرت علی بن ابی طالب قرآن کے فیصلہ کی دعوت دے چکے تھے۔ مگر اس وقت کامیابی کے تخیلات کی بنا پر علی کی دعوت کو مسترد کر دیا گیا۔ اب شکست کے آخری لمحہ سے بچنے کے لیے قرآن درمیان میں لایا جا رہا تھا۔ حضرت علی نے اپنی فوج والوں کو اس

کی اور کتاب خدا و سنت رسولؐ سے کوئی سروکاری نہیں رکھا۔ چونکہ ابو موسیٰ سادہ لوح آدمی تھے اور جناب امیرؓ سے کوئی خلوص و محبت بھی نہیں رکھتے تھے، انھیں عمرو بن العاص نے اپنی سیاست کا شکار بنالیا۔ اس طرح کہ جب وقت مقررہ پر دومتہ الجندل میں جو کوفہ و شام کے لحاظ سے بالکل وسط میں واقع تھا اور اس لیے فیصلہ کے لیے وہیں اجتماع طے پایا تھا۔ یہ لوگ یکجا ہوئے۔ روزنامہ ملاقات اور تبادلہ خیالات کا سلسلہ قائم ہو گیا تو عمرو بن عاص نے یہ طریقہ اختیار کیا کہ جب گفتگو ہو تو ابو موسیٰ اشعریؓ کو اپنے اوپر مقدم قرار دیں اور کہیں کہ آپ بزرگ ہیں۔ رسول خداؐ کی صحابیت کا نجم سے زیادہ شرف رکھتے ہیں۔ آپ پہلے تقریر کیجیے، پھر میں جو کہنا ہے کہوں گا۔ اس طرح عمرو بن عاص نے ابو موسیٰ اشعریؓ پر اپنے خلوص و عقیدت کا اثر جمایا اور آئندہ کے لیے جو منصوبہ سوچا تھا اس کی مہمید قائم کر دی۔

پھر زیر بحث مسئلہ کے متعلق تبادلہ خیالات کیا اور ابو موسیٰ کو یہ پٹی پڑھائی کہ ہم دونوں فریق یعنی حضرت علیؓ اور معاویہؓ کو ایک ساتھ معزول کر دیں اور پھر مسلمانوں کو اختیار دیں کہ وہ از سر نو جس کو چاہیں منتخب کر لیں۔ ابو موسیٰ اس فریب میں آگئے اور خیال خود متفقہ حیثیت سے یہی طے کر لیا۔

جب فیصلہ کا وقت آیا اور طرفین کے آدمی فیصلہ سننے کو جمع ہوئے تو عمرو بن عاص نے حسب عادت ابو موسیٰ اشعریؓ سے کہا۔ ”بسم اللہ! آپ فرمائیے جو کچھ فرمانا ہے۔“ ان کو تو عادت پڑی ہی تھی کہ ہمیشہ گفتگو میں پہل وہ کریں۔ وہ بلا عذر تقریر کے لیے آمادہ ہو گئے۔ عبد اللہ بن عباسؓ نے جو مجھ دار آدمی تھے متنبہ بھی کیا کہ دیکھو عمرو بن عاص کہیں چوٹ نہ دے دے۔ پہلے اسے تقریر کر لینے دو۔ پھر تم تقریر کرنا۔ مگر ابو موسیٰ اشعریؓ نے کہا کہ نہیں، ہم نے باہم متفقہ طور پر ایک چیز طے کر لی ہے۔ چنانچہ کھڑے ہو گئے اور حمد و ثنا کے بعد کہنے لگے کہ ”ہم نے انتہائی غور و خوض کے بعد ایسی بہترین صورت طے کی ہے جس سے افتراق و اختلاف کا خاتمہ ہو سکتا ہے۔ وہ یہ کہ ہم دونوں علیؓ اور معاویہؓ کو معزول کر دیں اور خلافت کو از سر نو مسلمانوں کے حوالے کر دیں۔

کودہ جسے ہا میں منتخف کر لیں، وہ نہ کہہ کر خود بخود بیٹھے عمرو بن عاص نے کھڑے ہو کر کہا کہ ”حق بات ہے“

نظر نہ آئے تو رسول خداؐ کی سنت پر جو اختلافی نہ ہو عمل کیا جائے گا۔“ اس معاہدہ کے الفاظ سے صاف ظاہر ہے کہ حکمین کو اپنی ذاتی رائے سے جو کسی سیاست دینی کا تقاضا ہو فیصلہ کرنے کا حق نہیں دیا گیا تھا۔ چنانچہ حضرت علیؓ نے خود حکمین سے جو فیصلہ کے لیے مقرر ہوئے تھے فرمایا تھا کہ ”تم اس شرط پر حکم ہو کہ کتاب اللہ کے رُوسے فیصلہ کرنا اور اگر تمہیں کتاب خدا کی رُوسے فیصلہ نہ کرنا ہو تو تمہیں اپنے کو حکم نہیں سمجھنا چاہیے۔ دوسرے اشخاص کو بھی یہ بتا دیا گیا کہ حکمین پر یہ شرط لگا دی گئی ہے کہ وہ قرآن کی بنا پر فیصلہ کریں اور اپنی ذاتی رائے کو کام میں نہ لائیں۔“

یہ اقرار نامہ ۱۳ صفر ۳۵ کو پایہ تکمیل تک پہنچا۔

باوجود حضرت علیؓ بن ابی طالبؓ کی اس دوراندیشی اور احتیاط کے پھر بھی ساتھ فریقے منہمک آدمی فتنہ و فساد برپا کرنے سے باز نہ آئے اور ابھی اقرار نامہ لکھا ہی گیا تھا کہ اسی وقت حضرت علیؓ کی فوج میں یہ آواز بلند ہو گئی کہ انہوں کو حکم بنانا درست نہیں لاکھ لا اللہ یعنی حکم ہونا اللہ سے مخصوص ہے۔ اس آواز کا سب سے پہلا بلند کرنے والا قبیلہ بنی تمیم کا ایک شخص عروہ بن ادبہ تھا۔

یہ جماعت خوارج کا سنگ بنیاد تھا۔ ان لوگوں نے حضرت علیؓ سے اصرار کیا کہ پہلے معاویہؓ سے جنگ کیجیے۔ ہم آپ کے ساتھ ہیں۔ آپ نے وہی جواب دیا جو رسول خداؐ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد دیتے تھے ”ہم نے نوشتہ دے دیا ہے۔ شرائط طے کیے ہیں۔ عہد و میثاق کر لیا ہے۔ اب اسکی مخالفت ممکن نہیں ہے۔ قرآن میں حکم ہوا ہے کہ دفا کرو عہد و پیمان کے ساتھ اور قسم کھانے کے بعد اس کی مخالفت نہ کرو جبکہ تم نے اللہ کو اس کا ضمان بنا دیا ہے اور یقیناً اللہ تمہارے

افعال و اعمال پر مطلع ہے۔“

آپ نے اس سختی کے ساتھ معاہدہ پر قیام کیا مگر حکمین نے خود شرائط مقررہ کی پابندی نہیں

فائدہ اٹھا کر اپنی قوت کو زیادہ منظم کر لیا تھا برابر اطراف مملکت میں اپنی فوجیں بھیج کر بدامنی کا سلسلہ قائم کیے ہوئے تھے جس میں خفیہ اور علانیہ ہر قسم کے اقدامات مشاغل تھے مثلاً مصر میں جناب امیر کے بہت بڑے معادن مالک اشتر کا زہر دوا کر خاتمہ کیا۔ اس کے بعد محمد بن ابی بکر گورنر بنارک بھیجے گئے تو عمرو بن عاص نے خطوط لکھ کر خود مصر کے بعض عمائد سے ساز باز کی اور پھر اپنی فوج لے کر حملہ کر دیا۔ اُدھر سے شام کی فوج اور اُدھر سے خود مصر والوں کا ایک مسلح لشکر محمد بن ابی بکر مع اپنی جماعت کے چلی کے دو پاؤں میں آگے۔ آخر ان کی فوج نے شکست کھائی اور خود انتہائی بیدری کے ساتھ قتل کیے گئے، بلکہ لاش کو بھی آگ میں جلا دیا گیا۔ محمد بن ابی بکر کے بعد مصر میں معاویہ کا تسلط قائم ہو گیا۔ اسی سے ان کی ہمت اور بڑھی چنانچہ ۳۷ھ میں نعمان بن بشیر کی سرکردگی میں دو ہزار کی فوج نے عین التمر پر حملہ کیا جو ناکامی کے ساتھ پسپا ہوا۔ سفیان بن عوف غامدی نے چھ ہزار کی فوج کے ساتھ انبار پر حملہ کیا اور انیس بن حسان بکری کو جو جناب امیر کی طرف سے وہاں مقرر تھے ان کے قتل پہراہوں سمیت قتل کر دیا اور تمام مال و اسباب لوٹ کر واپس چلا گیا۔ عبداللہ بن مسعود غزالی نے سترہ سو آدمیوں کے ساتھ تیماء پر حملہ کیا۔ حضرت علیؑ نے مسیب بن نجیعہ غزالی کو اس کے مقابلہ کے لیے بھیجا جنھوں نے جنگ کر کے اس کو شکست دی اور اس نے شام کی جانب فرار کیا۔ اسی صورت سے ضحاک بن قیس کو تین ہزار فوج کے ساتھ بھیجا گیا جو لوٹ مار کرتی ہوئی قادسیہ کے حدود تک پہنچ گئی اور حجر بن عدی فوج لے کر گئے تو اس نے فرار اختیار کیا معلوم ہوتا ہے کہ مصیبن کی جنگ کے بعد محسوس ہو گیا تھا کہ حضرت علیؑ سے کھلے میدان میں مقابلہ کر کے کامیابی حاصل کر لینا ممکن نہیں ہے۔ اس لیے یہ گوریلا جنگ کا طریقہ اختیار کر لیا گیا تھا جس سے اسلامی مملکت میں ایک مستقل خلفشار قائم رکھنے کا انتظام کیا گیا تھا۔ اس سلسلہ کا سب سے اندوہناک واقعہ محمد بن ابی اوطا کا تین ہزار کی فوج کے ساتھ حجاز پر حملہ تھا جس نے مدینہ اور مکہ والوں

۶۷ھ طبری ج ۶ ص ۵۷۵ ۶۸ھ طبری ج ۶ ص ۵۷۶ ۶۹ھ طبری ج ۶ ص ۵۷۷

آپ لوگوں نے ابو موسیٰ اشعری کی تقریر سنی وہ علیؑ کے نمائندہ ہیں اور انھوں نے علیؑ کو معزول کر دیا ہے میں معاویہ کا نمائندہ ہونے کی حیثیت سے علیؑ کے معزول کرنے میں ان سے متفق ہوں مگر معاویہ کو میں برقرار کرتا ہوں۔ یہ سننا تھا کہ ابو موسیٰ چیخ اٹھے۔

”ارے یہ تو نے کیا کیا؟ خدا تجھ سے سمجھے، تو نے غدار کی، بے ایمانی کی۔ تو کتے کی طرح ہے کہ جہاں اس پر حملہ کر دیا اسے اس کے حال پر چھوڑ دو۔ وہ بھونکنے سے باز نہ آئے گا۔“ عمرو عاص نے جواب دیا۔

”تمہاری مثال گدھے کی سی ہے جس کی پشت پر کتا میں لاد دی گئی ہوں“ جمع میں سے کوئی ابو موسیٰ کی طرف جھپٹ کر حملہ آور ہوا اور کوئی عمرو عاص پر غرض اس ٹرنگ اور ان تہذیب و اخلاق کے مظاہروں کے ساتھ یہ اجتماع منتشر ہو گیا۔ ظاہر ہے کہ اس طرح کی مکارانہ دھاندلی کو کسی باضابطہ فیصلہ کا درجہ دیا ہی نہیں جاسکتا تھا چنانچہ اسے کسی نے بھی مستحکم کیا اور اختلاف جوں کا توں قائم رہ گیا لیکن اس سے حضرت علیؑ کی جماعت کے انتشار میں کچھ اور زیادہ اضافہ ہو گئی۔

اُدھر خوارج نے اپنی جماعت کو منظم کر کے مقابلہ کی تیاری کر دی جس سے ۳۸ھ میں جنگ نہروان کی صورت پیش آئی۔

واقعات کے اس طویل سلسلہ میں بڑے نتائج برآمد ہوتے تھے اور محسوس ہوتا تھا کہ ایک قائمہ کو اپنے ساتھ والوں کے ہاتھوں جبکہ وہ خالص و مخلص یکدل اور ہم آہنگ نہ ہوں کتنی کشمکش اور روحانی تکلیف کا سامنا ہوتا ہے اور اس سے مقصد کو کس درجہ نقصان پہنچ جاتا ہے۔

نہروان کے بعد بھی یہ فتنے اور شور و شیں بالکل ختم نہیں ہوئیں۔ ایک طرف خوارج نہروان کے ہم خیال افراد جو جنگ میں نہیں گئے تھے اور شہروں کے اندر مقیم تھے حضرت امیرؑ کے خلاف فضا انتشار پیدا کرتے رہتے تھے اور دوسری طرف امیر شام معاویہ جنھوں نے اہل کوفہ کے انفرادی

ساتواں باب

بنی امیہ کا اقتدار اور ان کی سیاسی روش

بنی امیہ اور اس طرح کے اکثر لوگ جو دبدبہ اور شکوہ سے متاثر ہو کر مسلمان ہوئے تھے ان کی نفسیاتی کیفیت وہی تھی جو ہر دینی ہوئی اور شکست خوردہ قوم کی ہوتی ہے یعنی نفرت، دشمنی، غصہ، جذبہ انتقام اور اس کے ساتھ ساتھ دُرُجس کے نتیجے میں وہ کھل کر اپنی عداوت کا اظہار نہ کر سکتے تھے مگر برابر موقع کے منتظر تھے کہ کس طرح ہم اسلام کو نقصان پہنچائیں اور اگر اس کو ختم نہ کر سکیں تو کم از کم ان خصوصیات اقلیاری کو تبدیل کر دیں جو اس نے قائم کیے ہیں اور جن سے ہمارے اقتدار کو صدمہ پہنچا ہے اور اسلام کے پردے میں ہی سہی ان حدود و اقیانات کو قائم کر دیں جو اسلام کے پہلے عرب میں قائم تھے۔ انھوں نے اس کی تیاری تو رسول کے زمانہ ہی سے شروع کر دی تھی مگر پیغمبر اسلام کی زندگی میں ان کے اس مقصد کی تکمیل مشکل تھی پیغمبر نے ان کے دلوں کو اسلام کی طرف مائل کرنے کے واسطے ہر طرح کوشش کی مگر ان کے جذبات وہی رہے اور ایک ذرا اسلام پر کوئی مصیبت پڑتی تو ان کے پھرے خوشی سے کھل جاتے اور کبھی جذبات دلی زبان پر آ جاتے تھے۔ چنانچہ جنگِ حنین میں جب حدود سے چند کے سوا باقی تمام مسلمان میدانِ جنگ سے دوچار ہوئے تو ابوسفیان نے کہا، بس اب یہ سمندر تک بھگتے چلے جائیں گے۔ اور ایک نو مسلم نے کہا۔ بس اب جہاد ختم ہو گیا۔

وفاتِ رسول کے بعد ابوسفیان نے اسلام پر حملہ کرنے کی پہلی کوشش وہ کی جس کا تذکرہ پہلے ہوا ہے کہ حضرت علی بن ابی طالب کے پاس آ کر آپ کو تلوار اٹھانے پر آمادہ کرنا چاہا۔

سے بھر بیعت لینے کے بعد یمن کا رخ کیا اور وہاں کئی آدمیوں کو قتل کیا۔
عبداللہ بن عباس کا مکان لوٹا اور ان کے دو کمن بچوں کو ذبح کر دیا۔ پھر جب حضرت علی نے مقابلہ کے لیے لشکر بھیجا تو وہ مع اپنی فوج کے فرار کر گیا۔
یہ بزدلی کا طریقہ جنگ حضرت علی کے لیے انتہائی تکلیف کا باعث تھا۔ مجبوراً پھر آپ نے تہیہ فرمایا تھا کہ دمشق پر فوج کشی کر کے ہمیشہ کے لیے اس قصہ کو ختم کیا جائے جس کے لیے آپ نے ایک نہایت پُر زور خطبہ پڑھ کر مسلمانوں کو آمادہ کر لیا مگر اس کے بعد ایک ہفتہ بھی پورا نہ ہوا تھا کہ مسجد میں عین نمازیں ۹ راہ رمضان کو آپ کے مبارک پر آجین ملج مرادی نے زہر میں گھسی ہوئی تلوار لٹکانی شخص کے اثر سے ۲۱ راہ رمضان تک صبر کو آپ نے دنیا سے رحلت فرمائی۔

اس وقت حسین بن علی چھتیس برس کی عمر کو پہنچ چکے تھے۔ اس طولانی دور میں حسین نے اپنے والد بزرگوار علی بن ابیطالب سے کیا کچھ دیکھا، کیا کچھ سنا اور کتنا اثر لیا؟ مسلمہ الثبوت شیعہ معتقدات سے قطع نظر کرنے کے بعد بھی عام تاریخی حالات اور ظاہری اسباب کے ماتحت یہ اہم تجربات اور گراں قدر تعلیمات جو ایک رابع صدی سے زیادہ تک حضرت امام حسین کو حاصل ہوتے رہے۔ ایک انسان کے بلندی اخلاق و صفات اور نچتہ کاری کے قطعی ضامن اور ذمہ دار ہیں۔

طبري ج ۴ ص ۵۹ طبري ج ۴ ص ۶۲ طبري ج ۵ ص ۶۹ طبري ج ۴ ص ۷۲ طبري ج ۵ ص ۷۹

انجام دیتے تھے۔
 اوسفیان کی اولاد میں سے تیزید اور معاویہ کے علاوہ ان کی ایک بہن جو یرینت اسی
 بھی اپنے شوہر کے ساتھ موجود تھیں اور انھوں نے جنگ میں شرکت بھی کی تھی۔

۱ طبری ج ۴ ص ۲۸ ۲ طبری ج ۴ ص ۳۱ ۳ طبری ج ۴ ص ۳۲ ۴ طبری ج ۴ ص ۳۳ ۵ طبری ج ۴ ص ۳۴

ہوتا ہے اور پھر بھی آپ معاویہ کو اس پر کوئی تنبیہ نہیں کرتے۔

اب حضرت عثمان کے منہ پر یہ کہا جانے لگا تھا کہ ان کے بعد عالم اسلامی کی خلافت معاویہ کو ملے گی اور اس کی کوئی رد نہ کی جاتی تھی۔

غالباً اسی کا نتیجہ تھا کہ جب ان کا محاصرہ ہوا اور انھوں نے معاویہ کو مدد کے لیے لکھا تو معاویہ نے اپنی جگہ سے کوئی جنبش نہیں کی بلکہ نتیجہ کے منتظر ہو گئے۔ کیونکہ وہ یقین رکھتے تھے کہ ان کے بعد خلافت مجھے ملیگی اور عمرو بن عاص تو صاف صاف عثمان کے خلاف استعمال انگیزی کرتے تھے، اور جب قصر حکومت کا محاصرہ ہو گیا تو وہ فلسطین جا کر اپنی کوششوں کے انتظار میں بیٹھ گئے اور ہر آنے والے سے مدینہ کا حال بڑی بیتابی سے دریافت کرتے تھے۔ یہاں تک کہ جب قبل عثمان کی خبر ملی تو کہا، کیا کہنا میرا۔ یہ تو میری ہی کوشش کا نتیجہ ہے۔

اس کے بعد ہی عمرو بن عاص معاویہ کے دست راست بنے۔ اور بڑے مناصب حاصل کیے۔ انھوں نے خود ایک موقع پر معاویہ سے صاف کہہ دیا کہ اگر حقانیت سامنے ہوتی تو ہم تمہارا ساتھ ہی کیوں دیتے۔ علی کا ساتھ نہ دیتے جن کے اسلامی خدمات، فضیلت اور رسولؐ سے قربت سب کو معلوم ہے۔ مگر ہمارے پیش نظر تو دنیا ہے۔ اسی لیے تمہارا ساتھ دے رہے ہیں۔

آلِ ابوسفیان نے شام میں حکومت قائم کرنے کے بعد ابتدا ہی سے اپنی سیاسی روشیں بظاہر رکھی۔ کوئی سیاست اگر حالک اسلام کا سفر کر کے اسلامی سادگی اور مساوات کی مثالیں دیکھ چکا ہوتا اور پھر شام جا کر وہاں کے تزک و احتشام کا مشاہدہ کرتا تو وہ حیرت و استعجاب کی ایک دنیا میں چکر لگانے لگتا۔ وہ سادگی جو اسلامی زندگی کا طرہ امتیاز تھی وہاں نام و نشان کو بھی نہ تھی بلکہ اس کے بجائے ملوکانہ عظمت و جلال کے مظاہرات پوری طاقت کے ساتھ نظر آتے تھے۔ دیکھنے والوں نے دیکھا اور پیغمبر اسلامؐ کے جاری کیے ہوئے طرز زندگی سے مانوس بعض صحابہ

۱۰۹ھ طبری ج ۵ ص ۱۰۹

طبری ج ۵ ص ۲۳

مطلب یہ تھا کہ ہائے افسوس سلطنتِ روم کے پُر شوکت بادشاہوں کا نام ملتے ہوئے نظر آتا ہے۔ عبداللہ بن زبیر نے اس واقعہ کا اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کیا اور اپنے باپ زبیر سے بیان کیا۔ اس وقت کہ جب مسلمانوں کو کامل طور پر فتح حاصل ہو چکی تھی زبیر نے کہا۔ خدا اسے غارت کرے، یہ نفاق سے باز نہ آئے گا۔ کیا ہم اس کے لیے رومیوں سے بہتر نہیں ہیں؟

اس کے بعد ۳۳ھ میں جب عثمان خلیفہ ہوئے تو چونکہ وہ خاندان بنی امیہ کے ایک فرد تھے، ابوسفیان وغیرہ سمجھے کہ اب ہماری بن آئی۔ دلی جذبات اتنی وقت کے ساتھ ابلے کہ تاب نہ رہی۔ ابوسفیان ان کے پاس آیا۔ وہ اس وقت بہت بوڑھا تھا اور آنکھوں سے بھی معذور ہو چکا تھا۔ اس نے کہا بڑی مدت کے انتظار کے بعد اب یہ خلافت تم تک پہنچی ہے۔ اب اس کو گیند کی طرح اپنی مرضی کے مطابق گردش دو اور بنی امیہ کے ذریعہ سے اس کی بنیادوں کو مضبوط کرو۔ اس لیے کہ جو کچھ ہے وہ یہی دنیوی سلطنت۔ رہ گیا جنت و دوزخ اس کو میں کچھ سمجھتا نہیں۔

چنانچہ ابوسفیان کے خاندان والوں نے اس خلافت سے خوب فائدہ اٹھایا اور کوئی شک نہیں کہ ابوسفیان نے اپنے دنیوی خواہوں کی تعبیر اپنی زندگی میں اپنی آنکھوں سے دیکھ لی۔ تنک دمشق اور شرق اردن کے ساتھ ساتھ حمص، قنسرین اور فلسطین بھی معاویہ کے زیر نگین ہو گئے اور وہ بلا شرکت غیرے پورے ملک پر قابض قرار دے دیے گئے۔

اسی ۳۳ھ میں ابوسفیان بن حرب ۸۸ برس کی عمر میں رہ سہارا عالم آخرت ہوئے۔

مگر وہ مشورہ جو انھوں نے خلیفہ مسوم کو دے دیا تھا وہی ان کے بعد ان کی جان جاننے کا باعث ہوا۔ چنانچہ حضرت علی بن ابی طالبؑ نے اپنی سب سے پہلی ملاقات میں جو اصلاح حالت کے لیے نکالتے تھے ان سے کی تھی ان سے صاف کہہ دیا تھا کہ آپ اپنے قریب داروں کے ساتھ غیر معمولی مراعاتیں برتتے ہیں۔ ان کی غلطیوں سے چشم پوشی کرتے ہیں۔ انتہا یہ ہے کہ معاویہ بغیر آپ کی مرضی کے جو چاہتا ہے کرتا ہے اور لوگوں سے کہتا ہے کہ عثمان کا حکم ہے۔ آپ کو اس کا علم

جبکہ وہ مکہ معظمہ حج کو گئے ہوئے تھے۔ صبح سویرے سعد بن ابی وقاص کی طرف سے گزرے۔ انھیں سلام کیا مگر سعد نے جواب نہیں دیا۔ معاویہ نے اپنی خفت مٹانے کو اپنے ساتھ والوں سے کہا کہ یہ سعد ہیں، حضرت رسول کے صحابی۔ ان کا اصول ہے کہ سورج طالع ہونے تک کسی آدمی سے بات نہیں کرتے۔ سعد کو یہ خبر معلوم ہوئی۔ کہا۔ اس کی کوئی اصلیت نہیں مگر بخدا میں نے اس سے بات کرنا پسند نہ کی۔

اس نے بعد سلطنت دمشق جتنی طاقتور ہوتی گئی اتنا ہی اس نے اسلامی تمدن کے بجائے دنیا دارانہ تمدن کو فروغ دیا۔ جس کا نتیجہ یہ تھا کہ اسلامی قدر و قیمت کے معیار اور وہ اقدار ذات ختم ہو گئے، جو اسلام کے سادہ اور غرباء پر در اصول نے قائم کیے تھے۔ اس کا ایک نمونہ ہے منہجہ میں حضرت ابوذر غفاری کا سبلا وطن کیا جانا۔ ان کا ایک قصور یہ تھا کہ وہ اس سرمایہ پرستی کی مذمت کرتے تھے جو انھیں اس وقت اسلامی ملک میں نظر آ رہی تھی۔ وہ غریب مسلمانوں کو بھوکا مرنے دیکھتے تو دمشق کی گلیوں میں وہ آیتیں قرآن کی پڑھتے پھرتے تھے جو سرمایہ پرستی کے خلاف ہیں۔ وہ کہتے تھے کہ جو لوگ سونا چاندی خزانوں میں جمع کر رہے ہیں اور انھیں راہ خدا میں صرف نہیں کرتے انھیں منتظر رہنا چاہیے اس وقت کا کہ جب آتش جہنم سے ان کی پیشانیاں، ان کے پہلو اور ان کی پشتیں داغی جائیں گی۔

یہ بھی تھا کہ وہ حکومت کی خوش آمد نہیں کرتے تھے بلکہ موقع پر سچی بات کہہ گزرتے تھے۔ چنانچہ جب معاویہ نے قصر خضر کی تعمیر کی تو ابوذر سے پوچھا، کیوں اسے آپ کیسا سمجھتے ہیں؟ حضرت ابوذر نے فرمایا۔ اگر تم نے اسے خدا کے مال سے بنایا ہے تو تم نے خیانت کی اور اگر خود اپنے ذلتی مال سے بنایا ہے تو اسراف کیا۔

مزاج قیصریت اس کا متھل کب ہو سکتا تھا؟ نتیجہ یہ ہوا کہ ان کی شکایت دار السلطنت مدینہ میں بھیجی گئی اور وہاں سے ہدایت ہوئی کہ ابوذر کو مدینہ کی طرف روانہ کر دو۔

۱۔ ابوذر: الکتاب ص ۲۷ طبری ج ۵ ص ۶۶ کتاب البلدان ص ۱۵۷ طبری ج ۵ ص ۶۶

کو اندیشہ ہوا کہ اس طرح اسلام کا اصول، قدر و قیمت اور معیار عظمت جو اس نے بڑی کوشش سے دینی جہاد و شوکت کی قدر و قیمت کو قائم کیا تھا فنا ہو جائے گا۔ چنانچہ معاویہ نے پانی پینے کے پیالے سونے کے زیادہ وزن پر فروخت کیے تو ابوذر دار صحابی نے منع لیا اور کہا، ہم نے رسول اللہ سے سنا ہے کہ زیادہ وزن پر خرید منع ہے۔ معاویہ نے کہا، میرے نزدیک تو اس میں کوئی خرابی نہیں ہے۔ یہ سنکر ابوذر دائرے نے کہا۔ کیا خوب! میں تو رسول اللہ کا حکم بیان کر رہا ہوں اور تم اس پر اپنی رائے ظاہر کر رہے ہو۔ میں ایسے مقام پر جہاں تم ہو نہیں سکتے۔

علاء بن صامت (مشہور صحابی) کے ساتھ بھی سونے کی بیج و شراب کے معاملہ میں اسی طرح کا قصہ ہوا تھا اور معاویہ نے ان کو بھی یہی جواب دیا تھا کہ ہم اس کو کسی طرح برا نہیں سمجھتے۔ علاء نے کہا، میں تو رسول خدا کا حکم بیان کرتا ہوں اور تم اپنی رائے بیان کرتے ہو۔ خدا نے اس جگہ سے نکلے۔ میں اس سرزمین پر ہرگز نہ رہوں گا جس پر تم حاکم ہو۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک کشمکش دمشق کی سیاست اور پرستانہ شریعت میں اس وقت سے شروع ہو گئی تھی۔

اس کی ایک اور مثال ملاحظہ ہو۔ عبدالرحمن بن سہل انصاری تیسری خلافت کے دور میں ایک جہاد کے سلسلہ میں شام کی طرف گئے تو انھوں نے دیکھا کہ اونٹوں پر شراب کی مشکیں بھری ہوئی جا رہی ہیں۔ وہ آگے بڑھے اور انھوں نے اپنے نیزہ سے ان مشکوں کو چاک کر دیا۔ غلاموں نے مزاحمت کی اور یہ خبر معاویہ کو پہنچائی۔ انھوں نے کہا چھوڑو اس بڈھے کو، اس کی عقل جاتی رہی ہے۔ عبدالرحمن نے کہا میری عقل نہیں گئی ہے مگر رسول اللہ نے ہم کو ممانعت فرمائی ہے کہ شراب ہمارے مشکوں اور ہمارے ظروف میں داخل نہ ہو۔

انہی باتوں کا نتیجہ تھا کہ ان بن رسیدہ افراد کو جو صحابہ رسول میں محبوب ہوتے تھے معاویہ سے تنفر پیدا ہو گیا تھا۔ چنانچہ ایک دفعہ ایسا ہوا کہ معاویہ اہل شام کی ایک جماعت کے ساتھ

۱۔ سنن ابن ماجہ ج ۱ ص ۲۷ اصابع ج ۲ ص ۱۰۴۔ اسد الغابہ ج ۳ ص ۲۹۹۔

اور اس طرح اس کی ساکھ قائم ہو جاتی ہے۔ یہاں حضرت علیؑ کی یکمیت کہ منبر پر اپنی تلوار کے فروخت کا اعلان کرتے ہیں اور بتاتے ہیں کہ مجھے ایک لباس کی ضرورت ہے جو بغیر اس تلوار کے فروخت کیے ہوئے ملن نہیں ہے۔ عبدالرزاق محدث نے اس روایت کو نقل کر کے لکھا ہے کہ یہ اس حالت میں تھا کہ جب سواشام کے تمام عالم اسلام کی سلطنت آپ کے قبضہ میں تھی۔ ہر ایک شخص شخص سمجھتا تھا کہ جس کے پاس خود اپنے لباس کے لیے روپیہ نہ ہو اس کے پاس ناحق کسی دوسرے کو دینے کے لیے روپیہ کہاں ہو سکتا ہے۔

دنیا ظاہری طمطراق اور آؤ بھگت سے بھی معروب ہوتی ہے مگر یہاں یہ حالت تھی کہ جناب امیر اپنی حکومت کے زمانے میں کبھی اس کو عار نہ سمجھتے تھے کہ تیغ تدار کی دکان پر خرید و فروخت کریں۔ بازار میں قبر کو ساتھ لے کر گئے۔ اور دوپیر اس خرید کیے۔ ایک سات درہم کا اور ایک پانچ درہم کا۔ سات درہم کا پیر اس قبر کو دیا اور پانچ درہم کا خود زیب بدن کیا۔ قبر نے کہا یہ زیادہ قیمت والا آپ لیں۔ کوئی اور ہوتا اور وہ ایسا کرتا تو شاید جواب دینا کہ میں مساوات کے پھیلا نے اور غلاموں کا درجہ بلند کرنے کے لیے ایسا کرتا ہوں۔ علیؑ کا مقصد یقیناً ایسا ہی تھا لیکن اگر یہ جواب دیتے تو اس میں خود عدم مساوات کا پہلو مضمر تھا۔ سننے والے کو احساس غلامی ضرور پیدا ہو جاتا اس لیے آپ نے ایسا جواب دیا جو اپنے بچوں کو دیا جاتا ہے۔ فرمایا قبر! تم تو عمر ہو، تمھیں وہی پیر اس اچھا معلوم ہوتا ہے۔ میرا کیا میں ہی پس لوں گا۔ ان باتوں کی قدر اہل دنیا کہاں کر سکتے تھے اور ان کے دل پر ان باتوں کا اثر کہاں قائم ہو سکتا تھا۔

اس کے علاوہ اسلام نے ان تمام منفرد اشخاص اور جماعتوں کے امتیازات کو ختم کیا تھا جو اس کے پہلے برسر اقتدار تھیں۔ وہ مقتدر جماعتیں آپس میں کتنی ہی رقیبہ چشمک رکھتی ہوں لیکن اسلام سے زخم خوردہ وہ سب ہی تھیں۔ اس لیے اسلام کے حقیقی مقصد اور قائم کردہ امتیاز کے مسئلے میں وہ سب ہم آہنگ بن سکتی تھیں کیونکہ اس کے مٹانے میں ان میں سے ہر

جس میں جانبداری اور عدم مساوات پیدا ہو جائے اسلام کے اصول کے خلاف تھی اور اسلام کے سچے محافظین اس کے قریب نہ جاسکتے تھے۔ اس لیے آل رسولؐ کے لیے یہ ناممکن تھا کہ وہ خزانہ میں روپیہ جمع کر کے دولت مند بنیں اور خصوصیت سے ان لوگوں کو زرد جو اہر سے مالا مال کریں جن سے ان کو اپنے اقتدار کے قوی بنانے میں فائدہ کی امید ہو۔ یہاں تو یہ عالم تھا کہ حضرت علیؑ بن ابی طالبؑ جو کچھ بیت المال میں آتا ہے روزگار روز تقسیم کر دیتے ہیں اور پھر بیت المال میں جھاڑو دلا دیتے ہیں اور وہیں پر نماز پڑھتے ہیں کہ وہ زمین خدا کے یہاں گواہی دے کہ علیؑ نے مسلمانوں کے مال کے پہنچانے میں سختی لوگوں تک دریغ نہیں کیا۔

افسوسان سے مال آتا ہے۔ اس وقت اتفاق سے سات آدمی صاحب استحقاق موجود ہیں آپ نے تمام مال کے سات برابر حصے کر دیے اور ایک روٹی بھی اس مال میں نظر آگئی تو اس کے بھی سات ٹکڑے کر کے ہر حصہ میں ایک ٹکڑا رکھ دیا۔ ممکن ہے خیال کیا جائے کہ ایسی چھوٹی چھوٹی باتوں کا آدمی کو لحاظ نہیں کرنا چاہیے اور اس روٹی کو کسی ایک حصہ میں شامل کر دیا جاتا تو بظاہر شریعت کے مطابق کوئی جرم نہ تھا مگر یاد رکھنا چاہیے کہ ذہنیت عوام کی تشکیل ان ہی چھوٹی چھوٹی باتوں سے ہوتی ہے حضرت علیؑ بن ابی طالبؑ تو عوام کی ذہنیت اسی مساوات کے سانچے میں ڈھالنے کا کام انجام دے رہے تھے جسے رسولؐ نے سکھایا تھا اور مسلمان رسولؐ کی رحلت کے بعد اسے بھلا بیٹھے تھے۔

اس کے برخلاف امیر شام کے یہاں ان باتوں کی کوئی پروا نہ تھی۔ وہاں اپنے اقتدار کے قائم رکھنے کے لیے خزانہ کا منہ کھلا تھا اور جس کو مطلب کا سمجھا جاتا تھا اسے مالا مال کر دیا جاتا تھا۔ پھر لوگ جو امتیازات کے عادی ہو چکے تھے ان کا ساتھ دیتے یا ان کا؟

دنیا کی تو یہ حالت ہے کہ چاہے ملے ملائے کچھ نہیں لیکن اگر معلوم ہو کہ کسی کے پاس روپیہ بہت ہے اور خزانہ میں دولت جمع ہے تو یہی اس کا اثر قائم ہونے کے لیے کافی ہوتا ہے۔

نواں باب

حسن مجتبیٰ کی صلح اور اس کے نتائج

۱۰۶

انقال فرمانے سے پہلے حضرت علیؓ بن ابی طالبؓ نے ایک تحریری وصیت نامہ امام حسنؓ کے نام لکھا اور اس پر امام حسینؓ اور محمد بن حنفیہؓ اور اپنی دیگر اولاد، اعزّاء اور مخصوص اصحاب کی گواہیاں لکھوائیں اور وصیت نامہ حسن مجتبیٰؓ کو سپرد کرتے ہوئے فرمایا کہ دنیا سے رخصت ہوتے وقت تم اسے حسینؓ کے سپرد کر دینا۔ اس کے علاوہ ایک وصیت آپؐ نے حسنؓ اور حسینؓ دونوں بھائیوں سے مشترک طور پر فرمائی وہ یہ تھی کہ میں تم کو فرض شناسی کی وصیت کرتا ہوں اور یہ کہ تم کبھی دنیا کے طلب کار نہ ہونا، چاہے وہ دنیا خود تمھاری طلبگار ہو، اور کسی دنیوی نقصان پر کبھی رنجیدہ نہ ہونا اور ہمیشہ حق کے لیے زبان کھولنا اور ثواب کے لیے کام کرنا اور ظالم کے مد مقابل اور مظلوم کے مددگار رہنا۔ میں تم کو اپنی تمام اولاد اور اعزّاء اور ان لوگوں کو جن تک میرا پیغام پہنچے وصیت کرتا ہوں کہ ہمیشہ خدا سے ڈرتے رہنا اور اپنے شیرازہ کو منتشر نہ ہونے دینا اور اپنے درمیانی جھگڑوں کو صلح و شنتی کے ساتھ طے کرتے رہنا اور دیکھو قیامیوں کا خیال رکھنا، ان کی برابر خبر گیری کرتے رہنا اور پڑوسیوں کا خیال رکھنا اس لیے کہ رسول اللہؐ نے ان کے بارے میں وصیت کی تھی، اور دیکھو قرآن کا خیال رکھنا۔ تم سے بڑھ کر کوئی قرآن پر عمل کرنے والا نہ ہو، اور نماز کا خیال رکھنا، یہ تمھارے دین کا ستون ہے۔ اور اللہ کے گھر (خانہ کعبہ) کا خیال رکھنا۔ زندگی بھر اس کو کبھی اکیلا نہ چھوڑنا، اور

۱۰۶

ایک کے اقتدار رفتہ کی واپسی منحصر تھی اور پھر سابق کی شکستوں کا اثر سب ہی پر تھا اور سب ہی میں جذبہ انتقام پایا جاتا تھا۔ پھر یہ بھی کہ اسلام نے اپنے اصول سادات کی تلقین سے خود قوم عرب کا بحیثیت قوم بھی اقبیاز خاص ختم کیا تھا۔ اور پردیسیوں کے حقوق پر بڑا زور دیا تھا اور غیر عربی عناصر جو آتے تھے انھیں عربوں کے برابر حقوق دیے جاتے تھے۔ یہ بات تمام عرب ہی کے کھلنے کی تھی۔ بنی امیہ نے اپنے دور میں عربی تعصب کا مظاہرہ کر کے عربی قومیت کے امتیاز کی حمایت کی اور موالی اور اعجام کی کور دبانے کی کوشش کی چنانچہ اس دور کے امتیازی خصوصیات میں سے یہ ہے کہ عرب اور غیر عرب کا سوال پیدا ہو گیا۔ بنی امیہ کی اس سیاسی روش کا قدرتا یہ نتیجہ ہونا چاہیے تھا کہ عرب زیادہ تر بنی امیہ کے طرفدار ہوجاتے۔ بنی ہاشم اسلامی اصول کے حامی ہونے کی وجہ سے عربی قومیت کے اس جذبہ کی طرفداری نہیں کر سکتے تھے۔ اس لیے ان کا عرب کی جانبداری کا پہلو کمزور تھا۔ اس کی تصدیق اس سے ہو سکے گی کہ اس کے بعد جب بنی امیہ کے خلاف ہاشمیین یعنی بنی عباس وغیرہ نے علم بلند کیا تو ہاشمیین کا ساتھ دینے والے موالی اور عجم زیادہ تھے۔

بنی ہاشم کے قدیمی روایات اور بیاد و شرافت کے امتیاز کی وجہ سے عرب خاندانوں کو ان سے پہلے ہی حسد و عناد تھا۔ اس لیے نسلی تعصبات بھی مخالفت پر آمادہ کوتے تھے اور عرب میں قبائلی نظام بڑی قوت کے ساتھ قائم تھا۔ ہر قبیلہ کے سرگروہ اور بڑے افراد اپنے جذبات کی بنا پر جس راستے پر جاتے تھے عوام اور سپت افراد اہل قبیلہ بھی ان ہی کی پیروی کرتے تھے کیونکہ عوام کا کوئی نظریہ نہیں ہوا کرتا۔ وہ لیڈروں کے پابند ہوتے ہیں اور لیڈر زیادہ تر جذبات کے شکنجے میں قید ہوتے ہیں۔ انہی باتوں کا نتیجہ تھا کہ آل رسولؐ کے مقابلہ میں ان کے مخالفین کی تعداد زیادہ رہتی تھی۔

کو تو بظاہر اسباب ایک مرتبی باپ کی طرح اپنا فرض انجام دینا تھا جس کا نتیجہ یہ ہونا چاہیے کہ ان وصیتوں کا ہر لفظ سعادت و شہادت و شہادتوں کے دل پر نقش ہو جائے۔ یہ الفاظ ان کے کانوں میں ہمیشہ گونجتے رہیں کہ فرض شناسی کو اپنا اصول رکھنا۔ دینی جہاد و اقتدار کے کبھی طالب نہ ہونا۔ دینی نقصان کی کبھی پروا نہ کرنا۔ زبان پر سختی کو جاری رکھنا۔ ظالم کے مد مقابل رہنا اور مظلوم کے مددگار رہنا۔ چنانچہ ان تمام تعلیمات کو دونوں فرزندوں نے اپنے عمل سے مجسم شکل میں پیش کیا اور آپس میں ہم آہنگی کو بھی ہر صورت میں برقرار رکھا۔

یہ الفاظ کہ خدا کی راہ میں اپنے جان و مال اور زبان سے جہاد کرتے رہنا امر بالمعروف اور نہی عن المنکر (اچھی باتوں کی ہدایت اور بری باتوں سے حماقت) کو کبھی ترک نہ کرنا۔ ایسا نہ ہو کہ تم پر برے لوگوں کا اقتدار قائم ہو جائے۔

خصوصیت کے ساتھ ان کو عملی جامہ پہنانے کا جس طرح حسین کو موقع ملا وہ دنیا کی تاریخ میں یادگار ہے۔

حضرت علی بن ابی طالب کی وفات کے بعد تمام مسلمانوں نے متفقہ طور پر آپ کے بڑے فرزند امام حسن کی خلافت تسلیم کی۔ آپ پر اپنے والد بزرگوار کی شہادت کا بڑا اثر تھا۔ آپ نے اس موقع پر جو خطبہ ارشاد فرمایا اس میں حضرت علی بن ابی طالب کے فضائل و مناقب تفصیل کے ساتھ بیان کرتے ہوئے خاص طور پر آپ کی سیرت اور ترک دنیا کا تذکرہ کیا اور اس ذکر میں گریہ آپ کے گلو گریہ ہوا اور تمام حاضرین بھی آپ کے ساتھ بے اختیار رونے لگے۔ پھر آپ نے اپنے ذاتی اور عائلی فضائل بیان کیے۔ اس کے بعد عبداللہ بن عباس نے کھڑے ہو کر لوگوں کو آپ کی بیعت کرنے کی طرف دعوت دی۔ اور سب نے برفضا و رغبت آپ کی بیعت کی۔ یہ جمعہ کے دن ۲۱ ماہ رمضان شہمہ کا واقعہ ہے۔ آپ نے اسی وقت لوگوں سے صاف صاف یہ قول و قرار لے لیا تھا کہ اگر میں صلح کروں تو تم کو صلح کرنا ہوگی اور اگر میں جنگ کروں تو تمہیں میرے ساتھ مل کر جنگ کرنا ہوگی۔ اس کے بعد آپ ملک کے بندوبست کی

دیکھو خدا کی راہ میں اپنے جان و مال اور زبان سے جہاد کرتے رہنا، اور آپس میں صلہ رحم رکھنا، اور ایک دوسرے کے ساتھ فیاضی کے ساتھ پیش آنا اور دیکھو کبھی خلق خدا کو نیک اعمال کی ترغیب دینے اور بد اعمالیوں سے روکنے سے باز نہ آتا کہ تم پر برے لوگوں کا اقتدار قائم نہ ہونے پائے۔ اور دیکھو میرے بعد ایسا نہ ہونے پائے کہ بنی ہاشم مسلمانوں میں میرے خون کے بہانے سے خونریزی شروع کر دیں۔ زیادہ سے زیادہ میرے خون کے قصاص کے طور پر سیرے قاتل کو قتل کیا جاسکتا ہے۔ اور وہ بھی اس طرح کہ اس کو ایک ضربت کی پاداش میں بس ایک ہی ضربت لگائی جائے اور اس کو ہرگز مشد نہ کیا جائے۔ یعنی اعضاء و جوارح قطع نہ کیے جائیں۔ اس لیے کہ رسول اللہ فرماتے ہیں کہ خبردار کسی کو مشد نہ کرو چاہے وہ کاٹنے والا کتا ہی کیوں نہ ہو۔ نفسیات کے واقفکار خوب جانتے ہیں کہ کچھ وہ حالات ہوتے ہیں جن میں بات تھکر کی لکیر کی طرح سننے والے کے دل پر چم جاتی ہے۔ یہ صوابیت کہ ایک بزرگ مرتبہ واجب الاطاعت باپ بہتر بیماری پر ہے۔ اس کی رحلت کا منہ کام قریب ہے اور اس وقت وہ اپنے تمام اہل بیت میں سے دو ایک سعید فرزندوں کو خصوصیت کے ساتھ بلا کر کوئی خاص بات کہتا ہے۔ یقیناً اس وقت کی کہی ہوئی بات ان فرزندوں کے دل و دماغ پر ایسا اثر کرے گی جیسا کسی دوسرے صبر و سکون کے لمحوں کی بات اثر نہیں کر سکتی۔

عام دنیا سے جانے والے باپ اس وقت اپنی اولاد سے وصیت اپنے گھر کے نجی معاملات کے متعلق کرتے ہیں مگر آل محمد تو دین و شریعت، کتاب اور سنت کو اپنے ذاتیات میں داخل سمجھتے تھے۔ انھوں نے اس وقت پر جو وصیتیں کی ہیں وہ سراسر مفاد عامہ مفاد شریعت اور احکام الہی سے متعلق تھیں۔

یوں تو یہ فرزند وہ تھے جو خود صحیح اور مناسب ہی کام کرتے مگر حضرت علی بن ابی طالب

۱۔ نہج البلاغہ ج ۲ ص ۴۹-۴۸۔ طبری اور ابوالفرج اصفہانی نے ان میں سے اکثر فقرات کو امام حسن کے نام کے تحریری وصیت نامہ میں درج کیا ہے۔ متقابل الطالبتین ص ۷۲۔ ۷۳۔ طبری ج ۲ ص ۴۹۔ نہج البلاغہ ج ۲ ص ۴۹۔

طرف متوجہ ہوئے۔ اطراف میں عامل مقرر کیے حکام معین کیے اور مقدمات کے فیصلے کرنے لگے۔ ابھی ملک حضرت علیؑ کے غم میں سوگوار ہی تھا اور حضرت امام حسنؑ پورے طور پر انتظامات بھی نہ کر چکے تھے کہ معاویہ کی طرف سے آپ کی مملکت میں در اندازی شروع ہو گئی اور ان کے خفیہ کارکن ریشہ در انیاں کرنے لگے۔ چنانچہ ایک شخص قبیلہ حمیر کا کوفہ میں اور ایک شخص بنی قین میں سے بصرہ میں کھڑے کیا۔ یہ دونوں اس مقصد سے آئے تھے کہ یہاں کے حالات سے دمشق میں اطلاع دیں اور فضا کو امام حسنؑ کے خلاف ناخوشگوار بنائیں۔ غنیمت ہے کہ اسکا انکشاف ہو گیا۔ حمیر والا آدمی کوفہ میں ایک قضائی کے گھر سے اور قین والا آدمی بصرہ میں بنی سلیم کے یہاں سے گرفتار کیا گیا اور دونوں کو جرم کی منادی گئی۔ اس واقعہ کے بعد حضرت امام حسنؑ نے معاویہ کو ایک خط لکھا جس کا مضمون یہ تھا کہ تم اپنی در اندازیوں سے باز نہیں آتے ہو۔ تم نے لوگ بھیجے ہیں کہ میرے ملک میں بغاوت پیدا کر میں اور اپنے جاسوس یہاں بھیلادے ہیں معلوم ہوتا ہے کہ تم جنگ کے خواہشمند ہو۔ ایسا ہے تو پھر تیار رہو۔ یہ منزل کچھ دور نہیں ہے نیز مجھ کو خبر معلوم ہوئی ہے کہ تم نے میرے باپ کی وفات پر طعن و تشنیع کے الفاظ کہے۔ یہ ہرگز کسی ذی ہوش آدمی کا کام نہیں ہے۔ موت سب کے لیے ہے۔ آج ہیں اس حادثہ سے دوچار ہونا پڑا تو کل تمہیں ہوگا، اور حقیقت یہ ہے کہ ہم اپنے مرنے والے کو مرنے والا سمجھتے نہیں۔ وہ تو ایسا ہے جیسے کوئی ایک مکان میں مستقل ہو کر اپنے دوسرے مکان میں جائے اور آرام کی نیند سوئے۔ اس خط کے بعد معاویہ اور امام حسنؑ کے درمیان بہت سے خطوط کی رد و بدل ہوئی۔ بہر حال ان واقعات سے یہ امر بالکل ظاہر ہو گیا کہ امیر شام معاویہ کو جناب امیر کی ذات سے کوئی وقتی عداوت نہ تھی ورنہ وہ ان کی شہادت کے ساتھ ختم ہو جاتی بلکہ یہ آل رسولؐ سے ایک مستقل دشمنی ہے جس کے نتائج آئندہ دیکھے کیا ہوں۔ یہ بھی اس واقعہ سے ثابت ہو گیا کہ ملک میں دشمن کے جاسوسوں اور مخبروں کے لیے جائے پناہ

موجود ہے اور اگر دو ایک واقعات کا انکشاف ہوا اور دوا دی گرفتار ہو گئے تو یہ یقین نہیں کیا جا سکتا کہ ایسے ہی کچھ دوسرے لوگ موجود نہیں ہیں جن کا انکشاف نہیں ہو سکا ہے اور جنہیں کافی کام کرنے کا موقع مل رہا ہے۔ بہر حال امام حسنؑ دشمن کے مقابلہ کے لیے تیار تھے اور حق کے بارے میں اس کے ساتھ کوئی مراعات کرنے پر آمادہ نہ تھے۔ بیشک آپ کو اور آپ کے ساتھ حسینؑ کو اپنے ملک کی فضا کی طرف سے بے اطمینانی ضرور تھی۔ اس لیے کہ خوارج کے نذر کے بعد سے خود اہل کوفہ میں بھڑک چکی تھی اور بہت سے لوگ ایسے بھی تھے جو بظاہر حضرت علیؑ کی فوج میں شامل تھے مگر قربت، دوستی یا کسی اور وجہ سے خوارج کے ساتھ ہمدردی رکھتے تھے۔ حضرت امیرؑ کو خود ان لوگوں کی شورش پسندی، اختلاف رائے اور نظم کی کمی سے اتنی تکلیف اور پریشانی تھی کہ آپ موت کے آرزو مند تھے۔ تمام کتب تاریخ اور بالخصوص نہج البلاغہ میں وہ خطبے آپ کے درج ہیں جو آپ کی کسیدہ خاطری بلکہ روحانی تکلیف کے مظہر ہیں۔ آپ نے ان کو مخاطب کر کے بھی فرمایا کہ تم نے میرا دل پیپ سے بھر دیا اور میرے سینہ کو غم و غصہ سے پُر کر دیا۔ کبھی فرمایا کہ کاش معاویہ میرے ساتھ اپنی جماعت کا تمہاری جماعت سے تبادلہ کر لیتا۔ اس طرح جیسے سونے کے سکے کا تبادلہ چاندی کے سکے سے ہوتا ہے۔ یعنی تم میں دس لے لیتا اور اپنی میں کا ایک مجھے دے دیتا۔ کبھی فرمایا، کتنے افسوس کی بات ہے کہ اہل شام باطل راستے پر متفق ہیں اور تم علیؑ راستے پر ہو کہ باہم تعاون نہیں رکھتے۔ اہل شام اپنے حاکم کی اطاعت کرتے ہیں در انیہ کہ وہ خدا کی نافرمانی کرتا ہے اور تم اپنے امام کا کنا نہیں ماننے والا علیہ کہ وہ خدا کی اطاعت کرتا ہے اور کبھی فرمایا کہ تم لوگوں کا جانا ہے کہ جہاد کے لیے چلو جاؤ گے زمانہ میں تو تم کہتے ہو کہ یہ کڑا کاہنہ ہے میں اتنی جہالت نیچے کہ یہ سردی کم ہو جائے اور جب تم سے کہا جاتا ہے گرمی کے زمانہ میں تو کہتے ہو کہ یہ تو ترانے کی گرمی ہے۔ اتنی جہالت دیجیے کہ یہ گرمی کم ہو جائے۔ افسوس! تم گرمی اور سردی سے اتنا بھاگتے ہو تو تواریکی کچھ

۱۔ الاخبار الطوال ص ۱۷۲۔ نہج البلاغہ ج ۱ ص ۱۷۲۔ ۲۔ ارشاد مکتبہ ۱۷۲۔ نہج البلاغہ ج ۱ ص ۱۷۲۔ ۳۔ ارشاد مکتبہ ۱۷۲۔

۱۔ نہج البلاغہ ج ۱ ص ۱۷۲۔ ۲۔ ارشاد مکتبہ ۱۷۲۔ نہج البلاغہ ج ۱ ص ۱۷۲۔ ۳۔ ارشاد مکتبہ ۱۷۲۔

سے اور زیادہ بھاگو گئے۔

بھی وہ جماعت تھی کہ جس سے اب امام حسنؑ کو سابقہ پڑا تھا۔ آپ ان لوگوں کی حالتوں سے
اچھی طرح واقف تھے اور یقیناً امیر شام کو بھی اپنے جاسوسوں کے ذریعے سے یہاں کے حالات کا
علم ہو گیا ہوگا اور وہ یہ بھی سمجھتے ہوں گے کہ امیر المومنین حضرت علیؑ کی جو ہیبت تمام عرب کے
قلوب پر چھائی ہوئی تھی وہ بالکل اسی درجہ پر حضرت حسنؑ کے لیے ابھی حاصل نہیں ہو سکتی اس
لیے انھیں ہیبت ہوئی کہ وہ یکایک عراق پر حملہ کر دیں۔ چنانچہ وہ اپنی فوجوں کو لے کر جسر بنج تک
پہنچ گئے۔ اب امام حسنؑ نے بھی مدافعت کے انتظامات شروع کیے اور حجر بن عدی کو بھیجا کہ وہ
دورہ کر کے تمام مقامات کے عاملوں کو صورت حال کا مقابلہ کرنے پر آمادہ کریں اور لوگوں کو
جہاد کے لیے تیار کریں۔ مگر اندازہ کے بالکل مطابق یہ افسوسناک صورت سامنے آئی کہ لوگوں نے
حجر بن عدی کی کوشش کا گرہ بخشی کے ساتھ استقبال نہیں کیا۔ عام طور پر جمود اور سردمہری سے
کام لیا گیا۔ کچھ تھوڑی سی جمعیت مقابلہ کے لیے تیار ہوئی تھی تو اس میں کچھ حصہ خوارج کا تھا جو
کسی نہ کسی حید سے معاویہ سے جنگ کرنا ہی چاہتے تھے۔ کچھ شورش پسند اور مال غنیمت کے
طلبکار اور کچھ لوگ صرف اپنے سرداران قبائل کے دباؤ سے بادلِ ناخواستہ ساتھ ہو گئے تھے۔
جنھیں فرض کے احساس سے کوئی واسطہ نہ تھا۔ تھوڑے لوگ وہ ہوں گے جو واقعی حضرت
علیؑ اور امام حسنؑ کے شیعہ سمجھے جاسکتے ہیں۔ بہر حال حضرت امام حسنؑ نے قیس بن سعد بن عباد
انصاری کو بیس ہزار کی فوج کے ساتھ آگے روانہ کیا اور خود مقام دیر کعب کے قریب ساہنا
میں جا کے قیام کیا۔ یہاں پہنچ کر نمایاں طور سے آپ کو اپنے ساتھیوں کی سردمہری کا مشاہدہ ہوا۔
آپ نے ان لوگوں کو جمع کر کے خطبہ ارشاد فرمایا جس کا مضمون یہ تھا کہ ”دیکھو میں تمام خلق سے
زیادہ خلقِ خدا کا ہی خواہ ہوں اور مجھے کسی مسلمان سے کینہ نہیں۔ آگاہ ہونا چاہیے کہ اتفاق و
اتحاد چاہے تمھیں ناپسند ہو اختلاف و افتراق سے بہتر ہے چاہے وہ تمھیں کتنا ہی پسند ہو

یاد رکھو کہ میں تمہارے فائدے کے لیے تم سے بہتر سوچنے کا حق رکھتا ہوں۔ تم کو لازم ہے کہ میری رائے سے انحراف اور میرے حکم کی مخالفت نہ کرو۔ آپ کی تقریر کا ختم ہونا تھا کہ مجمع میں بنیٰ علی پیدا ہو گئی اور خوارج نے پکار پکار کر کہنا شروع کیا کہ یہ کافر ہو گئے۔ کچھ لوگوں نے آپ پر حملہ کر کے آپ کے قدموں کے نیچے سے مصلّا کھینچ لیا اور دوش مبارک پر سے چادر بھی اتار لی۔ آپ فوراً گھوڑے پر سوار ہو گئے اور آواز بلند سے پکارا کہ کہاں ہیں ربیعہ اور ہمدان۔ یہ دونوں قبیلے ادھر ادھر سے دوڑ پڑے اور شور و شہسودوں کو آپ سے دور کیا۔

ابن جریر کی روایت یہ ہے کہ کسی نے خبر اڑادی کہ قیس بن سعد قتل ہو گئے، بس اس پر یہ غدار مچ گیا اور وہ خیمہ جس میں امام حسن کا قیم تھا لوٹ لیا گیا۔ یہاں تک کہ جن بھجھو نے پر آپ تھے اسے آپ کے نیچے سے کھینچ لیا گیا۔

اس کے بعد آپ مدائن کی طرف روانہ ہو گئے مگر وہاں پہنچے پر جراح بن قبیصہ اسدی نے جو انہی خوارج میں سے تھا کمینگاہ میں چھپ کر خنجر سے حملہ کر دیا جس سے آپ زخمی ہو گئے عرصہ تک مدائن میں علاج کے بعد آپ اچھے ہوئے اور پھر معادیہ سے مقابلہ کی تیاری کی۔ معادیہ نے آپ کے پاس پیغام بھیجا کہ آپ جن شرائط پر چاہیں میں صلح کرنے پر تیار ہوں اور اس کے ساتھ آپ کی فوج کے ان سرداروں کے خطوط بھی روانہ کر دیے جنہوں نے خفیہ طریقہ پر معادیہ سے ساز باز کرنا چاہی تھی اور دعوت دی تھی کہ آپ آئیے تو ہم حسن کو گرفتار کر کے آپ کے سپرد کر دیں گے یا ان کو قتل کر ڈالیں گے۔

امام حسنؑ پہلے ہی اپنے ساتھیوں کی غداری سے واقف تھے اور اس لیے جنگ کو مناسب وقت خیال نہیں کرتے تھے لیکن یہ ضرور چاہتے تھے کہ کوئی صورت ایسی پیدا ہو کہ باطل کی حمایت کا دھبہ بھی میرے دامن پر نہ آنے پائے۔ اس خاندان کے لوگوں کو حکومت و اقتدار کی توہمیں کبھی رہی نہیں، انھیں تو مطلب اس سے تھا کہ مخلوق خدا کی بہتری ہو اور حدود و حقوق الہی کا

راحت و آرام یا کسی دوسرے شخص کی مفاد کی قربانی بھی کر دینا پڑے مگر یہ خیال ضروری ہے کہ اس صلح کے اندر کوئی ایسا اصول پایا نہ ہونے پائے جس کا محفوظ رکھنا بہر حال اپنا مقدس فریضہ ہے۔ یہی نمونہ حسین نے اپنے نانا سے دیکھا تھا، یہی ان کو اپنے باپ کے ہاں نظر آیا اور یہی اب ان کو اپنے واجب الطاعت بھائی امام حسن کی جانب سے پیش نظر تھا۔

ایک بات ضمنی طور پر اردو بارہ سائے آگئی۔ وہ یہ کہ سچائی کے راستے میں اگر تمام حجت کی ضرورت ہو تو دوست نہیں بلکہ دشمن کے بھی اقرار پر بھروسہ کر لینا چاہیے۔

اس صلح نامہ کے مکمل شرائط جو علامہ ابن حجر مکی نے درج کیے ہیں حسب ذیل ہیں:-

۱۔ یہ کہ معاویہ حکومت اسلام میں کتاب خدا اور سنت رسولؐ اور صحیح راستے پر چلنے والے خلفائے راشدین کے طریقہ پر عمل کریں گے۔

۲۔ یہ کہ معاویہ کو اپنے بعد کسی خلیفہ کے نامزد کرنے کا حق نہ ہوگا۔

۳۔ یہ کہ شام و عراق و حجاز و یمن سب جگہ کے لوگوں کے لیے امان ہوگی۔

۴۔ یہ کہ حضرت علیؑ کے اصحاب اور شیعہ جہاں بھی رہیں ان کے جان و مال اور ناموس و اولاد محفوظ رہیں گے۔

۵۔ یہ کہ معاویہ حسن بن علیؑ اور ان کے بھائی حسینؑ اور کسی کو بھی خازن رسولؐ میں کوئی نقصان پہنچانے یا ان کی جان لینے کی کوشش نہ کریں گے۔ نہ خفیہ طریقہ پر اور نہ علانیہ اور ان میں سے کسی کو کسی جگہ دھمکا یا ڈرایا اور دہشت میں مبتلا نہیں کیا جائیگا۔

یہ معاہدہ ربیع الاول یا جمادی الاولیٰ ۳۵ھ کو عمل میں آیا۔

اگر غور کیا جائے تو اس صلح کے ذریعہ سے حضرت امام حسنؑ نے وہ مقصد حاصل کر لیا تھا جس کے لیے ان کی اپنے فریق مخالفت سے منازعت تھی۔

۱۔ معاویہ نے اس صلح کے خلاف اس شرط کے آخری جز ۲ ذکر نہیں ہے۔

۲۔ اس شرط کے ثبوت کے لیے ملاحظہ ہو طبری ج ۶ ص ۹۷۔

اقرار ہو۔ اب معاویہ نے جو آپ سے منہ مانگے شرائط پر صلح کرنے کی آمادگی ظاہر کی تو آپ نے اپنے نانا اور باپ کی دیکھی ہوئی سیرت کے مطابق مصالحت کے بڑھتے ہوئے ہاتھ کو نام واپس نہیں کیا۔ آپ نے صلح کے شرائط مرتب کر کے معاویہ کے پاس روانہ کیے۔ وہ تمام شرائط جن سے قانونی طور پر آئین و شریعت کا تحفظ ہو جاتا ہے۔ چنانچہ صلح کی دستاویز مکمل ہوئی اور جنگ کا خاتمہ ہو گیا۔ حضرت امام حسینؑ اپنے باپ کی وفات کے بعد اپنے بڑے بھائی حضرت امام حسنؑ کے ساتھ ان سرد و گرم حالات کا برابر مطالعہ کر رہے تھے۔ انھوں نے ان واقعات پر کبھی ایک غیر متعلق انسان کی طرح نظر نہیں ڈالی بلکہ وہ اس کو اپنی سرگزشت سمجھتے تھے اور جانتے تھے کہ ہمیں اسی حال پر مستقبل کی عمارت کو بلند کرنا ہے۔ اس وقت کے واقعات کا یہ پہلو بہت اہم تھا کہ ساتھیوں کی کثرت اور جمعیت پر اعتماد کا خیال کلیتہً دور از کار ہے حسینؑ اپنے والد بزرگوار کے ساتھ ایک دفعہ ان ساتھیوں کے عمل کو دیکھ چکے تھے کہ وہ ان کے سامنے تلواریں کھینچ کر آئے اور اب اپنے بڑے بھائی کے ساتھ ساتھیوں کے طرز عمل کو دیکھ لیا کہ خود اپنی فوج کے ہاتھوں کس طرح ان کے بھائی کی جان خطر میں پڑ گئی تھی ممکن ہے کسی وجہ سے اس وقت حسینؑ اپنے بڑے بھائی کے پاس موجود نہ ہوں اور ایسا ہی معلوم ہوتا ہے۔ اس لیے کہ اس سخت اور ناگوار موقع پر کوئی تذکرہ امام حسین علیہ السلام کا نظر نہیں آتا مگر انھوں نے یقیناً ان حالات کو درمندانہ طریقہ پر سنا اور اس زخم کو دیکھا ہوگا جو ان کے بھائی کے جسم پر خود اپنے ساتھ والوں میں سے کسی کے ہاتھ سے آگیا تھا اور اس کا اثر ان کے حساس دل پر جتنا بھی ہوا ہو وہ کم ہے اس کے علاوہ آپ اپنے اپنے بزرگوں کی سیرت میں ایک دفعہ یہ نمونہ اور دیکھ لیا کہ امن عالم کے لیے نقطہ اول صلح و سلامتی ہے۔ جنگ کا درجہ صلح کے بعد ہے اور صلح کے امکانات پیدا ہونے تک ہے اس لیے صلح کے خیال کو جنگ کے پہلے اور جنگ کے دوران میں ہمیشہ پیش نظر رکھنا چاہیے۔ دشمن سے صلح کی گفتگو کو کبھی اپنی خود داری کے خلاف نہ سمجھو چاہیے۔ ۲۱۔ معترض بھی ہوں اور چاہیے اس کے لیے تمہیں اپنے جہاد و اقتدار

اور جمعہ کے خطبہ کے بعد یہ اعلان کر دیا کہ میرا مقصد جنگ سے یہ نہ تھا کہ تم لوگ نماز پڑھنے لگو۔ روزے رکھنے لگو، حج کرو یا زکوٰۃ ادا کرو۔ یہ سب تو تم کرتے ہی ہو۔ میرا تو مقصد جنگ سے فقط یہ تھا کہ میری حکومت تم پر مستحکم ہو جائے۔ وہ حسن کے اس معاہدہ کے بعد مکمل ہو گئی، اور بادجو تم لوگوں کی ناگواری کے خدانے مجھے اس مطلب میں کامیاب کر دیا۔ رہ گئے وہ شرائط جو میں نے حسن کے ساتھ کیے ہیں وہ سب میرے پیروں کے نیچے ہیں اور ان کا پورا کرنا یا نہ کرنا میرے ہاتھ کی بات ہے۔ جمع میں ایک سناٹا چھایا ہوا تھا مگر اب کس میں دم تھا کہ وہ اس کے خلاف نباں کٹائی کرتا۔ اقتدار شاہی کی جرات اس نقطہ تک پہنچی کہ کوفہ میں امام حسن اور امام حسین کی موجودگی میں معاویہ نے حضرت امیر اور امام حسن کی شان میں نامناسب کلمات استعمال کیے۔ اس پر سکوت کرنا اعتراض و اقرار کا مراد سمجھا جاسکتا تھا۔ اس لیے فوراً امام حسین جواب دینے کے لیے کھڑے ہو گئے مگر حضرت امام حسن نے آپ کو بٹھادیا اور خود کھڑے ہو کر نہایت مختصر اور جامع الفاظ میں امیر شام کی تقریر کا جواب دیا۔ حسین جلتے تو پہلے ہی تھے مگر اس دقت سے محسوس کر لیا تھا کہ حالات کی رفتار کیا ہے اور ہم کو اس کا آخری مقابلہ کس طرح کرنا ہوگا۔ مگر وہ جلد باز انسان نہ تھے، نہ وہ ذہن داروں کے محل سے نادانقت تھے۔ انھیں صبر آزمائی انتظار کے ساتھ حالات کی تدریجی رفتار کے دوش بدوش اپنے کردار کی منزل کو آئے بڑھانا تھا اور اس کے پہلے ایک فرض شناس انسان کی طرح اپنے بھائی کے ساتھ وقت کی موجودہ آگن مگر پُر اضطراب خاموشی میں غرق رہنا تھا۔

حضرت امام حسن نے امور سلطنت سے آزارہ کشی اختیار کرنے کے بعد کوفہ کا قیام ترک کر کے پھر سے مدینہ میں جا کر سکونت اختیار فرمائی تو حسین نے بھی بھائی کے ساتھ دیا اور مدینہ میں جا کر قیام فرمایا۔ مگر اس اتحاد عمل کے باوجود بھی بنی امیہ نے یہ غلط شہرت دی کہ اس صلح کے بارے میں حضرت امام حسن اور امام حسین دونوں بھائیوں کی ایک جہتی میں واقعی کوئی

۱۹۶۷ء ارشاد ۱۹۶۷ء ارشاد

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ یہ حضرات ذاتی اغراض کے لیے کسی سے خاصیت نہیں رکھتے تھے۔ انکی لڑائی جو کچھ تھی وہ اصول شریعت و مذہب کے لیے حضرت امام حسن نے صلحنامہ کی پہلی شرط کے لحاظ سے امیر شام کو پابند بنا دیا کہ وہ کتاب و سنت کے مطابق عمل کریں۔ اس سے آپ نے ایک طرف تو یہ بات ہمیشہ کے لیے مسلم بنادی کہ اصول شریعت اور ہے آئین حکومت اور ہے۔ یہ وہ بڑی چیز تھی جس کے لیے آل محمد برابر کوشاں رہے تھے یعنی کبھی ایسا نہ ہو کہ حکام اسلام کا طرز عمل عین شریعت سمجھ لیا جائے۔ دوسرا امر یہ بھی آپ نے ثابت کر دیا بلکہ فریقِ مخالفت سے تسلیم کر لیا کہ اب تک جو کچھ حکومت شام کا رتبہ رہا ہے وہ کتاب و سنت کے مطابق نہیں ہے کیونکہ ہر شخص جانتا ہے کہ صلحنامہ کی بنیادی چیزیں وہی ہوتی ہیں جو دو فریقوں میں بنائے خاصیت ہوں۔ اگر حکومت شام کا سابقہ طرز عمل اب تک برابر کتاب و سنت کے مطابق ہوتا تو اس شرط کی ضرورت کیا تھی۔ اس کے بعد دوسری اہم شرط یہ قرار دی کہ ان کو اپنے بعد کسی کو نامزد کرنے کا حق نہ ہوگا۔ اس طرح آپ نے مستقبل کا تحفظ کیا کیونکہ یہ ممکن تھا کہ معاویہ اپنی زندگی بھر کتاب و سنت کے مطابق عمل کرتے لیکن بعد میں کوئی ایسا آتا ہو اس کے خلاف کرتا۔ اس لیے آپ نے آئندہ کے لیے جائیں بنانے کے حق کو سلب کر لیا۔

بہر حال صلح ہو گئی۔ فوجیں واپس چلی گئیں اور معاویہ کی گرفت تمام ممالک اسلامیہ پر مضبوط ہو گئی اور اب شام و مصر کے ساتھ عراق و حجاز، یمن اور ایران وغیرہ بھی ان کے تصرف میں آ گئے۔ حضرت امام حسن کو اس صلح کے بعد اپنے ساتھ کے بہت سے لوگوں کی طرف سے انتہائی دلخراش اور توہین آمیز الفاظ سنا پڑے جن کا برداشت کرنا انہی کا کام تھا۔ بعض لوگ ایسے ہو کر تک "امیر المؤمنین" کہہ کے تسلیم بجالاتے تھے آج "مُتَدَلِّ المؤمنین" یعنی "مؤمنین کی جماعت کو ذلیل کرنے والے" کے الفاظ سے سلام کرتے تھے مگر امام حسن نے صبر و استقلال اور نفس کی بلندی کے ساتھ ان تمام ناگوار باتوں کو برداشت کیا اور معاہدہ پر سختی کے ساتھ قائم رہے لیکن معاویہ نے جنگ کے ختم اور سیاسی اقتدار کے قائم ہونے ہی عراق میں داخل ہو کر نخلہ پر جسے کوفہ کی سرحد سمجھا جاتا ہے قیام کیا

قول و قرار ہو چکا۔ اسی طرح علی بن محمد بن بشیر سہلانی کا بیان ہے کہ میں سفیان بن ابی یعلیٰ کی معیت میں مدینہ پہنچا اور امام حسنؑ کے پاس ملنے گیا۔ آپ کے پاس اس وقت مسیب بن نجبه، عبداللہ بن دناک، یمتیہ اور سراج بن مالک خثعمی موجود تھے۔ میں نے کہا۔ السلام علیک یا مذلّ المؤمنین۔ سلام ہو آپ کو اے مومنین کو ذلیل کرنے والے، آپ نے فرمایا وعلیک السلام۔ بیٹھو۔ میں مومنین کی ذلت کا باعث نہیں ہوں۔ میں نے تو ان کی عزت رکھی اور ان کو خو ریزی سے بچا لیا۔ میں دیکھ رہا تھا کہ اب جنگ کا جوش اور دلولہ باقی نہیں ہے اور کمزوری نمایاں ہے۔ میں دیکھ رہا تھا کہ اگر جنگ جاری رکھی گئی تب بھی ایک دن یہی ہونا ہے کہ معاویہ کی بادشاہت قائم ہو جائے۔ اب یہ لوگ حضرت کے پاس سے اٹھ کر امام حسینؑ کے پاس گئے اور پوری گفتگو حضرت امام حسنؑ کی بیان کی۔ آپ نے فرمایا سچ کہا ابو محمد (حضرت حسنؑ) نے تمہیں لازم ہے کہ ہر شخص تم میں سے خاموش ہو کر گھر میں بیٹھ جائے اور بیٹھا رہے اس وقت تک کہ جب تک یہ شخص (معاویہ) زندہ ہے۔“

یہ آخری فقرہ درحقیقت بڑا درد رس تھا۔ آپ سمجھتے تھے کہ معاہدہ کی پابندی نہیں ہوگی اور آپ جانتے تھے کہ یہ معاہدہ موت کی آخری ہچکی اس وقت لے گا جب معاویہ دنیا سے جانے لگیں گے اور اپنے بعد جانشین نامزد کر جائیں گے۔ وہ وقت ہوگا جب ہماری جانب سے کوئی دوسرا اقدام کیا جائے۔ آئندہ چل کر دنیا کو حسینؑ کے تدبیر کی داد دینا پڑے گی جنھوں نے بیس برس پہلے یعنی ۱۰ھ کے آئینہ میں سترہ کی تصویر اپنی آنکھ سے دیکھ لی اور حسینؑ کی پیش بینی آئینہ چل کر حرف بحرف پوری ہو کر رہی۔

اس معاہدہ کے بعد اب بنی امیہ کی قوت بہت مستحکم ہو گئی تھی۔ ان کے راستے میں جو ایک خرنشہ تھا وہ بالکل دور ہو گیا تھا۔ اور انھیں اپنی اسکیم کے پورا کرنے کا پورا موقع مل گیا تھا۔ چنانچہ جتنی شرطیں ہوتی تھیں سب کی مخالفت کی گئی اور کسی ایک پر بھی عمل نہ ہوا۔

فرق آجائے مگر ان کے تمام توقعات بالکل غلط ثابت ہوئے۔

حسینؑ قول عمل اور مسلک میں اپنے بھائی امام حسنؑ کے ساتھ بالکل متحد رہے اور ہمیشہ رہے۔ آپ کو معلوم تھا کہ امام حسنؑ نے اگر یہ تمام حجت کے لیے خاموشی اور گوشہ نشینی اختیار کر لی ہے مگر خیال ان کا بھی یہی ہے کہ آخر میں پھر تلوار درمیان میں آئے گی اور آخری فیصلہ بغیر ایک سخت اور مشکل اقدام کے نہ ہو سکے گا اور وہ اس کے لیے تیار بھی ہیں بشرطیکہ حالات کی تدریجی رفتار انہی کے دور حیات میں اس آخری نقطہ تک پہنچ جائے۔ جو اس آخری اقدام کے لیے ضروری ہے۔ امام حسنؑ اکثر یہ اشعار بطور تشیل پڑھا کرتے تھے۔

من عاذ بالسيف لاقى فرصة عجا
موتا على عجل او عاش منتصفا
لا تركوا السهل ان السهل مضى
لن تتركوا المجد حتى تركوا عنفا

”جو تلوار کو اپنا پشت پناہ بنائے وہ عجیب سکون و اطمینان حاصل کر لے گا یا دنیا سے جلد ہی گزیر جائے اور یا زندگی ایسی جو داد رسی کے ساتھ ہو۔ کبھی سہولت پسندی سے کام نہ لو۔ سہولت پسندی بڑی بڑی خرابی کی بات ہے۔ عزت حاصل کر ہی نہیں سکتے جب تک کہ دشوار گزار منزل کو طے نہ کر دو۔“

رہ گئے موجودہ حالات ان کے لحاظ سے امام حسینؑ بھی اس صلح سے متفق تھے چنانچہ بردابیت دینوی جب تخر بن عدی اور عبیدہ بن عمرو جو صلح کے معاملہ میں اختلاف رکھتے تھے امام حسینؑ کے پاس آئے اور کہا، آپ لوگوں نے عزت کے بدلے میں ذلت کو خرید لیا۔ کم حقوق حاصل کر کے بہت سے حقوق سے دست کشی کر لی۔ اچھا اب آپ بذات خود آج ہماری ایک بات مان لیجیے۔ کچھ بھی کوئی بات نہ مانے گا۔ وہ یہ ہے کہ آپ حضرت امام حسنؑ کو تو اس صلح کے راستے پر جو انھوں نے اختیار کیا ہے چھوڑ دیجیے لیکن آپ اپنے ساتھیوں کو جو کوفہ میں ہیں یا کوفہ کے باہر جمع کیجیے اور ہم دونوں کو مقدمہ بجائیں یا انسرینا دیجیے۔ پھر دیکھیے گا کہ معاویہ کو خبر بھی نہ ہوگی اور ہم اپنا تلواریں اارتے ہوئے نظر آئیں گے۔ حضرت امام حسینؑ نے فرمایا، یہ نہیں ہو سکتا۔ ہم عہد کر چکے اور

اتفاق کا مرکز اور دشمنان اسلام کا سردار مجھے ڈرانا چاہتا ہے؟ حالانکہ میرے اور اس کے درمیان رسول اللہ کے چچا زاد بھائی (ابن عباس) اور حسن بن علیؑ نوے ہزار اپنے شیعوں کی فوج لیے ہوئے موجود ہیں۔ خدا کی قسم اگر اس نے ادھر کا رخ کیا تو وہ دیکھے گا کہ میں تلوار لیے ہوئے سامنے موجود ہوں گا اور بڑی شدید جنگ کروں گا۔ معاویہ کو معلوم ہو گیا کہ اس شخص کو دھمکیوں سے متاثر نہیں کیا جاسکتا۔ جب امام حسنؑ نے صلح فرمائی اور معاویہ کی سلطنت مضبوط ہو گئی تو زیادؓ آخر میں قلعہ بند ہو گیا۔

معاویہ نے اسے امان نامہ لکھا کہ تم میرے پاس آ جاؤ۔ جو کچھ تم کو گے وہ میں تمہیں دے دوں گا۔ چنانچہ زیادؓ معاویہ کے پاس آیا اور معاویہ کی بارگاہ میں اس کا رسوخ بڑھتا چلا گیا۔ یہاں تک کہ مکہ میں معاویہ نے اسے اپنا بھائی ظاہر کیا۔ ظاہر ہے کہ ایک ایسا شخص جس کے اصلی باپ کا پتہ نہ ہو اور بھوئی تو وہ ایک غلام کے سوا کوئی نہ ہو وہ ایک دم شہنشاہِ دقت کا بھائی بن جائے اس سے بڑھ کر اس کی عزت کیا ہو سکتی ہے۔ معاویہ نے کہا: یہ میرے باپ ابوسفیان کے نطفہ سے ہے اور اس کی گواہی کس نے دی؟ ابو مریم سلوی نے جو قبل اسلام طائف میں شراب بیچتا تھا۔ اس نے کہا کہ ابوسفیان میرے شرابخانہ میں آیا اور مجھ سے ایک اس قسم کی عورت کو بلا دینے کو کہا جو اس رات اس کی دلچسپی کا باعث ہو۔ میں نے تمہیہ کو اس کے پاس بلا دیا اور اس طرح ابوسفیان اور تمہیہ میں تعلقات ناجائز پیدا ہوئے اور ان تعلقات سے زیادہ کی ولادت ہوئی۔ ایک شخص نے قبیلہ بنی مصطلق میں سے جس کا نام تیزید تھا گواہی دی کہ میں ابوسفیان کو یہ کہتے سنا تھا کہ زیاد میرے نطفہ سے ہے۔ حالانکہ پہلے زیاد نے کوثر میں آ کر وہاں کے لوگوں سے یہ خواہش کی تھی کہ تم معاویہ کے ساتھ میری قرابت کے لیے گواہی دے دو۔ ان نے انکار کیا کہ ہم جھوٹی گواہی نہ دیں گے۔ یہاں سے مایوس ہو کر وہ بصرہ گیا اور وہاں ایک شخص گواہی دینے کے لیے تیار ہو گیا۔ اس ثبوت کو کافی سمجھا گیا اور زیادؓ معاویہ کے بھائی

پہلی شرط یہ تھی کہ کتاب خدا اور سنت رسولؐ پر عمل ہوگا۔ یہ شرط مسلمانوں کے کسی فرقہ کے نزدیک بھی پوری نہیں ہوئی۔ شیعوں کا عقیدہ تو اس بارے میں ظاہر ہے اور اہلسنت کے نقطہ نظر سے حضرت رسول اللہؐ کی وفات کے بعد صرف تیس برس تک خلافت راشدہ رہی ہے اور یہ تیس برس کی مدت ختم ہو جاتی ہے حضرت امام حسنؑ کی صلح پر۔ اس کے بعد ملوکیت و جہانباہی اور دنیا داری ہے، خلافت راشدہ نہیں ہے۔ اگر یہ شرط پوری ہوئی ہوتی کہ کتاب خدا اور سنت رسولؐ پر عمل ہو تو کوئی وجہ نہ تھی کہ معاویہ کی حکومت خلافت راشدہ کے حدود سے خارج ہوئی۔ عمر بن عبدالعزیز تک کے بارے میں یہ کہا گیا ہے کہ ان کا زمانہ خلافت راشدہ سے ملتا جلتا ہے مگر فاصلہ ہونے کی وجہ سے اس میں محسوب نہیں ہوا۔ مگر معاویہ کے دور حکومت کے متعلق کسی نے یہ رائے ظاہر نہیں کی۔ معلوم ہوا کہ تمام مسلمانوں کے نزدیک اس شرط پر عمل نہیں ہوا۔ اس کے علاوہ واقعات سے بھی یہی ظاہر ہوتا ہے۔ اس کی چند مثالیں ذیل میں درج کی جاتی ہیں:-

ان میں سے ایک بات تھی سیاسی مصالح کی بنا پر زیاد بن سمیہ کو اپنے باپ کا ناجائز فرزند بنا کر اپنا بھائی قرار دینا حالانکہ اسلام میں ناجائز فرزند کو نسب میں شریک نہیں کیا گیا ہے۔ تفصیل اس کی یوں ہے کہ زیاد پہلے زیاد بن عبید کہلاتا تھا کیونکہ اس کی ماں سمیہ ایک نفقی قبیلہ والے شخص کے غلام عبید کی زوجیت میں تھی اور یہ خود حارث بن کلہ کی کنیز تھی حارث نے اسکو آزاد کر دیا تب اس کے یہاں زیاد پیدا ہوا اور اس لیے زیاد غلامی سے خارج رہا اور بڑھا تو بڑا سمجھدار اور ذہین اور عقلمند اور ادیب دیکھا گیا۔ مغیرہ بن شعبہ جب خلیفہ دوم کی طرف سے بصرہ کے حاکم ہوئے تو وہ زیاد کو اپنے ساتھ بصرہ لے گئے اور وہاں اسے لکھنا پڑھنا سکھلایا۔ جب حضرت علی بن ابی طالبؑ خلیفہ ہوئے تو آپ نے زیاد کو سرزمین فارس کا گورنر بنایا۔ آپ کی شہادت کے بعد معاویہ نے زیاد کو ایک تنہید آمیز خط لکھا جس پر زیاد نے مجمع عام میں خطبہ پڑھا اور کہا کہ جگر خوار کا لڑکا اور

اور معاویہ میں مواخات قرار دی تھی، ویسی ہی مواخات حبشی ایک مرتبہ ہاجرین میں اور ایک مرتبہ ہاجرین اور انصار میں کی گئی تھی۔ ہر شخص جانتا تھا کہ اس مواخات سے نبی احکام جاری نہیں ہوتے اور میراث ایک کی دوسرے کو نہیں ملتی۔ یہی عمل درآمد متفقہ طور پر ثابت تھا کہ ہر ایک کی میراث اس کے نبی ورثا کو پہنچے۔ اس مذہبی بھائی کو نہیں جو مواخات کے ذریعہ سے بھائی قرار دیا گیا ہے۔ مگر اتفاق کی بات کہ حیات معاویہ کے پاس آئے ہوئے تھے اور ان کا وہیں انتقال ہو گیا تو معاویہ نے ان کی میراث پر قبضہ کر لیا۔ یہ کہہ کر کہ میراث بھائی ہے۔ اس پر بھی مسلمانوں میں شور مچا یہاں تک کہ فردق نے اس بارے میں شعر بھی کہے

ابوک دعتی یا معاویہ ادرثا تراثا فاحتاز الترات اقاربہ
نما بال میراث المحتات اکلہ ومیوات صخر جہا مملک ذائبہ
فلوکان هذا الامر فی جاہلیۃ علمت من المرء القلیل خلائکہ
ولوکان فی دین سوی ذالنا حقنا او غصنا بالماء شاربہ
(یعنی) تمہارے باپ نے اور میرے چچا نے اے معاویہ میراث چھوڑی تو اصول یہی رہا کہ
میراث قرابت اول کو دی جائے۔ پھر کیا بات ہے کہ حیات کی میراث تو تم نے نوش جا
فرمانی اور ابوسفیان کی میراث تمہاری ہی ملکیت قرار پائی۔ پس یہ معاملہ اگر زمانہ جاہلیت
کی رسم میں داخل ہے تو میں اس کا علم ہونا چاہیے اور اگر یہ اس کے علاوہ کسی اور
دین میں ہے جس کی تم نے ایجاد کی ہے تو میں بھی ہمارا حق ملنا چاہیے نہیں تو یہ تمہیں
ہضم نہیں ہو سکتا ہے۔

مگر تاریخ نہیں بتاتی کہ معاویہ نے اس مال کو کبھی واپس کیا ہو یا حیات کے ورثا کو اس کا
معاوضہ دیا گیا ہو۔ اس کے علاوہ اور بہت سی باتیں خلاف شریعت رواج پا رہی تھیں۔ مثلاً
معاویہ نے زکوٰۃ قطرہ کے متعلق کہا، ہماری رائے میں زکوٰۃ قطرہ دو دسمرا شام میں یعنی شام
کے گھوٹوں ڈومہ، ابوسعید خدری نے فرمایا یہ معاویہ کی مغرور کردہ مقدار ہے۔ ہم نہ اس پر عمل کرتے

قرار پائے۔

اس بات سے مسلمانوں میں اور بالخصوص صحابہ کے طبقہ میں بڑی بے چینی پیدا ہوئی کیونکہ پیغمبر اسلام
کا یہ ارشاد متواتر طور پر سب کو معلوم تھا کہ الولد للفراش والمعاہر النحر یعنی بچہ اصلی شوہر کی
طرف منسوب ہوگا اور زانی کے لیے بس پتھر ہیں، مگر اقتدار حکومت کے کان عوام کی چیخ پکار سننے سے
بالا تر ہوتے ہیں۔ انھوں نے کوئی پروا نہیں کی۔ ان کے لیے اس سے بڑھ کر ادر کیا ہو سکتا تھا کہ اس
ذریعہ سے انھوں نے زیادہ اور اسکی اولاد کو ہمیشہ کے لیے خرید لیا۔

چنانچہ جب زیاد کے ذرا سرائٹھنے کا اندیشہ پیدا ہوتا تو یہ احسان یاد دلا کر اس کو سر ہچکانے
پر مجبور کر دیا جاتا تھا جیسا کہ ایک مرتبہ جب کہ زیاد بہت سے تحائف لے کر معاویہ کے پاس آیا جن
میں جو اہرات کا ایک نہایت نفیس گلو بند بھی تھا اور معاویہ اس کو دیکھ کر بہت خوش ہوئے تو زیاد نے
بطور فخر کنا شروع کیا حضور دیکھے میں نے آپ کے لیے کس طرح عراق کو پامال کر دیا ہے اور کس طرح وہاں
کے چتے چتے پر آپ کا تسط قائم کر دیا ہے اور وہاں کی ہر لذت و نعمت آپ کے قدموں پر لا کر ڈال
دی ہے۔ پس کر معاویہ ابھی کچھ کہنے نہ پاتے تھے کہ یزید بول اٹھا۔ تم نے یہ سب کچھ کیا تو کمال کیا کیا؟
ہم نے جو تم کو قبیلہ ثقیف کی غلامی سے نکال کر قریشی ہونے کی عزت دے دی اور قبیلہ کی فرزند
کے بجائے ابوسفیان کی فرزند کی کثرت عطا کر دیا اور دفتر میں قلم کی گھس گھس سے اونچا کر کے
منبروں کی بلندی نصیب کر دی ہے۔

ظاہر ہے کہ یزید ایسے نوعمر کی زبان سے زیادہ ایسے رسیدہ کا ان الفاظ کو سن کر برداشت کر سکتا
اس میں کمزوری ہی کا نتیجہ تھا جو نبی اعتبار سے اس میں موجود تھی۔ پھر اس صورت میں زیاد کی نسل اب
کبھی معاویہ یا ان کے بعد یزید کے مقابلہ میں سربازی کرنے کی کہاں بہت رکھ سکتی تھی۔ یہ دور اس
اثر تھا اس سیاسی اقدام کا جو زیاد کو بھائی بنا کر کیا گیا تھا۔ چاہے شریعت اس پر کتنی بھی سرفراز کا
مستحق قرار دیتی ہو۔

دوسرا واقعہ: ایک شخص تھے حیات بن زید بن علقمہ تمیمی دارمی حضرت رسول اللہ نے ان میں

ابن عباس نے بد عادی ہے اس بات پر کہ عرفہ کے روز تلبیہ کہنے سے اس لیے منع کرتے ہیں کہ علی عرفہ کے روز تلبیہ فرمایا کرتے تھے۔

حضرت علی بن ابی طالبؓ سے یہ کہ اور ہند بہت سے سنن و احکام میں ترمیم کا باعث ہو گئی۔ چنانچہ امام فخر الدین رازی لکھتے ہیں کہ حضرت علیؓ نماز میں بسم اللہ بلند آواز سے کہنے پر زور دیتے تھے۔ اس لیے جب بنی امیہ کو اقتدار حاصل ہوا تو انھوں نے بلند آواز سے بسم اللہ کہنے کی ممانعت پر زور دیا صرف اس کوشش میں کہ حضرت علیؓ کے آثار باقی نہ رہیں۔

مدینہ میں معاویہ نے لوگوں کو نماز عشاء، باجماعت پڑھائی تو نہ بسم اللہ پڑھی اور نہ بعض تکبیریں کہیں جب نماز سے فارغ ہوئے تو جماعت مہاجرین و انصار نے شور مچایا کہ تم نے نماز میں عدا پوری کی ہے یا بھول گئے ہو؟ بسم اللہ اور سجدہ میں جاتے ہوئے تکبیریں کہاں گئیں؟ مگر معاویہ نے کوئی اعتنا نہیں کیا اور اس نماز کا اعادہ نہیں کیا۔

اس کے ساتھ ہی بخاری اور سلم دونوں کے یہاں یہ روایت موجود ہے کہ عثمان بن حصین نے حضرت علیؓ کے ساتھ بصرہ میں نماز پڑھی اور ختم نماز کے بعد کہا کہ انھوں نے ہم کو وہ نماز یاد دلائی جو ہم رسول اللہؐ کے ساتھ پڑھتے تھے۔ پھر ذکر کیا کہ علیؓ جب سجدہ سے اٹھتے تھے اور جب سجدہ میں جاتے تو تکبیر کہتے تھے۔

نیز مطرف بن عبد اللہ کا بیان ہے کہ میں نے اور عثمان بن حصین نے علی بن ابی طالبؓ کے پیچھے نماز پڑھی۔ پس جب علیؓ سجدہ کرتے تھے تو تکبیر کہتے تھے اور جب سجدہ سے سر اٹھاتے تھے تو بھی تکبیر کہتے تھے اور جب دو رکعتوں کے بعد اٹھتے تھے تو تکبیر کہتے تھے۔ پس جب نماز سے فارغ ہوئے تو عثمان نے میرا ہاتھ پکڑ کر کہا اے شک انھوں نے ہم کو حضرت رسولؐ کی نماز یاد دلا دی یا یہ الفاظ کہہ کہ انھوں نے ہم کو حضرت محمد مصطفیٰؐ والی نماز پڑھائی۔ لہذا ان ہی باتوں کا نتیجہ تھا کہ اصحاب رسولؐ روتے تھے اور افسوس کرتے تھے چنانچہ بخاری کی روایت ہے

ہیں اور نہ اسے قبول کرتے ہیں۔ ہم عبد رسولؐ میں ہر ایک چھوٹے بڑے اور غلام و آزاد کی طرف سے زکوٰۃ فطرہ ایک صاع گندم، ایک صاع پنیر یا جو یا کھجور یا منقہ، اسی طرح نکالتے رہے یہاں تک کہ جب معاویہ حج کے لیے آئے تو انھوں نے کہا ہماری رائے میں دو مگندم شام زکوٰۃ فطرہ ہے! توسید خدری کا قول ہے کہ میں جب تک زندہ ہوں کبھی معاویہ کے اس کہنے کے مطابق عمل نہ کروں گا۔ ابن زبیر نے معاویہ کی اس رائے کو سن کر کہا بش اسم الفسوق بعد الایمان - یعنی ایمان لانے کے بعد فاسق ہونا بہت بُرا ہے۔" مقدار زکوٰۃ فطرہ تو بس صاع ہی ہے۔

مقدم بن معدی کرب کی گفتگو جو معاویہ سے ہوئی ہے اس میں انھوں نے کہا تمہیں خدا کی قسم بتاؤ کیا رسولؐ نے نہیں فرمایا ہے کہ سونا پہننا حرام ہے۔ معاویہ نے کہا صحیح ہے۔ پھر مقدم نے کہا کیا آنحضرتؐ نے درندہ جانوروں کی کھال پر بیٹھنا اور ان کا پہننا ممنوع قرار نہیں دیا تھا؟ معاویہ نے کہا ہاں یہ بھی صحیح ہے۔ مقدم نے کہا پھر کیا بات ہے کہ میں یہ سب چیزیں تمہارے گھر میں دیکھتا ہوں؟ اس کے علاوہ شریعت اسلام کا حکم ہے کہ پیشاب یا پاخانہ کے وقت رو بقبیلہ یا پشت بقبیلہ بیٹھنا جائز نہیں ہے۔ حضرت ابوالیوب انصاری جب شام میں پہنچے تو تمام پاخانہ کے مقامات کو رو بقبیلہ پایا۔ انھوں نے استغفار پڑھ کر منہ پھیر لیا۔

عرفہ کے روز حج میں تلبیہ کہنا لبیک اللہم لبیک لا شریک لک لبیک۔ اہم ضروری اور لازمی شعائر حج میں سے ہے۔ رسول کریمؐ اور اصحاب برابر کہتے چلے آئے مگر اس نیک کام کو معاویہ ترک کرتے ہیں اور لوگوں کو اس سے منع کرتے ہیں۔ حضرت ابن عباسؓ نے سعید سے عرفہ کے روز پوچھا کہ کیا وجہ ہے میں لوگوں سے تلبیہ کی آواز نہیں سنتا۔ سعید نے کہا کہ لوگ معاویہ سے ڈرتے ہیں۔ یہ سن کر ابن عباسؓ اپنے خیمہ سے نکلے اور پکارے لبیک اللہم لبیک اور کہا۔ اگرچہ یہ معاویہ کے علی الرحمہ ہو۔ ان لوگوں نے علیؓ کی عداوت سے اس سنت کو ترک کر دیا ہے۔ اس طرح کی تین روایتیں کنز العمال میں درج ہیں جن میں

۱۔ دراست اللیب ملا محمد معین مؒ ۲۔ دراست اللیب مؒ

اور اس کے اثرات کے قائم رکھنے کا کوئی جوش و ولولہ نہ رکھتے تھے۔ اس کی ایک ادنیٰ مثال یہ ہے کہ معاویہ کو شوق پیدا ہوا ایک بڑے عمر آدمی سے ملاقات کا جو گذشتہ زمانہ کے حالات بیان کرے۔ لوگوں نے کہا کہ حضرت موت میں ایک شخص ہے جس کی تین سو ساٹھ برس کی عمر ہے۔ معاویہ نے اس کے پاس آدمی بھیجے اور اسے بلوایا۔ جب وہ آیا تو پوچھا کہ تمہارا نام کیا ہے؟ اس نے کہا ابد بن ابد۔ معاویہ نے اس سے عبدالمطلب اور امیہ وغیرہ کے حالات پوچھے۔ پھر کہا تم نے محمد کو بھی دیکھا ہے؟ اُسے ایک مسلمان کی زبان سے حضرت کا نام نامی اس طرح سنکر حیرت ہوئی اور اس نے کہا ومن محمد یعنی محمد کون؟ انھوں نے کہا ”ہی رسول اللہ“ اس نے کہا پھر تم نے پہلے ہی ان کا نام اس شان کے ساتھ کیوں نہ لیا؟ جس کا خدا نے انھیں سختی قرار دیا ہے۔ یہ کیوں نہیں کہا کہ تم نے رسول اللہ کو دیکھا ہے؟

اس سے زیادہ اور انتہائی حیرت خیز یہ ہے کہ معاویہ کو رسول اللہ کہہ کر سلام کیا گیا اور ان کو نزار تو درکنار معمولی سی تنبیہ بھی نہیں کی گئی۔ اس واقعہ کی تفصیل یہ ہے کہ عمر بن عاص ایک دفعہ اہل مصر کی ایک جماعت کے ساتھ معاویہ کے پاس دارالخلافہ شام میں باریابی کے لیے آئے۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ عمر بن عاص، معاویہ سے کچھ برسرِ پریشانی تھے۔ انھوں نے اپنے ساتھیوں کو بھجوا دیا کہ دیکھو جب تم معاویہ کے دربار میں جانا تو اسے خلیفہ کہہ کر سلام نہ کرنا اور جہاں تک ممکن ہو اس سے حقارت کے ساتھ بات کرنا۔ اس کی وجہ سے تمہاری ہدایت اس کے دل پر قائم ہو جائے گی۔ معاویہ کو جب ان لوگوں کے پہنچنے کی اطلاع ہوئی تو وہ اپنی ذہانت سے عمر و عاص کی سازش کو ٹاٹ گئے اور درباروں سے کہا میرا خیال ہے کہ نافعہ کے لڑکے (عمر و عاص) نے ان لوگوں کی نظر میں میری منزلت کو گھٹا دیا ہوگا۔ لہذا تم خیال رکھو جب یہ لوگ آئیں تو ان کے ساتھ انتہائی سختی کرنا۔ یہاں تک کہ ہر شخص کو ان میں سے یقین ہو جائے کہ اس کی جان کی خیر نہیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ سب سے پہلے جو شخص معاویہ کے سامنے دربار میں حاضر ہوا وہ یوں آداب

کہ ایک روز ابو الدرداء غصہ میں بھرے گھر میں آئے۔ سبب دریافت کیا گیا تو کہنے لگے کہ میں ان لوگوں میں امت محمدیہ ہونے کی کوئی نشانی نہیں پاتا۔ سوا اس کے کہ نماز جماعت سے پڑھ لیتے ہیں۔ امام مالک نے روایت کی ہے کہ جو باتیں ہم پہلے پاتے تھے ان میں سے ایک بات بھی اب ہم نہیں دیکھتے۔ بجز اس کے کہ اذان دے لیتے ہیں اور زہری بیان کرتے ہیں کہ میں انس بن مالک کے پاس دمشق گیا تو ان کو روتے پایا۔ سبب پوچھا تو انس نے کہا کہ جو باتیں میں نے عبد رسول اللہ میں دیکھی تھیں۔ اب ان میں سے سوا اس نماز کے کوئی نظر نہیں آتی اور یہ نماز بھی ضائع کر دیتی ہے۔ امیر شام کے یہاں گانے والوں کی قدر و منزلت ہوتی تھی چنانچہ سابق فاتر نے جو ایک فاسق و فاجر شخص تھا انھیں گانا سناتا کر اپنی تمام حاجتیں جو لے کر آیا تھا پوری کر لیں۔ اس آغاز کا انجام اگر نزدیک کی نظر انجاری اور رقص و سرود کے ساتھ فریفتگی کی شکل میں ظاہر ہو تو تاریخ کی طبعی رفتار کے لحاظ سے قابلِ تعجب نہیں ہے۔

علامہ ابن الفقیہ نے لکھا ہے کہ معاویہ نے سب سے پہلے پولیس چوکی اور پرو دار مقرر کیے اور خواجہ سرا بنائے اور اموال خزانہ میں جمع کر کے رکھے۔ انھوں نے سلاطین و زراکات کی طرح اپنے عمال کے ذریعہ سے نور و زور اور سرکار (ایرانی تہوار) کے تحائف وصول کیے جن کی مقدار ایک کروڑ درہم سالانہ تک پہنچی تھی۔

مذکورہ بالا واقعات میں سے ممکن ہے کہ بعض حیرت میں ڈالنے والے ہوں مگر اس کو کیا کیا جائے کہ تاریخ میں اس سے زیادہ حیرت انگیز باتیں بھی درج ہیں جن کو دیکھ کر ہر انسان یہ نتیجہ نکال سکتا ہے کہ اوسفیان کی اولاد کو بنی ہاشم سے ایک موروثی عداوت جو مٹی اس کی بنا پر وہ ان کی ہر سنت، ہر رسم اور ہر طریقہ کو فنا کر دینا چاہتے تھے بلکہ سرے سے اسلام ہی کو نیست و نابود کر دینے کے درپے تھے۔ صرف مجبوری یہ تھی کہ ان کی حکومت اسلام کی بنا پر پھٹی اس لیے انھیں پیغمبر اسلام کی نبوت کا انکار ممکن نہ تھا لیکن وہ پھر بھی حضرت کی عظمت کے اس

اسی وقت سورج کو گرہن ہوا۔ جابر بن عبد اللہ انصاری نے کہا، معاویہ نے رسول اللہ کے مشر اور ان کے دارالہجرت میں بڑا حادثہ رونما کیا۔ ضرور یہ کسی مصیبت میں مبتلا ہوں گے۔ اسی سال معاویہ لقوہ میں مبتلا ہوئے۔

یہ سنہ ۵۵ھ کا واقعہ ہے، منیر کو جنبش دیتے ہی سورج میں گرہن لگا، ایسا کہ تارے نظر آنے لگے۔ اہل مدینہ میں اس سے اتنا ہیجان پیدا ہوا کہ معاویہ کو اپنا ارادہ ترک کرنا پڑا اور کہا کہ میں نے تو منبر ہٹا کر صرف یہ دیکھنا چاہا تھا کہ اسے دیکھ تو نہیں لگی ہے۔

حضرت علی بن ابیطالب کے ساتھ جو دشمنی تھی وہ بھی آپ کی ذات سے خصومت کی بنا پر نہ تھی بلکہ صرف اس لیے کہ آپ بنی ہاشم کے چشم و چراغ اور اصول اسلام کے صلیب دار تھے۔ اس لیے مہانت کا تقاضا یہ تھا کہ ملک میں آپ کے خلاف نفرت پیدا کر لی جائے۔ قتل عثمان کا الزام بھی فقط اس سیاست کے پورا کرنے کا ایک بہانہ تھا چنانچہ علامہ ابن حجر مکی نے لکھا ہے۔ مردان بن الحکم کی زبانی منقول ہے۔ اس نے کہا کہ کوئی شخص علی سے زیادہ عثمان کی حمایت کرنے والا نہ تھا۔ کسی نے کہا کہ چھ قم لوگ منبروں پر اٹھیں گا لیاں کیوں دیتے ہو؟ اس نے کہا بغیر اسکے ہمارا اقتدار قائم نہیں ہو سکتا۔ پھر جبکہ صلحہ کی بنیاد یعنی کتاب اور سنت کی موافقت والی شرط کا یہ انجام ہوا تو دوسری شرطوں کا نتیجہ ظاہر ہے۔ چنانچہ دوسری شرط یہ کہ معاویہ کو اپنے بعد کسی کے نامزد کرنے کا حق نہ ہوگا، اس کے انجام کا آئندہ ایک مستقل باب میں بیان ہوگا۔

تیسری شرط یہ تھی کہ شام و عراق و حجاز و دین سب جگہ کے لوگوں کے لیے امان ہوگی۔ اس کا انجام بہت دردناک ہے۔ عراق میں زیادہ بن سمیہ کے ہاتھوں جو خونریزیاں ہوئیں وہ صفحہ تاریخ پر نمایاں حروف میں درج ہیں۔ اس شخص کے خصوصیات میں لکھا ہے کہ وہ ہجرم کے پہلے مزا دیتا بدگمانی کی بنا پر با تحقیق و تفتیش قید کر دیتا اور شبہ پر انداز سانی کرتا تھا۔ انسان کی جان کا لین اس کے نزدیک کوئی بات ہی نہ تھا۔ اس کا ایک عجیب نمونہ اس واقعہ میں ہے کہ اس نے یہ عام حکم

کہا، خدا غارت کرے معاویہ کو۔ اگر میں نے اللہ کی اتنی اطاعت کی ہوتی جتنی معاویہ کی اطاعت انجام دی تو وہ کبھی مجھ کو عذاب نہ کرتا۔ یہ تو تھی بشرط یہ تھی کہ حضرت علیؑ کے اصحاب اور شیعوں کے جان و مال و ناموس و اولاد محفوظ رہیں گے۔ اس شرط پر قطعی عمل نہیں ہوا۔

عراق میں شیعہ علیؑ پر جتنے مظالم ہوئے ان میں سب سے ہلکی بات یہ تھی کہ ان کو کوفہ سے جلا وطنی پر مجبور کیا جاتا تھا اور ان کی جگہ معاویہ کے طرفداروں کو لاکر بسایا جاتا تھا۔ کوفہ اور بصرہ دونوں جگہ کے شیعوں کو ملک بدر کر دیا گیا۔ ان میں سے اکثر کوشام کے مقام فتنہ میں جو بالکل غیر آباد تھا لے جا کر فوجی زندگی گزارنے پر مجبور کیا گیا۔

حجر بن عدی اور ان کے ساتھی شام میں بلوا کر قتل کر دیے گئے حالانکہ وہ اعلان کر رہے تھے کہ ہم مسلمان ہیں۔ اپنے معاہدہ پر قائم ہیں اور باغی نہیں ہیں۔ مگر ان کا سب سے بڑا جرم یہ تھا کہ وہ محب اہلبیت تھے اس لیے ان کے واسطے نہ حکم میں گنجائش تھی نہ رحم و کرم ان پر نگاہ ڈالنے کی اجازت دیتا تھا۔ صفی بن فیصل شیبانی جو انہی میں سے ایک ممتاز فرد تھے۔ زیاد کے پاس لے گئے تو زیاد نے پوچھا کہ تم علی بن ابیطالب کے بارے میں کیا رائے رکھتے ہو؟ کہا بہترین رائے جو اللہ کے بندگان مؤمنین میں سے کسی کے بارے میں رکھی جاسکتی ہے۔ زیاد نے حکم دیا کہ اسے لکڑی سے پیٹو، اتنا کہ زمین سے لگ جائے۔ چنانچہ انھیں اتنی ہی شدت سے زد و کوب کیا گیا۔ زیاد نے کہا بس کرو۔ پھر پوچھا، ہاں اب بتاؤ علیؑ کے باب میں کیا کہتے ہو؟ کہا بخدا اگر امیرزد اور چھڑیوں سے میری بوتیاں کاٹ ڈالو تب بھی وہی کہوں گا جو پہلے سن چکے ہو۔ کہا تم کو ان پر لعنت کرنا ہوگی ورنہ تیری گردن اڑادی جائے گی۔ صفی نے کہا تو پھر پہلے گردن اڑا ہی کیوں نہ دو؟ مجھے اس میں کوئی عذر نہیں بلکہ میں اس سے راضی اور مطمئن ہوں۔

۱۲۷ ج ۶ طبری ج ۳ ص ۲۴۷ ۱۳۰ ج ۴ طبری ج ۳ ص ۲۴۷

۱۳۱ ج ۲ ص ۱۵۳ ۱۳۱ ج ۲ ص ۱۵۳

دے دیا تھا کہ جو نصف شب کے قریب گلی کوچہ میں نظر آئے اس کو قتل کر دیا جائے۔ ایک رات ایک دیہاتی عرب کو گرفتار کیا گیا اور اسے زیاد کے پاس لائے۔ اس نے اپنی صفائی پیش کی کہ میں یہاں کارہنہ والا نہیں ہوں۔ دیہات سے آج ہی آیا ہوں اور مجھے آپ کے اس حکم کی اطلاع نہیں تھی۔ زیاد نے کہا کہ واللہ میرے خیال میں تو سچ کہہ رہا ہے اور بے خطا ہے مگر تیرے قتل کر دینے میں عامہ خلأق کے لیے بہتری ہے چنانچہ فوراً اسے قتل کر دیا گیا۔

زیاد کی ولایت کوفہ کے بعد بصرہ میں اس کے جانشین سمر بن جندب کے مظالم اس سے بھی زیادہ تھے۔ ایک بار چھ مہینہ کی مدت میں آٹھ ہزار آدمی اس نے تہ تیغ کیے۔ آٹھ سو اعدادی کا بیان ہے کہ سمر نے میری قوم میں سے ایک دن میں ۴۴ آدمی قتل کیے جو سب کے سب حافظ قرآن تھے۔ ایک دن سمر اپنے لاؤشکر کے ساتھ شہر سے باہر نکلا۔ بنی اسد کے مکافوں کے قریب ایک شخص اس قبیلہ کا کسی ضرورت سے ایک گلی میں سے نکلا۔ لشکر کے آگے آگے کے سواروں میں سے ایک نے اسے دیکھتے ہی اپنے حربہ سے حملہ کر دیا اور وہ گر کر خاک و خون میں تڑپنے لگا۔ سمر بن جندب اس کی لاش پر سے گزرا اور واقعہ معلوم ہونے پر کہا کہ جب ہماری سواری گزرا کرے تو ہمارے نیزوں سے پیچھے رہا کرو۔

مسلم عجمی کا بیان ہے کہ ایک شخص سمر کے پاس آیا اور اپنے مال کی زکوٰۃ ادا کی۔ پھر مسجد میں آکر نماز پڑھنا شروع کی۔ اتنی دیر میں ایک شخص آیا اور اس کی گردن اڑادی۔ اس طرح کہ مسجد میں ایک طرف اس کا سر کٹ کر جاگرا اور دوسری طرف بدن۔

ایک دوسرے موقع پر مشاہدہ بیان کیا ہے کہ بہت سے آدمی اس طرح قتل کیے گئے کہ ان سے شہادتیں کا اقرار لیا جاتا تھا۔ وہ توحید اور رسالت کا اقرار کرتے تھے اور خوارج سے برأت کا اعلان کرتے تھے اور پھر اس کے بعد ان کا سر قلم کر دیا جاتا تھا۔ اور یہ سب کچھ امیر شام معاویہ کی مرضی کے مطابق ہوتا تھا۔ چنانچہ جب عرصہ کے بعد معاویہ نے سمر کو معزول کیا تو اس نے

۱۳۱ ج ۶ طبری ج ۳ ص ۲۴۷ ۱۳۱ ج ۴ طبری ج ۳ ص ۲۴۷

والا موجود نہ تھا۔ عبدالرحمن نے کہا۔ اب بخدا عرب میں نہ تو آپ کے حکم کا کوئی ذکر ہوگا اور نہ آپ کی احابت رائے قابل تسلیم رہی۔ آپ نے ایسے آدمیوں کو قتل کیا جن کو قید کر کے آپ کے پاس بھیجا گیا تھا اور وہ مسلمان تھے۔

عائشہ کو اس حادثہ کی اطلاع پہنچی تو انھوں نے کہا۔ اگر معاویہ کو احساس ہوتا کہ اہل کو ذہن کچھ بھی برأت دہمت ہے تو وہ کبھی حجر اور ان کے اصحاب کو گرفتار کر کے شام بلوانے اور قتل کرنے کی برأت نہ کرتا، لیکن جگر خوارہ کے رطکے کو معلوم ہے کہ آدمی فنا ہو چکے ہیں۔ خدا کی قسم یہ لوگ اپنی علمی طاقت اور نفی قابلیت کے لحاظ سے عرب کے سرادر داغ سمجھے جاسکتے تھے۔ بسید شاعر نے کیا خوب نظم کیا ہے اپنے دو شعر دل میں جن کا مضمون یہ ہے کہ گزر گئے وہ لوگ جن کی پناہ میں زندگی بسر کی جاسکتی تھی اور رہ گیا ہوں میں ایسے پس ماندہ افراد میں جو خارش اور اذیت کی کھال کے مثل ہیں۔ نہ تو ان سے کوئی فائدہ ہے اور نہ ان سے کسی اچھائی کی توقع ہے جب وہ بات کرتے ہیں تو عیوب سے ملو ہوتی ہے چاہے وہ شور و غل برپا نہ کریں۔

جب معاویہ مدینہ رسول میں آئے اور ام المومنین عائشہ کے پاس سلام کے لیے حاضر ہوئے تو سب سے پہلی بات جو عائشہ نے پیش کی وہ حجر کا معاملہ تھا اور اس گفتگو میں یہاں تک طول ہوا کہ معاویہ نے کہا، اچھا پھر چھوڑ دیجیے، مجھے اور حجر کو، خدا کے یہاں دیکھا جائے گا۔ عبداللہ بن عمر کا واقعہ ہے کہ وہ بازار میں تھے۔ ان کو حجر کے قتل کی خبر ملی تو وہ بے چین ہو گئے، نشست کو قائم نہ رکھ سکے اور کھڑے ہو کر چنچیں مار مار کر رونے لگے۔

حسن بصری کو جب حجر اور ان کے ساتھیوں کے قتل کا حال معلوم ہوا تو پوچھا کہ کیا ان پر ناز جنازہ پڑھی گئی؟ کفن دیا گیا؟ اور دفن کیا گیا اور قبلہ رخ لاش رکھی گئی؟ معلوم ہوا کہ یہ سب کیا گیا۔ حسن نے کہا تو پھر بخدا حجت ان کی تمام ہو گئی۔

مطلب یہ تھا کہ لاشوں کے ساتھ اسلامی احکام پر عمل ان کے مسلمان سمجھ جانے کا ثبوت ہے تو پھر ان کا خون مباح کیونکر ہو سکتا ہے؟

زیاد نے بارہ آدمیوں کو پابنہ بخت شام کی طرف روانہ کیا۔
حجر بن عدی کنزی، ارقم بن عبداللہ کنزی، شریک بن شداد مصری، صفی بن فہیل، قضیہ بن ضبیعہ عسبی، کریم بن حنیف شعمی، عاصم بن عوف بجلی، ذوقان بن سہمی بجلی، کدائم بن حیات غزی، عبدالرحمن بن حسان غزی، عمر بن شہاب تمیمی، عبداللہ بن حویرہ سعدی۔

عتبہ بن احنس سعدی اور سعد بن مران ہمدانی، ان دو آدمیوں کو زیاد نے بعد میں بھیجا جس کے بعد ان کی تعداد چودہ ہو گئی۔
ان میں سے سات آدمی مختلف لوگوں کی سفارش پر چھوڑ دیے گئے اور چھ آدمیوں کو مقام مرج عذرا میں تہ تیغ کیا گیا۔

ایک شخص عبدالرحمن بن حسان غزی کے لیے معاویہ کو خود اپنی بے رحمی ناکافی محسوس ہوئی اور ان کو پھر زیاد کے پاس بھیج دیا۔ اس انتباہ کے ساتھ کہ یہ ان تمام لوگوں میں سب سے زیادہ شیعیت میں سخت ہے۔ تم اس کو بد سے بدتر طریقہ جو اختیار کر سکو اس طرح قتل کر دینا پھر زیاد کے حکم سے انھیں زندہ زمین میں دفن کر دیا گیا۔

حجر بن عدی ان میں سے تھے جو مرج عذرا میں قتل کیے گئے۔ ان کو عالم اسلام میں کتنی ہرگز نہ تھی۔ اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ جب زیاد کی غمخیزی کی اطلاع ام المومنین عائشہ کو پہنچی تو انھوں نے عبدالرحمن بن حارث بن ہشام کو حسب ذیل پیغام کے ساتھ معاویہ کے پاس روانہ کیا اللہ اللہ فی حجر داصحابہ یعنی حجر اور ان کے اصحاب کے بارے میں خدا کا خوف کرنا، اگر انہوں نے کہ عبدالرحمن اس وقت پہنچے جب حجر اپنے ساتھیوں سمیت قتل ہو چکے تھے۔ عبدالرحمن نے معاویہ سے کہا، آپ کے پاس سے کہاں چلا گیا تھا۔ ابوسفیان سے میراث میں ملا ہوا حلم؟ آپ نے اس حلم سے کام کیوں نہ لیا؟ آپ نے ان کو جیل خانہ ہی میں ڈال دیا ہوتا اور دبا و طاعون سے ہلاک ہو جانے دیا ہوتا۔ معاویہ نے طنز یہ طور پر جواب دیا کہ تمہارے ایسا کوئی شہوہ دینے

ان واقعات سے شیطان علیٰ میں غلام برپا ہو گیا اور حضرت امام حسینؑ پر بھی سخت اثر ہوا چنانچہ زینوری نے لکھا ہے کہ جب حجر بن عدی اور ان کے اصحاب قتل ہو گئے تو اہل کوفہ نے اس کو بڑی ناگوار مصیبت سمجھا اور کچھ لوگ اشراف اہل کوفہ میں سے حضرت امام حسینؑ کے پاس گئے اور آپ کو اطلاع دی۔ آپ نے کہا اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رٰجِعُوْنَ اور یہ واقعہ آپ کو بہت شاق ہوا تاہم آپ نے اس واقعہ پر ایک دم کوئی انتہائی قدم اٹھانا مناسب نہیں سمجھا بلکہ آئندہ حالات کا بچھنی کے ساتھ انتظار کرتے رہے۔ بے شک جب معاویہ کو یہ معلوم ہوا کہ لوگ امام حسینؑ کے پاس شکایت لے گئے ہیں اور آپ نے بھی ان کے ساتھ اظہار ہمدردی کیا ہے تو انھیں یہ اندیشہ پیدا ہوا کہ کیا آپ مخالفت کے لیے کھڑے نہ ہو جائیں۔ اس بنا پر اہل کوفہ نے آپ کے نام ایک تہدید خط لکھا۔ اس کے جواب میں اب حضرت امام حسینؑ خاموش نہ رہ سکتے تھے۔ آپ نے ایک ایک کر کے امیر شام کی جو خلافت و رزیاں معاویہ کے متعلق تھیں وہ گنوائیں اور خصوصیت کے ساتھ حجر بن عدی وغیرہ کے قتل کو آپ نے موثر الفاظ میں پیش کیا۔ اس پر سخت احتجاج ہوا جس کا ذکر اس باب کے آخر میں آئے گا۔

پانچویں شرط یہ تھی کہ امام حسنؑ اور امام حسینؑ یا کسی کو بھی خاندان رسولؐ سے کوئی نقصان پہنچانے کی کوشش نہ کی جائے گی۔ نہ خفیہ نہ علانیہ۔ اس شرط کی بھی صریح خلافت و رزئی کی گئی حالانکہ اس صلح کے بعد یہ حضرات ملکی اور سیاسی امور سے بالکل بے لعل رہے مگر اس کے بعد بھی امام حسنؑ بنی امیہ کی ایذا رسانیوں سے محفوظ نہیں رہے۔ اس کی مختلف صورتیں تھیں۔ پہلے غلط پروپیگنڈے اور بے بنیاد الزامات جن سے ان کی رفعت مرتبہ پر عام نگاہوں میں حریف قیے۔ وہ لوگ سمجھتے تھے کہ خاندان پیغمبرؐ کے ان مقدس افراد کی زندگی اتنی آسان ہے کہ ان کے غیبت ایب لازم ہو کھلا ہوا۔ اصول شریعت کے خلاف ہو عائد کرنا کسی درج مفید نہ ہو گا۔ وہ زور کر مسلمانوں کی جماعت میں باور نہیں کیا جاسکتا اس لیے اس طرح کے الزامات لکھتے

رتبع بن زیاد حارثی نے جو خراسان کے حاکم تھے حجر بن عدی کے قتل ہونے اور مسلمانوں کی بے حسیت کا تذکرہ کیا اور پھر جمعہ کے دن مسجد میں آکر حاضرین سے کہا، ایتھا الذاس میں زندگی سے عاجز ہو چکا ہوں۔ اب میں ایک دعا مانگتا ہوں، تم سب آمین کہنا۔ اس کے بعد ہاتھ اٹھائے اور کہا۔ خداوند اگر رتبع کے لیے تیرے نزدیک کچھ بہتری ہے تو جلد اس کی روح قبض فرمائے اس کے بعد مسجد سے باہر نکلے کچھ دور نہ گئے تھے کہ زمین پر گرے اور انتقال کیا۔ یہ خود معاویہ کو بعد میں حجر کے بے گناہ قتل کرنے کے جرم کا احساس پیدا ہو گیا تھا چنانچہ جب وہ مرض الموت میں مبتلا ہوئے اور تکلیف زیادہ ہوئی تو ایک روز عبداللہ بن زیاد اس کے پاس آیا۔ اس نے دیکھا کہ وہ بہت مضطرب ہیں۔ اس نے (خوشامدانہ لب و لہجہ میں) کہا، آپ کو اضطراب کی کیا ضرورت ہے؟ اگر مر گئے تو جنت میں پہنچے اور اگر زندہ رہے تو مسلمانوں کے جہاں پناہ رہے۔ معاویہ نے کہا، ”خدا رحمت نازل کرے تمہارے والد پر“ مجھے حجر بن عدی کے قتل سے منع کرتے تھے۔“ محمد بن سیرین کی روایت ہے کہ جب معاویہ کا وقت وفات قریب آیا اور انھیں گھرا لگا تو انھوں نے کہا یومی منک یا حجر یوم طویل (یعنی) اے حجر تمہارے قتل سے مجھے طویل روز کا سامنا ہو گا۔“ مزید مشقت کا زمانہ طولانی ہوتا ہے لہذا اس سے مقصود یہ ہے کہ مجھے اس قتل کے سبب سے روز قیامت بڑی تکلیف و زحمت کا سامنا کرنا پڑے گا۔

عمر بن الحمق الخزاعی ایک بزرگ تھے جن کو حضرت پیغمبرؐ نے سلام کھلوا یا تھا اور ان کے لیے بہت بلند مرتبہ انسان سمجھے جاتے تھے۔ ان کی گرفتاری کا حکم ہوا اور معاویہ کی خصوصیت کے مطابق ان پر نو وار نیزے کے کیے گئے۔ حالانکہ پہلے یا دوسرے ہی زخم سے وہ جان بحق تسلیم ہو چکے تھے۔ تازیچ کی تصریح کے مطابق سب سے پہلا سرخو اسلام میں نیزہ کی نوک پر بند کیا گیا

اور پرہیزگاروں کو قتل کیا جو ظلم و بدعت کو پسند نہ کرتے تھے اور دین کے معاد میں کسی شخص کی امانت اور سزاؤں کی پروا نہ کرتے تھے۔ حالانکہ تم ان کے ساتھ بڑی قسمیں کھا کر بچنے و عدے کر چکے تھے اور انھوں نے نہ کوئی فتنہ ملک میں پیدا کیا تھا اور نہ تمھاری مخالفت کی تھی مگر تم نے ان کو قتل کیے بغیر نہ چھوڑا کیا تم ہی وہ شخص نہیں ہو کہ جس نے عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہما کی صحابی رسول کو قتل کیا جو ایسا صالح اور عبادت گزار زندہ تھا کہ کثرت عبادت سے اس کا جسم گھل گیا تھا۔ بدن طہل گیا تھا۔ قوتیں زائل ہو گئی تھیں اور چہرہ پر زردی پھا گئی تھی۔ تم نے پہلے ان کو امان دے دی تھی اور ایسا مضبوط وعدہ کیا تھا کہ اگر ایسا وعدہ کسی جانور سے بھی کیا جائے تو وہ پھاٹکی کی چوٹی سے اتر کر پاس آجائے۔ پھر تم نے بڑی جہارت کے ساتھ اس عہد کو توڑ دیا اور بے جرم و خطا ان کو مار ڈالا۔ کیا تم ہی وہ شخص نہیں ہو جس نے زیاد بن سمیہ کو جو بنی ثقیف کے غلام عبسید نامی کا بیٹا تھا اپنا بھائی، اپنے باپ ابوسفیان کا بیٹا قرار دیا۔ حالانکہ رسول اللہ نے فرمایا ہے کہ بیٹا اس کا سمجھا جائے گا جو عورت کا اصلی شوہر ہو، اور زنا کار کے لیے بس بچہ نہیں اور کچھ نہیں۔ مگر تم نے اپنی مصلحت کی بنا پر رسول کو پس پشت ڈال دیا اور اس کو اپنا بھائی بنا کر عراقین کا حاکم بنا دیا تاکہ وہ مسلمانوں کے ہاتھ پر قطع کرے اور ان کی آنکھوں کو گرم لوہے کی سلاخوں سے پھوڑے۔ اور درختوں کی شاخوں میں لٹکا کر مارے۔ کیا تم ہی وہ نہیں ہو جسے زیاد بن سمیہ نے لکھا تھا کہ حضرت عیینہ علی کے دین پر ہیں۔ تم نے حکم دیا کہ جو لوگ علی کے دین پر ہیں ان میں سے ایک کو زندہ نہ چھوڑو۔ اس نے سب کو مار ڈالا اور منہ بھی کیا اور جو تم نے مجھے لکھا ہے کہ میں اپنے نفس کا اپنے دین کا اور امت محمدی کا خیال کروں اور ان کو فتنہ میں نہ ڈالوں اور جماعت

اصولی اختلاف تھا۔ اور صرف ان کے دباؤ کی وجہ سے آپ اس پر قائم تھے۔ ایسا نہیں بلکہ آپ اسی راستے کو صحیح سمجھتے تھے اور اسی لیے خود صاحب اختیار ہونے کے بعد بھی اسی کو برقرار رکھا۔ حالانکہ اس وقت شیعوں میں ہیمان بھی پیدا ہوا جس کا تذکرہ تاسع ان الفاظ میں کرتی ہے کہ جب حضرت امام حسنؑ کی وفات ہوئی تو عراق کے شیعوں میں حرکت پیدا ہوئی اور انھوں نے امام حسینؑ کو لکھا کہ ہم لوگ معاویہ کی بیعت توڑ کر آپ سے بیعت کرنے پر تیار ہیں مگر آپ نے فرمایا کہ نہیں! ہم میں اور معاویہ میں معاہدہ ہو چکا ہے۔ اس کا توڑنا میرے لیے صحیح نہیں ہے۔ بیشک جب معاویہ کا انتقال ہو گا تو دیکھا جائے گا۔

آپ صبر و سکون کے ساتھ تمام شرائط کی خلاف ورزی اور حکومت شام کی بیرون دستیوں کو دیکھتے اور ان سے متاثرہ ہوتے رہے اور انھیں آپ نے ایک ایک کر کے اس وقت ظاہر کر دیا جب امیر شام نے آپ کو ایک تہدید آمیز خط لکھا ہے۔ آپ نے اس کے جواب میں ایک تاریخی مکتوب تحریر فرمایا جو درج ذیل ہے:-

”تمھارا خط ماحسب میں تم نے لکھا ہے کہ تم نے میرے متعلق اپنی مخالفت کے بارے میں کچھ خبریں سنی ہیں جن کی تم کو امید نہ تھی۔ تم کو جو خبریں پہنچی ہیں وہ تمھارے خوشامدی لوگوں اور چغلوں کی پہنچائی ہوئی ہیں۔ جو افتراء بہتان کی حیثیت رکھتی ہیں۔ میں اس وقت تم سے محاصمت اور جنگ کا کوئی ارادہ نہیں رکھتا۔ اور خاموش ہوں مگر تم کو معلوم ہونا چاہیے کہ میں اس خاموشی سے خوش نہیں ہوں اور یقیناً مجھے اپنے اس سکوت سے یہ اندیشہ ہے کہ کہیں خدا اس کی وجہ سے مجھ پر ناراض نہ ہو۔ یہ میری خاموشی تمھارے لیے اور تمھارے ہوا خواہوں کے لیے کبھی کوئی سند نہیں بن سکتی۔ کیوں معاویہ! کیا تم ہی نہیں ہو وہ شخص جس نے حجر کندی کو قتل کیا! کیا تم ہی وہ نہیں ہو جس نے ایسے نماز گزاروں

سوال پاب بندید کی ولعہدی

معاویہ کے لیے ان کی زندگی کا طویل دور کم نہ تھا جس میں انھوں نے مسلمانوں کی قیمت کے مالک بن کر اپنے حوصلے نکال لیے تھے۔ اور دنیا کی جاہ و شہرت اور مال و دولت کے خوب خوب مزے اٹھا چکے تھے، جس کا اعتراف انھوں نے ایک خاص انداز میں خود بھی کیا اور کہا کہ ہم تو دنیا میں غلطاں ہو گئے اور لوٹ لوٹ کے اس میں رہے مگر انھوں نے اس پر اکتفا نہ کیا اور یہ چاہا کہ ان کی اولاد بھی اسی طرح بہرہ اندوز ہو۔ حالانکہ وہ معاہدہ میں یہ شرط کر چکے تھے کہ میں اپنے بعد کسی کو خلیفہ نامزد نہ کروں گا۔ پھر بھی انھیں فکر اس کی ہوئی کہ اپنے بیٹے یزید کو اپنا جانشین بنادیں مگر وہ یزید کے افعال و عادات کی وجہ سے سمجھتے تھے کہ مسلمانوں کو اس پر تیار کرنا بڑا دشوار گزار مرحلہ ہے۔ اس لیے وہ اس کو زبان پر نہیں لاتے تھے۔ تاہم وہ رفتہ رفتہ اس کے انتظامات مکمل کر رہے تھے۔ ان میں سے ایک ایسے بااثر افراد کا جو مدعی خلافت بن سکیں ختم کرنا تھا۔ چنانچہ عبدالرحمن بن خالد بن ولید بن کاثر اس وجہ سے شام میں بڑھ گیا تھا کہ ان کے والد کے کارنامے رومیوں کے مقابلہ میں اہل شام کے زبان زد تھے اور اس بنا پر معاویہ کو اندیشہ تھا کہ کہیں اہل شام ان کو خلیفہ نہ تسلیم کر لیں لہذا ان کا علاج یہ کیا گیا کہ ابن اثال کے ذریعہ سے ان کو نہ ہر دلا دیا جس سے ان کا خاتمہ ہو گیا۔ معاویہ نے ابن اثال کو اس کا معاوضہ یہ دیا کہ ہمیشہ کے لیے ٹیکس سے مستثنیٰ کر دیا اور حمص کے خراج کی وصولیابی کا اسے والی قرار دے دیا۔ مگر اسے اس رشوت سے فائدہ اٹھانے کا زیادہ موقع نہیں ملا۔ اس لیے کہ عبدالرحمن کے بھائی جابر بن خالد نے مدینہ سے دمشق جا کر اپنی تلوار سے ابن اثال کو قتل کر دیا جس پر معاویہ نے

کی تفریق سے پرہیز کر دل۔ تو میرے خیال میں کوئی فتنہ اس امت میں تمھاری خلافت و حکومت سے بڑھ کر نہیں ہے اور میں اپنے نفس، اپنے دین اور امت محمدی کے لیے کسی فائدہ کو اس سے بڑھ کر نہیں سمجھتا کہ میں ان امور میں تمھاری مزاحمت کروں۔ اگر میں ایسا کروں تو بیشک قربت الہی کا موجب ہوگا اور اگر ترک کروں اور خاموش رہوں تو اس کے لیے خدا سے استغفار کروں گا اور اس سے رشد و صلاحیت کا طالب ہوں گا۔“

اس خط سے امام حسینؑ کے تاثرات کا پورے طور پر اندازہ ہوتا ہے اور یہ کہ آپ کسی اہم اقدام کے لیے اپنی ذمہ داری کو محسوس کر رہے تھے۔ لیکن اس کے بعد بھی آپ نے اس وقت تک بالکل خاموشی اختیار کی جب تک کہ معاہدہ کی آخری سانس بھی قائم نہیں جاسکتی تھی۔ اس کے بعد کے واقعات آنے والے ابواب میں تندرناظرین ہوں گے۔

—:—:—

کے ساتھ بتلایا کہ اس مہم کا پورا ہونا کوئی مشکل نہیں ہے۔ کوفہ میں یزید کی موافقت پر لوگوں کو ہموار کرنے کے لیے میں کافی ہوں۔ بصرہ میں زیادہ اس کام کو انجام دے گا۔ ان دو مقامات کے بعد پھر تیسری جگہ کوئی ایسی ہے نہیں جو یزید کی مخالفت کی جرأت کر سکے۔ معاویہ نے مغیرہ کی ان باتوں کو بڑی توجہ کے ساتھ سنا اور اس کو کوفہ کی گورنری پر بحال کر دیا۔ مغیرہ فوراً کوفہ پہنچا اور اس مقصد کی تکمیل میں مصروف ہو گیا۔ اسے اپنی کارگزاری کا نتیجہ جلدی سے معاویہ کی خدمت میں پیش کر کے صلہ حاصل کرنا اور اپنی وفاداری کا سکہ جمانا تھا۔ اس لیے اس نے سب سے پہلے جو خاص بنی امیہ کے ہوا خواہ تھے ان کو بلا کر اپنے مقصد کا تذکرہ کیا اور بتایا کہ خلیفہ المسلمین اس امر کے متعلق مطمئن نہیں ہیں کہ کوفہ کے لوگ اس دلیعہ کی تسلیم کریں گے۔ اس لیے ضرورت ہے کہ یہاں سے ایک وفد ان کی خدمت میں جائے اور یہ التجا پیش کرے کہ وہ یزید کو اپنا دلیعہ قرار دیں۔ پھر بھی ایسے لوگ کم ملتے تھے جو اس وفد میں شریک ہونا پسند کریں۔ اس کے لیے مغیرہ کو اپنی حبیب خاص یا خزائنہ سرکاری سے ہزار درہم رشوت میں صرف کرنا پڑے۔ اس طرح کوفیوں کا ایک وفد مرتب کر کے اپنے بیٹے موسیٰ کی قیادت میں معاویہ سے یزید کی نامزدگی کے لیے درخواست پیش کی۔ معاویہ اس التجا کی حقیقت کو خوب سمجھتے تھے چنانچہ انھوں نے وفد کو مناسب جواب دینے کے بعد علیحدگی میں موسیٰ بن مغیرہ سے پوچھا کہ سچ بتاؤ کتنے پر تھارے باپ نے ان لوگوں کے دین و ایمان کو خرید لیا؟ موسیٰ نے کہائیں ہزار درہم میں۔

معاویہ کو اس معاملہ میں مسلمانوں کی رائے عامہ کے متعلق اب بھی اطمینان نہ تھا۔ انھیں جمہور کی نفرت و بیزاری کا خوف دامن گیر تھا۔ وہ سمجھتے تھے کہ مغیرہ کے اس وفد کو رائے عامہ کا ترجمان نہیں سمجھا جاسکتا۔ اب انھوں نے زیاد بن ابیہ کو جسے وہ سیاسی طور پر اپنا بھائی بنا چکے تھے۔ اس معاملہ میں مشورہ لینے کے طور پر خط لکھا۔ زیاد

سے کامل ابن اثیر

مہاجر کو قید کی سزا دی اور ایک سال کے بعد رہا کیا۔ دوسرا قول یہ ہے کہ عبدالرحمن کے بیٹے خالد بن عبدالرحمن بن خالد بن ولید نے اپنے باپ کے قاتل کو محض جاکر وہیں نہ بیچ کیا۔ اس پر معاویہ نے اس کو تھوڑے دن تک قید کیا، پھر دیت (خون بہا) لے کر رہا کر دیا۔ یہ مسئلہ کا واقعہ ہے۔ ان کے مقربین اور گرد و پیش کے رہنے والے اس کا اندازہ رکھتے تھے کہ معاویہ کی یہ دلی خواہش ہے کہ وہ یزید کو اپنا ولی عہد بنائیں مگر انھیں بھی اس کے بروئے کار آنے کی صورت نظر نہ آتی تھی سب سے پہلے جس نے اس تعلق اور جمود کو حرکت اور عمل میں تبدیل کیا وہ مغیرہ بن شعبہ والی کوفہ تھا۔ یہ شخص بڑا ہی مدبر اور عرب کے نہایت چالاک لوگوں میں محسوب تھا۔ واقعہ پیش آیا کہ مغیرہ نے شاید فقط امتحان کے طور پر دمشق جاکر معاویہ کے سامنے حکومت کوفہ سے استعفا دینے کا خیال ظاہر کیا۔ وہ سمجھتا ہوگا کہ امیر معاویہ مجھے کسی قیمت پر ہٹانے کے لیے تیار نہ ہوں گے اور اس کے بعد میری خواہش ختم کریں گے۔ وہاں معاملہ برعکس ہوا اور معاویہ نے ایک دوسرے شخص کو کوفہ کی حکومت کے لیے تجویز کیا۔ جب یہ صورت پیش آئی تو مغیرہ نے حکومت کوفہ پر برقرار رہنے کے لیے تدبیر کی کہ وہ یزید کے پاس گیا اور اسے یہ پٹی پڑھائی کہ تم اپنے باپ سے دلیعہ کا اعلان کیوں نہیں کرتے؟ کون کہہ سکتا ہے کہ یزید خود ہی اس کے واسطے دل ہی دل میں یحییٰ نہ ہوگا اور اگر اسے شراب و کباب کے مشغلوں میں اب تک اس پر غور کرنے کا موقع نہ بھی ملا ہو تب بھی مغیرہ کا یہ کہنا اس کی دیوانہ طبیعت کے لیے ”ہوئے ہیں است“ سے کم نہ تھا۔ وہ معاویہ کے پاس گیا اور ایک لاد پیر سے پلے ہوئے بے باک بیٹے کی طرح اپنے باپ سے بضد ہو کر اپنی دلیعہ کی خواہش کی اور مغیرہ بن شعبہ کے خیالات کو جو اس بارے میں تھے بیان کیا۔ معاویہ کو تو کبھی اس کی توقع ہوتی ہی نہ تھی کہ کوئی سنجیدہ انسان اس منصب کے لیے یزید کا نام پیش کرے گا۔ انھوں نے جو مغیرہ کی گفتگو سنی تو سمجھے کہ سوکھے دھانوں پانی پڑا۔ انھوں نے مغیرہ کو بلوایا اور اس سے اس بارے میں تبادلہ خیالات کیا۔ مغیرہ نے بڑے اعتماد

واقعات بتاتے ہیں کہ مغیرہ بن شعبہ بڑی حد تک کوفہ کی زمین کو ہموار بنانے کا کام کر چکا تھا اور کم از کم ہوا خواہان بنی امیہ کو اس کے لیے تیار کر لیا تھا۔ بصرہ میں بہر حال عبید اللہ بن زیاد کو اس اسکیم کی تکمیل کرنا لازم تھی۔ چاہے اس کی ذاتی رائے اس بارے میں کچھ بھی ہوتی اور وہاں نئی مخلقت اس کے باپ سے اور خود اس سے اس درجہ مرعوب و خائف تھی کہ وہاں کسی مخالفت کا امکان نہ تھا اور شام تو اپنا ملک ہی تھا۔ لے دے کر وہاں ایک عبدالرحمن بن خالد بن ولید تھے جن سے اندیشہ ہوتا انھیں پہلے ہی ختم کیا جا چکا تھا۔ دوسرے مقتول خلیفہ عثمان کے بیٹے سعید تھے۔ انھوں نے ذرا خلافت یزید پر اظہارِ ناراضگی کیا اور خود معاویہ کے پاس آ کر کہا کہ آپ نے یزید کو کھجور پر مقدم کیا اور اس کے لیے بیعت لی حالانکہ بخدا آپ جانتے ہیں کہ میرے باپ اس کے باپ سے بہتر اور میری ماں اسکی ماں سے اچھی اور میں خود اس سے بہتر ہوں اور آپ کو جو کچھ ملا ہے یہ میرے باپ کا صدقہ ہے۔ یہ سن کر معاویہ نے کہا کہ تم نے جو اپنے باپ کے احسان کا کھجور پر ذکر کیا تو مجھے اس کا انکار نہیں مگر میں نے اس کا عوض یہ کر دیا کہ ان کے خون کا مطالبہ کیا اور قاتلوں سے ان کے بدلہ لیا اور مختار سے باپ کی فضیلت اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ کھجور سے بہتر تھے اور انھیں رسولِ خدا سے قربت کھجور سے زیادہ حاصل

מה

سے بھی ایک عرصہ تک اس نے بعد بدن نہ کیا۔
 ۹۷ھ یا ۹۸ھ میں ستر برس کی عمر میں مغیرہ کا انتقال ہو گیا۔ اب کوفہ میں زیادہ کی
 حکومت ہو گئی۔ وہ ۱۰۰ھ میں معاد کے طرف سے بصرہ، اندلس اور سجستان کا حاکم

<http://fb.com/ranajabirabbas>

کے متعلق ذکر کیا اور کہا معاویہ نے اپنے بیٹے یزید کی بیعت کا اسی طرح حکم دیا ہے جس طرح ابوبکر نے عمر کے لیے بیعت لی تھی۔ یہ سننا تھا کہ عبدالرحمن بن ابی بکر بڑ گئے اور کہا ابوبکر نے اپنے بیٹے کی بیعت نہیں لی تھی۔ یہ تو کسریٰ دقت کا طریقہ ہے۔ ہم ہرگز اس شرابی و زانی کی بیعت نہ کریں گے۔ عبدالرحمن کے خیالات کی تائید حضرت امام حسینؑ، عبداللہ بن زبیر اور عبداللہ بن عمر نے کی۔ جو واقعہ پیش آیا اس کی اطلاع مروان نے معاویہ کو کر دی۔ معاویہ نے کچھ دن تامل کیا۔ پھر یزید کو لے کر حج کے بہانے سے روانہ ہوئے۔ معاویہ کو خوب احساس تھا کہ ان لوگوں کو جنہوں نے خلافت یزید پر اعتراض کیا ہے دنیا نے اسلام میں کیا اہمیت حاصل ہے۔ یہ یاد رکھنے کے قابل بات ہے کہ مسلمانوں کے ہر فرقہ کے نقطہ نظر سے جن جن افراد کو اسلامی معاملات سے دلچسپی کا درجہ پہنچتا تھا وہ سب ہی یزید سے اختلاف رکھنے میں متفق تھے۔ چنانچہ ایک طرف ان میں حضرت حسین بن علیؑ تھے تو دوسری طرف

عبدالرحمن ، ابن ابی بکر

عائشہ ، بنت ابی بکر

عبداللہ ، ابن عمر

عبداللہ ، ابن عباس اور

عبداللہ ، ابن زبیر بھی تھے

ان ناموں کے دیکھنے سے واضح ہو جاتا ہے کہ مسلمانوں میں جو فرقہ بندی آج قائم ہے اس کا کوئی اثر یزید کی ولایت کی دلی عہدی کے جواز پر نہیں پڑتا۔ اصولاً یزید کی دلی عہدی سے اختلاف میں تمام وہ افراد متفق تھے جو کسی فرقہ کے نقطہ نظر سے بھی مذہبی نمائندگی کر سکتے تھے۔ اب یہ اپنا پہنا ثبات قدم اور استقلال ہے کہ کوئی تمام مشکلات کے باوجود آخر وقت تک اپنی اس بات پر قائم رہے اور کوئی پھر حالات سے مجبور ہو جائے لیکن اصول اور آئین کے اعتبار سے ان سب کا متفق ہونا خود ایک بڑی ذہنی حقیقت ہے۔

تھی۔ اسی طرح تھامری ماں کی فضیلت۔ اس میں بھی کوئی شک نہیں کیونکہ قریش کی بزرگی کلبیہ پر ظاہر ہے لیکن یہ بات کہ تم یزید سے بہتر ہو تو معلوم ہونا چاہیے کہ میرے نزدیک اگر تم ایسوں سے میرا گھر بھرا ہو وہ سب مل کر بھی یزید کے برابر نہ ہوں گے۔

وہ تو یہ جواب سن کر اپنا سامنے لے کر رہ گئے ہوں گے مگر پھر کہا جاتا ہے کہ یزید نے اپنے باپ سے سفارش کہ سعید میری وجہ سے کبیدہ خاطر ہو گئے ہیں تو آپ انھیں کسی صورت سے خوش کر دیجیے۔ اس پر معاویہ نے انھیں خراسان کا حاکم بنا دیا۔ اس طرح یہ خدشہ بھی دور ہو گیا۔ شام اور عراق کو ہموار کرنے کے بعد معاویہ نے مکہ اور مدینہ کے متعلق خیال کیا اس زمانہ میں مروان مدینہ کا حاکم تھا۔ معاویہ نے اس کو لکھا کہ ہم نے یزید کو اپنا ولیعہد بنایا ہے اور اس کے لیے ولیعہد کی بیعت لی جا چکی ہے تم خود بھی یزید سے بیعت کر دو اور ہماری طرف سے وہاں مدینہ کے لوگوں سے یزید کے لیے بیعت لو۔ مروان نے جب معاویہ کا حکم پڑھا تو غصہ سے برا فرختہ ہو کر گھر میں گیا۔ گھردلوں اور اپنے ماموں زاد قبیلہ بنی کنانہ کے لوگوں پر بھی اپنی اس ناراضگی اور رنج و غضب کا اظہار کیا اور اسی غصہ میں دمشق کی طرف معاویہ سے خود بات چیت کرنے کی غرض سے روانہ ہو گیا۔ وہاں پہنچ کر معاویہ سے ملا اور اس انداز سے چلتا تھا جس طرح دو برابر کے رشتہ دار ہوتے ہیں۔ معاویہ سے غصہ سے بھری ہوئی تیز و تند تقریریں کیں اور کہا یہ آپ کیا کر رہے ہیں بچھو کر دل کو امیر اور سردار بناتے ہیں۔ اس ارادہ سے باز آئیے۔ یاد رکھیے کہ آپ کی قوم میں ایسے اور بھی موجود ہیں جو آپ کے مشوروں میں شریک اور آپ کے کاموں میں آپ کے وزیر و مددگار رہے ہیں۔ معاویہ نے کہا، مروان خفا نہ ہو۔ تم بیشک غلیفہ وقت کی نظیر ہواؤ۔ ہر مشکل میں اس کے پشت پناہ اور مددگار ہو۔ اس لیے یزید کے بعد تم کو ہی یزید کا ولیعہد ہم نے قرار دیا ہے۔ یہ تمہارا سیاسی منتر جس نے مروان کے غصہ کو ختم کر دیا اور مروان بخیاں خود مطمئن ہو کر مدینہ واپس ہوا۔ مدینہ میں مروان نے ایک جلسہ منعقد کیا اور اس میں یزید کی تخت نشینی

جواز کرتے ہو؟ عبدالرحمن نے کہا اس لیے کہ اس امر کے لیے میں اپنے کو زیادہ مستحق سمجھتا ہوں۔ معاویہ نے کہا کہ میں اس صورت میں تمہارے قتل کا ارادہ رکھتا ہوں عبدالرحمن نے کہا، اگر تم ایسا کرو گے تو لعنت خدا اور سزائے آخرت کے مستحق ہو گے بلکہ

یہ تو خوف دلانے کی ترکیبیں تھیں۔ جب یہ کامیاب نہیں ہوئیں تو دوسری صورت بھی اختصار کی گئی چنانچہ ایک لاکھ درہم عبدالرحمن بن ابی بکر کے پاس بھیجے۔ مگر انھوں نے روپیہ واپس کر دیا اور کہا کہ ہم دین کو دنیا کے عوض فروخت نہیں کریں گے اور مکہ سے ہجرت کر گئے۔ اسی طرح عبداللہ بن عمر کو بھی ایک لاکھ درہم بھیجے گئے، انھوں نے کہا کہ میں بڑھا ہو چکا ہوں اور میرا دین ایک لاکھ درہم سے زیادہ قیمتی ہے۔ یہ کہہ کر روپیہ واپس کر دیا۔ اور امام حسینؑ کو بھی بہت کچھ تحائف اور زر مال پیش کیا گیا تھا مگر آپ نے قبول نہ فرمایا اور واپس کر دیا۔ ازواج رسولؐ میں سے عائشہ نے اس مخالفت میں زیادہ حصہ لیا چنانچہ حافظ جلال الدین سیوطی نے لکھا ہے کہ معاویہ مدینہ میں منبر رسولؐ پر بیٹھ کر یزید کی بیعت لے رہے تھے کہ عائشہ نے اپنے اپنے حجرہ سے پکار کر کہا کہ خاموش ہو جاؤ، کیا کر رہے ہو؟ کیا تم سے پہلے شیخین نے اپنے بیٹوں کے لیے کبھی بیعت لی تھی؟ معاویہ نے کہا کہ نہیں۔ تو عائشہ نے کہا پھر تم کس کی بیعت کر رہے ہو؟ معاویہ بیسنگر شرمندہ ہوئے اور منبر سے اُتر آئے۔

اس سے ظاہر ہے کہ یزید کی ولیعہدی سب کے نزدیک اصول شریعت اور امین اسلام کے خلاف تھی۔ اس کے علاوہ حضرت امام حسنؑ کے ساتھ شرائط صلح میں یہ بات طے پا چکی تھی کہ معاویہ کو اپنے بعد کسی جانشین کے نامزد کرنے کا حق نہ ہوگا۔ اس کے بعد معاویہ کو اپنے بیٹے کا خود نامزد کرنا کسی طرح درست نہیں ہو سکتا۔

یہ سب اس صورت میں بھی تھا کہ جب یزید اپنے کردار کے لحاظ سے اچھا ہی آدمی نہ تھا چنانچہ یزید کے اخلاق و عادات وہ تھے جو کسی شائستہ انسان اور ایک معمولی

معاویہ نے ان لوگوں کو خوف دلا کر بھی دبا دیا چاہا اور لالچ دلا کر بھی مائل کرنا چاہا۔ چنانچہ سب سے پہلے جب وہ مدینہ کے قریب پہنچے تو امام حسینؑ سے ملاقات ہوئی۔ آپ کو دیکھ کر معاویہ نے کہا کہ نہ تمہارے لیے خوشی ہو اور نہ برکت۔ تم ایک قربانی کا دنبہ ہو جس کا خون جوش کھارنا ہے۔ خدا کی قسم یہ خون ضرور گرایا جائے گا۔ امام حسینؑ نے فرمایا، چپ رہو۔ ہم ایسے کلام کے اہل نہیں ہیں۔ معاویہ نے کہا۔ اس سے بھی بدتر کلام کے مستحق ہو۔ پھر اس کے بعد ابن زبیر سے ملے تو ان سے کہا کہ تو ایک پچھے ہوئے مکار سو سمار (گوہ) کے مانند ہے جو سر کو اپنے سوراخ میں ڈال کر دم ملاتا ہے۔ قسم ہے خدا کی عنقریب اس کی دم کپڑی جائے گی۔ دور کر دو اس کو، اور پھر ان کے خچر پر چابک مارا اور ہٹا دیا۔ پھر اس کے بعد عبدالرحمن بن ابی بکر ملے۔ ان کو کہا کہ یہ بڑھا بھی سٹھیا گیا ہے اور اس کی عقل جاتی رہی ہے۔ پھر حکم دیا کہ ان کے سواری کے خچر پر بھی تازیانہ مارا اور ہٹا دو۔ پھر عبداللہ بن عمر سے بھی ایسا ہی سلوک کیا گیا۔ اس کے بعد مدینہ میں داخل ہو کر بھی خلافت یزید کے لیے ان حضرات کو ڈرنے دہانے اور قتل کی دھمکیاں دینے لگے۔

عائشہ نے جو یہ سنا تو غصہ میں معاویہ کے پاس گئیں اور کہا کہ یہ کوئی اچھی بات نہیں ہے کہ تم پہلے میرے ایک بھائی (محمد بن ابی بکر) کو قتل کر چکے اور تم نے لاش ان کی آگ میں جلائی آج مدینہ میں آ کر میرے دوسرے بھائی کو تکلیف پہنچاتے ہو اور ان کے بارے میں سخت الفاظ استعمال کرتے ہو اور فرزند رسولؐ اور عبداللہ بن عمر اور عبداللہ بن زبیر کو بھی ڈراتے دھمکاتے ہو۔ تم ان لوگوں میں سے ہو جنہیں رسولؐ نے رحم کھا کر فتنہ مکہ میں قتل سے آزاد کر دیا تھا۔ تم کو ایسی حرکتیں ہرگز زیب نہیں دیتیں۔

طبری نے معاویہ کا مکالمہ جو عبدالرحمن بن ابی بکر کے ساتھ درج کیا ہے وہ حسبِ قیاس ہے۔ معاویہ نے کہا، اے عبدالرحمن کیسے ہاتھ پیروں کے ساتھ تم میری نافرمانی کرنے کی

تخت نشین ہوئے وہ سب کے سب معاویہ کی مثال کے مطابق اپنے بیٹوں کی بیعت کرتے رہے۔ مسلمانوں کی اس رائے عامہ کی نمائندگی وہ چند اشخاص کر رہے تھے جن کے نام تاریخ میں درج ہیں۔

معاویہ پر یہ امر چھپا ہوا نہیں تھا کہ اس جماعت میں سب سے نمایاں ہستی حسین کی ہے اور اس بنا پر انھوں نے مدینہ میں آکر سب سے پہلا کام جو کیا وہ یہ کہ حسین بن علی کو بلوا کر کہ اس معاملہ میں تمام لوگ ہمارے ہو چکے ہیں۔ سوا پانچ آدمیوں کے قریب میں سے جن کی سرکردگی آپ کر رہے ہیں حضرت نے متعجبانہ انداز سے کہا۔ "میں ان کی سرکردگی کرتا ہوں؟ معاویہ نے کہا، "بے شک آپ ہی ان کے سرغنہ ہیں۔" یہ سن کر حضرت نے فرمایا تو اس کی تدبیر یہ ہے کہ آپ دوسرے لوگوں کو بلوا کر ان سے بیعت کا مطالبہ کیجیے۔ اگر ان سب نے بیعت کر لی تو تمنا مجھ سے آپ کو کسی اندیشہ کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ دفع الوقتی کامیاب ہوئی اور نتیجہ میں معاویہ کی یہ کوشش بیہودہ ثابت ہوئی اور وہ ناامید کے ساتھ شام واپس گئے۔ امام حسینؑ کا بیعت سے انکار سلطنت کے اقتدار کیلئے بڑی سخت ٹھوکری تھی جسے معاویہ کی قوت سیاست دانی سمجھتی تھی مگر اسے حسین بن علی کا ایک بڑا تدبیر چاہیے کہ آپ نے اپنے عمل کو سبکی حد و درجہ رکھا یعنی صرف بیعت نہ کرنا اور سکوت اختیار کرنا۔ آپ جانتے تھے کہ فریق مخالفت ایک وقت میں اس سکوت کو توڑنے کے لیے تشدد سے کام لے گا جس کے لیے آپ تیار تھے مگر آپ یہ نہ چاہتے تھے کہ آپ کی طرف کسی جارحانہ اقدام کا الزام عائد کیا جاسکے۔ دوسری طرف معاویہ نے مجاہد خانہ سیاست اس وقت کی غیبت کو مناسب نہیں سمجھا مگر اس کے بعد نہ معاویہ تدبیر سے غافل تھے اور نہ حسین مستقبل سے بے خبر تھے۔ اصل میں حسینؑ چاہتے تھے کہ میں خاموش رہوں اور حریف تشدد سے کام لے اور معاویہ کا مطلب یہ تھا کہ ہم اپنی طرف سے غی طور پر تشدد کی پہل نہ کریں اور حسینؑ جو شخص میں آکر کوئی ایسا اقدام کر سکیں جو امن عام کو مدہم پہنچانے کی ذمہ داری ان پر عائد کر دے۔

مسلمان کے بھی شایان شان نہیں ہے جو جانیہ خلافت کے لیے جو بہر حال ایک مذہبی عہدہ سمجھا جاتا ہے۔ ڈاکٹر وحید مرزا صاحب لکھتے ہیں۔ "اسلام کے شروع سے حاکم اسلام دین اور دنیا دونوں کا مقتدا سمجھا جاتا تھا۔ مذہب اور سیاست کا یہ اجتماع عقلمندانہ اصول پر مبنی تھا یا نہیں، یہ ایک مختلف فیہ بات ہے جس کے متعلق میں اپنی رائے کا اظہار ضرور کیا نہیں سمجھتا لیکن یہ اصول عام طور پر تسلیم کر لیا گیا تھا اور اس لیے یہ ضروری سمجھا جاتا تھا کہ خلیفہ اسلام میں علاوہ سیاسی قابلیت کے مذہبی اور دینی صفات بھی بدرجہ اتم موجود ہوں۔ اور یہ سب کو معلوم تھا کہ یزید اس لحاظ سے کسی طرح بھی مستحق خلافت نہیں تھا۔" اسی لیے جتنے مجتہد ار انسان تھے سب ہی اس اقدام کو ناجائز یا سمجھ رہے تھے اور اسے ایک مہلک اقدام کی حیثیت سے دیکھتے تھے۔

حسن بصری کا قول تھا کہ معاویہ نے چار باتیں ایسی کیں جن میں سے ایک بھی ہو تو وہی ہلاکت کے لیے کافی ہے۔ اول جاہلوں کی مدد سے بغیر امت کے مشورہ کے انھوں نے خلافت پر قبضہ کر لیا۔ حالانکہ اس وقت اصحاب رسولؐ اور صاحبان فضیلت موجود تھے۔ دوسرے اپنے بیٹے کو جو شراب خوار نشہ باز تھا اور ریشم پہنتا اور طنبورہ بجایا کرتا تھا اپنا بیٹا بنایا۔ تیسرے زنیاد کو اپنے باپ ابوسفیان کا بیٹا قرار دیا حالانکہ رسول اللہؐ نے فرمایا ہے کہ بیٹا اسی کا قرار دیا جاسکتا ہے جو اصلی شوہر ہو اور زنا کار کے لیے بس پیچھے رہے۔ چوتھے قر اور اصحاب ہجر کا قتل کرنا۔

دوسرا قول ان کا یہ بھی تھا کہ مسلمانوں کی تباہی کے ذمہ وار دو شخص ہیں۔ ایک عمرو بن العاص جس نے معاویہ کو قرآن نیرول پر بلند کرنے کی رائے دی تھی۔ چنانچہ وہ بلند چمکیے گئے اور دوسرے متغیرہ جس نے معاویہ کو یزید کی بیعت لینے کا مشورہ دیا۔ اگر متغیرہ کی یہ رائے نہ ہوتی تو قیامت تک انتخاب کا اصول قائم رہتا۔ معاویہ کے بعد جو

گیا رھواں باب

معاویہ کی وفات اور یزید کی تخت نشینی

شہ میں امیر شام معاویہ مرض الموت میں مبتلا ہوئے۔ انھیں اپنی بیماری کے عالم میں اور خصوصاً اس وقت جبکہ صحت سے بالواسطہ ہو گئی تھی شدید احساس تھا کہ انھوں نے یزید کی خلافت تسلیم کرانے میں کتنی محنت و مشقت برداشت کی ہے اور کس درجہ اپنے راحت و آرام اور مال و دولت اور سب سے بڑھ کر ضمیر کی قربانی کی ہے جو روحانی تکلیف کا باعث ہوتی ہے جس کا اظہار انھوں نے بصیغہ راز مردان سے کیا۔ ملاحظہ ہو ابن حجر مکی کی کتاب "تطہیر النجان" جو انھوں نے معاویہ کے مناقب و فضائل میں تصنیف کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ ایک روز معاویہ رونے لگے۔ مروان نے سبب دریافت کیا۔ انھوں نے جواب دیا کہ دنیا میں کون سی راحت تھی جو میں نے نہ اٹھائی ہو۔ اب ہن زیادہ ہو گیا اور ہڈیاں گھل گئیں اور جسم کمزور ہو گیا لیکن اگر مجھ پر یزید کی محبت کا غلبہ نہ ہوتا تو میں اپنے لیے راہ راست کو حاصل کر لیتا۔ علامہ ابن حجر نے اس کی تشریح کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ان الفاظ میں معاویہ نے پورے طور پر اقرار کر لیا ہے کہ یزید کی محبت نے ان کو ہدایت کے راستوں سے اندھا بنا دیا ہے اور اسی فطرۃ محبت نے مسلمانوں کو ان کے بعد ایسے فاسق و فاجر کے ہاتھوں میں مبتلا کر دیا جس نے ان کو تباہ کر دیا۔

پھر یہ فطری بات ہے کہ جتنا زیادہ کسی نے ایک مقصد کے لیے ایثار اور کرد و کاوش کی ہو اتنی ہی اسے اپنے اس مقصد کی کامیابی کی فکر ہوتی ہے اور اس میں کسی خلل

درحقیقت کربا کی جنگ اپنے قریبی اباب کے لحاظ سے شروع نہیں سے ہو گئی مگر یہ اس وقت ایک صبر آزمائشی کا نشانی تھا جو نہ معلوم کب تک جاری رہتی۔ اگر معاویہ کا رشتہ عمر قطع نہ ہوتا اور نوعمر، نا تجربہ کار، غرور و سلطنت سے بدست یزید تخت سلطنت پر نہ بیٹھتا۔



چار آدمیوں سے فوت ہے۔ اول حسین بن علیؑ، دوسرے عبداللہ بن عمرؓ تیسرے عبدالرحمن بن ابی بکرؓ اور چوتھے عبداللہ بن زبیرؓ

اس وصیت سے صاف ظاہر ہے کہ معاویہ بہتر مرگ پر بھی اپنے دل میں تمام درد یزید کا لیے ہوئے تھے۔ ان کو نہ اپنی بیماری کا کوئی خیال تھا نہ اپنی تکلیف کا کوئی تصور۔ نہ اپنے انجام کے متعلق کوئی فکر۔ انھیں اس وقت بھی خیال تھا، تصور تھا اور فکر تھی تو یزید اور صرف یزید کی۔ اور اس کے ساتھ آخر وقت کی پھرائی ہوئی نگاہوں میں بھی صورتیں تھیں تو چار آدمیوں کے لیے ان کے نزدیک ایک خطرہ کی حیثیت رکھتی تھیں۔ جن میں سب سے پہلی تصویر تھی حسینؑ کی۔

رجب سنہ ۴۰ میں معاویہ دنیا سے رحلت کر گئے۔ اڑیس برس کی عمر میں وہ شام کے گورنر بنے تھے۔ ۵۸ برس کی عمر میں وہ خود مختار خلیفہ ہوئے اور ۷۸ برس کی عمر میں اب ان کی وفات ہوئی۔

بعض مورخین کے بیان کے مطابق ان کی عمر اس سے کچھ کم ۷۲ یا ۷۵ اور بعض کے نزدیک اس سے زیادہ پچاسی سال کی تھی۔

یزید کو اس کی شکار گاہ میں اس سانحہ کی اطلاع دی گئی جس کو سن کر وہ دمشق پہنچا۔ ایسے وقت جب معاویہ دفن بھی کیے جا چکے تھے۔ باپ کی بچھائی ہوئی مسند اس کے آنے ہی کی منتظر تھی۔ وہ تخت خلافت پر متمکن ہوا اور تمام اہل شام نے فوراً اس کی بیعت کر لی۔



کے واقع ہونے کا قلق ہوتا ہے۔ معاویہ نے یزید کے لیے کیا کچھ کیا اور اس میں ان کے نزدیک خلل کیا باقی رہ گیا، اس کا تذکرہ انھوں نے خود یزید سے کیا۔ اپنے مرض الموت کی ابتداء میں جبکہ انھوں نے اسے بلا کر کہا۔ بیٹے نے تم کو کوچ اور مقام کی زحمتموں سے بچا دیا اور تمھارے لیے تمام انتظامات مکمل کر دیے اور تمام دشمنوں کے سر تمھارے لیے ختم کر دیے اور تمام قوم عرب کی گردن کو تمھارے واسطے جھکا دیا اور سب کو تم پر مجتمع کر دیا ہے مگر مجھے اس خلافت کے مسئلہ میں جو تمھارے لیے مکمل ہو چکا ہے۔ بس قریش کے چار آدمیوں سے لکھنا ہے حسین بن علیؑ عبداللہ بن عمرؓ عبداللہ بن زبیرؓ اور عبدالرحمن بن ابی بکرؓ۔ ظاہر ہے کہ ان آنکھوں کی سوئیوں کے رہ جانے کا معاویہ کو کتنا خیال اور صدمہ ہوگا اور یہ صدمہ اتنا اتنا بڑھتا جاتا تھا جتنا جتنا ان کی موت کا وقت قریب آتا جاتا تھا۔

لیکن وہ یزید جس کے لیے انھوں نے یہ سب کچھ کیا تھا اپنے بوڑھے باپ کے آخر وقت پاس موجود بھی نہ تھا اور دمشق کے باہر مقام حواریں پر رنگ ریلوں میں مصروف تھا۔ معاویہ نے اپنی حالت دگرگوں پا کر اس کے پاس بلانے کے لیے آدمی بھیجا مگر اس کے آنے میں تاخیر ہوئی تو انھوں نے اپنے پولیس آفیسر ضحاک بن قیس فہری اور اپنے پہرہ داروں کے سردار مسلم بن عقبہ کو بلا کر کہا کہ جب یزید آئے تو میری وصیت اس تک پہنچا دینا اور اسے بتانا کہ میرا حکم اس کے لیے یہ ہے کہ وہ اہل حجاز کے ساتھ مراعات سے کام لے جو لوگ وہاں سے دارالسلطنت میں آئیں ان کا اکرام و احترام کیا جائے اور جو وہاں کے اشراف اور بزرگ یہاں سے دوسرے ان کی بھی وقتاً فوقتاً خبر گیری کی جاتی رہے اور اہل شام کو اپنا دست و بازو اور اپنا چشم و گوش بنائے رکھے اور انھیں شام کے صوبہ سے باہر زیادہ عرصہ تک نہ رکھا جائے تاکہ ان میں دوسرے مقامات کے اخلاق و اوصاف سرایت نہ کریں۔ اس کے بعد یہ بتا دینا کہ مجھے اس کے خلاف صرف

سنہ ہجری ۶۰، سنہ ہجری ۶۱، سنہ ہجری ۶۲، سنہ ہجری ۶۳

ل الاخبار الطوال، طبری ج ۶، ص ۱۸۱، سنہ ہجری ۶۲، ص ۱۸۱، ارشاد ص ۲۰
سنہ کتاب البلدان، سنہ ہجری ۶۲، ص ۱۸۱

جسم پر ہوتی تھی ان باریک اور صاف پوشاکوں سے زیادہ محبوب تھی اور ایک سوکھی روٹی کا ٹکڑا اپنے چھوٹے کے کونے میں بیٹھ کر کھانا مجھے ان صاف اور عمدہ روٹیوں سے زیادہ مرغوب تھا اور وہ درہ ہائے کوہ میں ہواؤں کے تھپڑے کی صدا میرے لیے طبیبوں کی آواز سے زیادہ دلکش تھی اور وہ کتا جو ہمالوں کے آنے کے وقت بھونکتا تھا ان خوبصورت سدھی ہوئی مرغابیوں سے زیادہ محبوب تھا۔ اور وہ سرکش اونٹ جو ہودجوں کو لے کر چلتا تھا مجھے اس زین و لجام سے آراستہ خچر سے زیادہ پسند تھا، اور میرے قوم و قبیلہ کا ایک دُلاپتا حقیقہ آدمی مجھے ایک بدخو مسٹنڈے سے زیادہ محبوب تھا۔

جب معاویہ آئے تو اس خواص نے یہ قصہ معاویہ سے دہرایا یا یہ کہ معاویہ نے میسون کو یہ اشعار پڑھتے خود سن لیا۔ بہر حال ان کو بڑا غصہ آیا اور انھوں نے کہا کہ سب تو سب اس نے مجھ کو سخت بدخو مسٹنڈا بنایا۔ میں اس کو تین طلاق دیتا ہوں۔ جاؤ اس سے کہو کہ وہ جو کچھ محل میں ساز و سامان ہے سب کچھ لے لے اور چلی جائے چنانچہ اسے نجد میں اس کے عزیزوں کے یہاں بھجوا دیا گیا۔ اس حالت میں کہ یزید اس کے پیٹ میں تھا۔ ۲۲ھ میں یزید کا تولد ہوا۔ دو برس کے بعد جب معاویہ کو اس کی اطلاع ہوئی تو انھوں نے اس کو وہاں سے بلوایا۔ جو بانی ہی کی عمر سے وہ فسق و فجور اور لہو و لعب میں مبتلا ہو گیا اور سن کے ساتھ ساتھ اس کے ان اوصاف میں بھی ترقی ہوتی گئی سچنچہ مختلف جانوروں کے ساتھ اس کے رکیک حرکات کا تاریخ میں مختلف صورتوں سے چرچا موجود ہے۔

علامہ دیمیری نے لغت "ہند" کے تحت میں لکھا ہے کہ سب سے پہلے اس کو گھوڑے پر سوار یزید بن معاویہ نے کیا ہے۔ دوسرے مقام پر لکھا ہے کہ یزید کے ایک بستہ رکو گدھے پر بیٹھنے کی مشق کرانی گئی تھی اور گھوڑ دوڑ میں اس کا بڑے شہسواروں سے مقابلہ کرایا جاتا تھا اور ایک مرتبہ وہ تمام شہسواروں سے سبقت لے گیا تو یزید نے اس بارے

۲۰ھ حیوۃ الحیوان ج ۲ ص ۲۵۹ ۲۱ھ طبری ج ۴ ص ۲۵۹ ۲۲ھ حیوۃ الحیوان ج ۲ ص ۲۵۹

بارہواں باب

یزید تاریخ کی روشنی میں

یزید کی ماں میسون بنت بحدل بن انیف کلبیہ ایک صحرائی عورت تھی جو شہری زندگی سے نفرت کرتی تھی مگر وہ اپنے حسن و جمال کی بدولت معاویہ کی بہت منظور نظر ہو گئی تھی اور انھوں نے اس کے لیے غوطہ کے مقابل ایک قصر تعمیر کرایا تھا جہاں سے اس پرنزہت جگہ کی سیر دور تک ہو سکتی تھی۔ اور اس قصر میں بڑے آرائش کے سامان اور سونے چاندی کے برتن اور دیبائے رومی کے رنگارنگ اور منقش فرش مہیا کیے تھے۔ اور بہت سی حین و جمیل کنیزی خدمت کے لیے دی گئیں۔ ان شاہانہ انتظامات کے ساتھ میسون کو اس محل میں اتارا گیا تھا مگر یہ سب کچھ اس صحرائی عورت کی نگاہ میں خاک تھا۔ اس لیے کہ اسے تو اپنا جنگل اور اس میں چرتی ہوئی بھیر بکریاں یاد آتی تھیں۔ ایک دن معاویہ کے محل میں آنے کا وقت تھا اور میسون ایک بہترین پوشاک پہن کر اور قیمتی زیورات پہن کر اور خوشبو لگا کر کنیزوں کے جھرمٹ میں اس کھڑکی کے سامنے بیٹھی تھی جو کہ غوطہ کے مرغزار کی طرف تھی۔ اس کو وہاں کے درخت نظر آ رہے تھے اور طائروں کے نغموں کی صدا اور پھولوں کی خوشبو آ رہی تھی۔ اس وقت اسے اپنا تجدد کا بادبہ اور ہچولیاں اور سہیلیاں یاد آئیں۔ جس کی بنا پر وہ بسیاختہ رونے لگی اور ٹھنڈی سانسیں بھرنے لگی۔ ایک خواص نے رونے کا سبب دریافت کیا۔ میسون نے ایک لمبی سانس لی اور کچھ اشعار پڑھے جن کا مضمون یہ تھا "یقین سمجھو کہ وہ ڈیرا جس میں چوبانی ہوا کے بھونکے آتے رہتے تھے مجھے اس عالی شان محل سے زیادہ محبوب ہے اور وہ بالوں کی عجا جو میرے

۲۱ھ طبری ج ۲ ص ۲۵۹ ۲۲ھ

خیالات بھی ایسے ہی تھے۔ وہ اپنے افعال پر منفعل نہیں ہوتا تھا بلکہ ان پر نازاں تھا۔ اس کا مظاہرہ اس کے دیوان کے ان اشعار سے ہوتا ہے جن میں اس نے احکام شریعت کا مذاق اڑایا ہے بلکہ قرآن و حدیث کے ساتھ مسخر کیا ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ اشعار میں اکثر باتیں عین واقعی بھی نظم ہو جاتی ہیں اور ان کے بیانات اکثر تخلیقی پیرایہ رکھتے ہیں مگر اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ خیالات ویسے ہی دماغ میں آتے ہیں اور اشعار ویسے ہی تراش کر تے ہیں جیسا انسان کا مذاق طبیعت ہوتا ہے۔ ایک دیندار متقی اور پرہیزگار شخص سے ممکن نہیں ہے کہ وہ اشعار میں خدا یا رسول یا ائمہ دین کے ساتھ اس طرح کی جراتیں کرے جو انتہائی مسخارت آمیز ہوں۔ یزید کے اشعار اسی طرح کے ہیں۔

وہ صرف لذائذ سے متمتع نہیں ہوتا تھا بلکہ نظریہ بھی رکھتا تھا۔ دیکھا جائے تو عمر خیام کا یہ فلسفہ کہ آخر میں فنا ہونا ہے اس لیے جتنا ممکن ہو دنیا میں مزے لوٹ لو ختام سے پہلے یزید کے ذہن پر تشکیل پا چکا تھا۔ چنانچہ وہ کہتا ہے کہ

اقول الصبح ضمنت الکاس شملہم وداعی مباحات الہی یاتونہم
خذوا بنصیب من نعیم ولذۃ فکل وان طال السدی یتصرم

”ان ساتھیوں سے جنہیں ساغر شراب نے ایک مرکز پر جمع کر دیا ہے اور جن کے سامنے عشق و محبت کے محرکات نغمہ سرائی کرتے ہیں میرا قول ہے کہ جتنا ممکن ہو عیش و لذت سے بہرہ ور ہو لو کیونکہ کتنی ہی مدت ازلانی ہو آخر میں تو ختم ہی ہونا ہے“

نماز اور شراب بخاری کا موازنہ کرتے ہوئے اس نے ایک شعر میں کہا ہے

اقال ربک ویل للالۃ شربوا بل قال ربک ویل لمصلین
یعنی ”خدا نے شراب خواروں کو عذاب سے ڈرانے کے لیے ویل الارمین کہیں

میں شرع کے جن کا مضمون یہ تھا کہ کوئی میری طرف سے کہہ دے اس بندہ سے جو ایک گدھی کی پشت پر بیٹھ کر گھوڑوں سے آگے نکل گیا کہ اے ابو قیس جب تو اس پر سوار ہوا کر تو اس سے پیٹا رہا کیونکہ اگر تو گر کر مر گیا تو اس گدھی سے کوئی باز پرس بھی نہ ہو سکے گی بلکہ یزید نے اپنے بندہ کی کمینت ابو قیس قرار دی تھی اور اپنے ساغر کی کچی ہوئی شراب اسے پلایا کرتا تھا اور کہا کرتا تھا کہ یہ بنی اسرائیل کا ایک بزرگ ہے جس نے گناہ کیا تھا تو وہ مسخ ہو گیا اور وہ اس کو ایک گدھی پر سوار کرتا تھا جو اسی مقصد سے سارھائی گئی تھی اور گھوڑ دوڑ کے میدان میں وہ اسے گھوڑوں کے ساتھ چھوڑ دیتا تھا۔ ایک روز وہ گدھی آگے بڑھ گئی تو یزید بہت خوش ہوا اور یہ شعر پڑھے :-

”اے ابو قیس اس کی ہمارے پیٹ رہا کر، اگر تو گر پڑا تو اس پر کوئی ذمہ داری نہ ہوگی۔ اس گدھی نے یہ کار نمایاں کیا ہے کہ وہ تمام گھوڑوں سے آگے نکل گئی ہے۔“

یہ تو اس کے لغو افعال تھے۔ اس کے علاوہ شراب بخاری اس کی ضرب المثل تھی۔ چنانچہ عبداللہ بن زبیر نے نام ہی اس کا ”سکران“ یعنی بدست رکھ لیا تھا۔ وہ کسی موقع پر مصلحتاً بھی اس عادت کو ترک کرنے پر تیار نہ ہوتا تھا۔ چنانچہ جب ولی عہدی کے دور میں معاویہ کے حکم سے وہ مکہ و مدینہ میں اپنا اثر و رسوخ جمانے کے لیے حج کو گیا تو مدینہ رسول میں پہنچ کر بھی مصاحبوں کے جھگڑنے میں شراب کا دور ضرور چلایا۔

واقعی نے عبداللہ بن حنظلہ غسیل الملائکہ کی زبانی نقل کیا ہے کہ خدا کی قسم ہم کو یزید کی حکومت میں یہ خوف ہو گیا تھا کہ اب آسمان سے ہم پر پتھر برسے گا۔ وہ ایسا شخص تھا جو اپنی سوتیلی ماؤں اور اپنی بیٹیوں اور مہنوں تک کو نہ چھوڑتا تھا اور شراب آزادی سے پیتا تھا اور نماز کو ترک کرتا تھا۔

اتنا ہی نہیں کہ وہ عملی حیثیت سے ایک لاابالی اور گنہگار شخص تھا بلکہ اس کے

فان الذی حدثت عن یوما بعثنا
احادیث طسم تجعل القلب ساهیا
ولا بدلی من ان ازور محمدا
بشمولة صفراء تردی عظامیا

”اے نازنین محبوبہ مجھے سنا اور بلند آواز سے سنا اور گاکر پڑھ، مجھے چپکے چپکے گفتگو اچھی نہیں معلوم ہوتی۔ سنا ابوسفیان کا وہ پرانا قصہ، اُحد میں اسکا کا زمانہ جہاں اس نے دشمنوں کے گھر میں ماتم برپا کر دیا تھا۔ ہاں اسی افسانہ کے ساتھ مجھے شراب پلاتی جا، وہ شراب جسے شام کے بہت منتخب انگور سے بنایا گیا ہو۔ ہم جب قدیمی غلدرآمد پر نظر ڈالیتے ہیں تو ہمیں اس کا پینا حلال ہی نظر آتا ہے اور اگر میں مرہاؤں اے نازنین محبوبہ تو تو کسی اور سے نکاح کر لینا اور یہ امید نہ کرنا کہ اس جدائی کے بعد کبھی پھر ملاقات ہوگی۔ دوسری زندگی کے متعلق تو نے جو قصے سنے ہوں گے وہ پاریزہ قصے ہیں جو انسان کے دل کو نادانی میں مبتلا کرتے ہیں۔ یہ یقینی ہے کہ میں محمدؐ کا سامنا کروں گا ایسی شراب کے نشہ میں مست رہ کر جس کا اثر میری ہڈیوں تک پہنچ گیا ہو۔“

ان اشعار سے صاف ظاہر ہے کہ اس کے دل میں بجاہلیت کے خیالات اور بدرو اُحد کا مشرکانہ جذبہ اور حضرت محمد مصطفیٰؐ سے ضد اور کد کا جذبہ موجود تھا۔ ان کے ساتھ آگے چل کر وہ اشعار بھی آئیں گے جو اس نے قبل حسینؑ کے بعد اور اہل بیتؑ کے شام میں وارد ہونے کے وقت کہے ہیں تو وہ بھی انہی خیالات کے حامل نظر آئیں گے۔ اس سب کے باوجود یہ سیاست دنیا کی ستم طریقہ نہیں تو اور کیا تھا کہ ایسا شخص اسلامی خلیفہ اور ایک حیثیت سے جانشین رسولؐ اور امیر المومنین بنکر بیٹھ گیا تھا اور مسلمانوں کی اکثریت اس کی اس حیثیت کو تسلیم کر رہی تھی۔ اس کا اثر عام مسلمانوں کے اخلاق پر کیا پڑ سکتا، سوا اسکے کہ ان میں بھی مذہبی بے حسی بلکہ مذہب کو نگاہ حقارت سے دیکھنے کا جذبہ اور وہی عیش و نشاط کی گرم بازاری پیدا ہو جاتی، چنانچہ ایسا ہی ہوا۔

نہیں کہا بلکہ قرآن میں نماز گزاروں کو ”ویل للمصلین“ کہا ہے۔
ایک جگہ اس نے شراب کے بارے میں اس طرح کہا ہے

فان حومت یوما علی دین احمد
یعنی اگر دین احمدؑ میں شراب پینے کو حرام سمجھا گیا ہے تو خیر دین مسیحؑ پر ہو کر ہی پانی لو
اس نے آخرت کی نعمتوں کا موازنہ نعمہ و شراب سے کرتے ہوئے یوں کہا ہے
معشر الذمان قوموا
واشربوا کأش مدام
شغلتنی لعمۃ العید
وتعوّضت عن الحو
واسمعوا صوت الاعانی
واشربوا کأش مدام
ان من صوت الاذان
رججو زانی الدّان
”اے حریفان شراب اٹھو اور گانوں کی صدا سنو، ساغر شراب پیو اور دوسری باتوں کا ذکر چھوڑ دو۔ مجھ کو تار اور سارنگی کے نغموں سے اذان کی آواز سننے کی فرصت نہیں اور حوروں کے عوض میں نے شیشہ کی پری کو پسند کر لیا ہے۔“

یوں تو یہ اشعار تفریح طبع کا ذریعہ بھی بن سکتے ہیں مگر ان میں خور و قصور کی خیروں کا مضحکہ ضرور مضمر ہے۔ اتنا ہی نہیں بلکہ اس نے حشر و نشر کے انکار کو بالکل صراحت کے ساتھ ظاہر کر دیا ہے۔ اپنے ان اشعار میں سے

بذلک اتی لا احب التناجیا
علیہ ہا قی واعلنی وترتبی
حدیث ابی سفیان قدما سماہا
الاهات سقینی علی ذاک فہوۃ
تخیرھا العسی کرما شامیا
اذا ما نظرنا فی امور قدیمۃ
وجدنا حلالا شرہا متوالیا
وان مت یا امّ الاحیمر فانکی
ولا تاملی لعد الفراق تلاقیا

عظمت، اہمیت اور نتیجہ کے لحاظ سے یہ تاثیر پیدا ہو ہی نہیں سکتی تھی اگر اس کا تعلق حسینؑ ایسی عظیم المرتبت ذات کے ساتھ نہ ہوتا۔

یوں تو واقعہ کر بلا خود ہی ایسے نادر خصوصیات رکھتا ہے کہ بحیثیت واقعہ اس کی مثال کوئی مل ہی نہیں سکتی لیکن ان خصوصیات سمیت بھی اس کی تاثیر کا بڑا تعلق اس چیز کے ساتھ ہے کہ وہ حسینؑ ایسی بلند ہستی کے ساتھ متعلق ہے۔ کوئی معمولی شخص ایسا کر ہی نہیں سکتا تھا اور بقرضِ محال کرتا بھی تو اس کی یہ تاثیر نہیں ہو سکتی تھی۔ اس لیے واقعہ کر بلا کا وقوع بھی حسینؑ کے نفس کی انتہائی عظمت کا ثبوت ہے اور اس کی وہ تاثیر بھی جو عالم اسلام میں پیدا ہوئی حسینؑ کے نفس کی رفعت و بلندی اور آپ کی شخصیت کی بڑتری کی دلیل ہے۔

مگر یہ نقطہ بھی پیش نظر رکھنا ضروری ہے کہ شخصیت اور کردار کا باہمی تعلق ایک متعکس نتیجہ رکھتا ہے یعنی کسی خاص علی کارنامہ میں اہمیت اور تاثیر پیدا ہوتی ہے۔ شخصیت کی رفعت و شہرت اور سر بلندی سے اور پھر اس انسان کی شخصیت و عظمت میں اضافہ ہو جاتا ہے اس کردار سے۔ اس لیے کوئی شبہ نہیں ہے کہ اگرچہ واقعہ کر بلا کا وجود میں آنا اور پھر اس میں یہ تاثیر پیدا ہونا ممکن نہ تھا بغیر امام حسینؑ کے، مگر امام حسینؑ کی شخصیت کی ہمہ گیری اور رہنمائی ان عالم میں آپ کی امتیازی فوقیت کے آفتاب کا بلا تفریق مذہب و ملت ہر واقف اور منصف شخص کی نگاہ میں خط نصف النہار پر پہنچتا بھی واقعہ کر بلا کے سبب سے تھا، یہی وجہ ہے کہ واقعہ کر بلا سے پہلے کی آپ کی زندگی تاریخ کے صفحات پر اس حد تک محفوظ نہیں ہے جتنے کہ واقعہ کر بلا کے دوران میں آپ کی سیرت کے خط و خال اپنے چھوٹے سے چھوٹے جزئیات کے ساتھ محفوظ ہیں۔ سبب اس کا صاف ظاہر ہے۔ واقعہ کر بلا کے پہلے امام حسینؑ کو مورخین کی نگاہ بس اس حد تک دیکھ سکتی تھی جتنا کہ آپ کے بڑے بھائی حضرت امام حسنؑ یا آپ کی اولاد میں ان اماموں کو وہ دیکھ سکی جن میں سے ہر ایک تقویٰ عصمت اور پاکبازی کا مجسمہ تھا۔ جیسے کہ اصوات و کردار کے متعلق کبھی اجمال اور کبھی کچھ تفصیلاً کے ساتھ بعض واقعات

تیرھواں باب

امام حسینؑ کے بلند اخلاق و کمالات اور گراں قدر مقولات

عرب کے ایک فلسفی شاعر نے کہا ہے۔ ان العظام کفوها العظام ”بڑے کا زانو کے لیے بڑے ہی نفوس درکار ہوتے ہیں“ ایک دوسرے شاعر نے کہا ہے۔

علي قدراهل العزم تأتي العزائم وتأتي على قدر الكرام المكارم
ويكبر في عين الصغير صغارها وتضع في عين العظيم العظام

(یعنی) ”صاحبان ارادہ کی شخصیت کے مطابق ہی ہوتے ہیں ان کے ارادے اور بزرگ مرتبہ نفوس کی مناسبت ہی سے ہوتی ہیں ان کی بزرگیاں، چھوٹے آدمی کی نگاہ میں چھوٹا سا کام بھی بڑا معلوم ہوتا ہے۔ اس لیے اول تو وہ اس کے کرنے کی ہمت نہیں کرتا اور اگر کر بھی لیتا ہے تو اس کو اپنا سب سے بڑا کارنامہ سمجھ کر اس پر نازاں ہو جاتا ہے اور بڑے کی نگاہ میں بڑا کام بھی چھوٹا معلوم ہوتا ہے اس لیے وہ اسے گر گزرتا ہے اور اس پر بھی اس کا دل نہیں بھرتا بلکہ اس سے بھی بڑے کارنامہ کے لیے تیار رہتا ہے۔“

اس نقطہ نظر سے دیکھا جاتا ہے تو مجاہدہ کر بلا ایسے عظیم الشان کارنامہ کا حامل ہونا ہی حسینؑ کے نفس بزرگی اور ان کے کردار کی رفعت کے متعلق وہ سب کچھ بتا دیتا ہے جس کا شاید پورے طور پر اندازہ کرنا اور پھر اسے واضح طور پر الفاظ کے ذریعہ سے پیش کرنا مورخین کے تصور اور تحریر کی طاقتوں سے باہر تھا۔

حقیقت یہ ہے کہ واقعہ کر بلا کے نادر خصوصیات عالم وقوع میں آ ہی نہ سکتے تھے۔ اگر ان کے انجام دینے کے لیے حسینؑ کے ایسے بلند نفس کا انسان موجود نہ ہوتا اور واقعہ کر بلا میں

کرتی ہے حضرت امام حسینؑ میں تینوں باتیں بدرجہ اتم پائی جاتی ہیں، آپ کے خاندانی خصوصیت وہ تھے جن کی نظیر دوسرے شخص میں پائی نہ جاتی تھی اور یہ خصوصیت وہ تھی جس کے لحاظ سے آپ کے مخالف گروہ کو اپنی فوقیت ثابت کرنے کے لیے کوئی دلیل نہ ملتی تھی سوا اظلم و جبر اور قہر و استبداد کے۔ انھیں ایک خاص احساس کمتری کے ساتھ آپ کے بلند خصوصیات کو خود اپنی زبان پر لانا پڑتا تھا اور جواب دینے ہی کے ارادہ سے ان کا اعتراف کرنا پڑتا تھا چنانچہ زید نے بھی اپنے دربار میں اس کا اقرار کیا کہ بے شک ان کی ماں میری ماں سے بہتر اور ان کے نانا میرے نانا سے بہتر تھے۔ لہٰذا ان خاندانی خصوصیات کے ساتھ جو ظاہری اسباب کی بنا پر حسن فطرت کے ضامن ہیں حسینؑ نے تربیت ایسی بلند پائی تھی جس سے انسان کے اخلاق و اوصاف میں بلندی پیدا ہونا لازمی ہے۔ اس کے علاوہ آپ کو مختلف حالات اور متضاد واقعات کے ایسے دور سے گزرنا پڑا تھا جس میں انسان کو جذبات نفس کے خلاف عقل کی طاقت سے کام لینا پڑتا ہے اس لیے نفس میں پختہ کاری، تدبیر اور استقلال پیدا ہونا لازمی ہے۔

ان واقعات سے ایک ایسا شخص بھی جو امام حسینؑ کی بحیثیت ایک معصوم ذات کے معرفت نہ رکھتا ہو، یہ ماننے کے لیے مجبور ہے کہ حسینؑ کوئی جذباتی انسان نہ تھے۔ وہ متحلی اور بردبار تھے اور کبھی غصہ اور ہوش میں آکر کوئی کام ایسا نہ کرتے تھے جو نظم و ضبط اور سکون کے خلاف ہو۔ سخت سے سخت مواقع پر خاموشی آپ کا ایک مستقل کردار بن گئی تھی بشرطیکہ اس خاموشی سے اُن مقاصد کو کوئی ضرر نہ پہنچے جن کے وہ خود اور ان کے نانا، باپ اور بھائی محافظ رہے تھے۔ ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ ایسی صلح کُل متحلی اور امن پسند ذات کسی ایسے اقدام کے لیے تیار نہیں ہو سکتی جس میں وہ اور اُس کے تمام ساتھی ایک دم تہ تیغ ہو جائیں۔ جب تک ایسے اہم اور غیر معمولی اسباب پیدا

۲۶ ج ۶ ص ۲۶

سختی، عبادت، ریاضت و حلم وغیرہ کا تذکرہ ہے اسی طرح امام حسینؑ کے متعلق بھی جتنی حجتہ اس قسم کے مختلف واقعات اور حالات کا تذکرہ صفحات تاریخ پر پایا جاتا ہے۔ اس وقت کے تاریخی واقعات محفوظ کرنے والوں کو سنہ ۶۰ کے پہلے تک کیا معلوم تھا کہ آپ ایک ایسا عظیم کارنامہ انجام دینے والے ہیں جس کی مثال تاریخ کے صفحات پر ناپید ہوگی تاکہ وہ ابتدائے عمر سے آپ کی زندگی کے ہر جزئیہ کو محفوظ رکھنے کی کوشش کرتے اور انھیں سینہ بہ سینہ محفوظ کر کے لب بہ لب منتقل کرتے ہوئے کتابوں کے دامن تک پہنچاتے۔ لیکن ایک طرف تو واقعہ کربلا کے دوران میں ہتھیدی یا ضمنی طور پر تاریخ نے جو مختلف اخلاقی واقعات اور حالات حضرت امام حسینؑ کے بیان کر دیے ہیں وہ آپ کے سیرت و کردار کا ایک آئینہ پیش کرتے ہیں، دوسری طرف آپ کی سابقہ زندگی کے متعلق جن روایات کو تاریخ نے ہم تک پہنچایا ہے ان سے بھی آپ کی عظمت اور اوصاف و کمالات کے متعلق ایک روشن منظر ہماری آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت امام حسینؑ صرف ایک مظلوم اور ستم رسیدہ، شہید ہونے کے لحاظ ہی سے دنیا کے قلوب کا مرکز نہیں ہیں بلکہ آپ کے ذاتی خصوصیات اور اوصاف و کمالات بھی آپ کو دنیا کا قبلہ بنانے کے لیے کافی تھے جن سے آپ انسانیت کی معراج بلندی میں سب سے زیادہ رفیع درجہ پر نظر آتے ہیں۔ ظاہری حیثیت سے ماہرین نفسیات کے نقطہ نظر سے شخصیتوں کی تشکیل کے اسباب حسب ذیل ہوتے ہیں۔

پہلے خاندانی خصوصیات اور بزرگوں کے قدیم روایات۔ دوسرے ماحول اور تعلیم و تربیت تیسرے زندگی کے اہم تجربات۔ پہلی چیز وہ ہے جو انسان کے خون میں دوڑ کر اس کی صلاحیت اور استعداد اور فطری قابلیتوں کی تشکیل کرتی ہے۔ دوسری چیز ان صلاحیتوں کو فعلیت کے درجہ سے قریب تر پہنچانے کا کام انجام دیتی ہے یا بااوقات فعلیت میں لے آتی ہے اور تیسری چیز ان فعلی کمالات میں پختگی پیدا کر کے مکمل ذاتی بناتی اور ان میں استحکام پیدا

حسینؑ بے شک ذاتِ الہی کا ثبوت اور اس کی بڑی نشانی تھے۔ اسی لیے خدا کو نہ ملنے والوں کا بھی حسینؑ کو دیکھ کر دل چاہنے لگتا ہے کہ خدا کو مان لیں یا ماننے لگتے ہیں۔ جیسا کہ جوش ملیح آبادی نے کہا ہے کہ

ہاں وہ حسینؑ جس کا ابد آشنائیاں کتا ہے گاہ گاہ حکیموں سے بھی یہ بات
یعنی درون پر وہ صد رنگ کائنات اک کار ساز ذہن ہے اک ذی شعور ذات
سجدوں سے کھینچتا ہے جو مسجد کی طرف
تہا جو اک اشارہ ہے معبود کی طرف

عبادت آپؑ کی یعنی وہ جسے عام طور پر عبادت سمجھا جاتا ہے درنہ حقیقت کے لحاظ سے تو آپؑ کا ہر عمل رضائے پروردگار کی غرض سے اور فرض کے احساس کا نتیجہ ہوتا تھا۔ اس لیے کوئی حرکت و سکون بھی آپؑ کا عبادت سے باہر نہ تھا مگر اس محدود مفہوم کے لحاظ سے بھی جس کے اعتبار سے لوگ انسان کو عابد کہتے ہیں آپؑ کی عبادت دنیا کے لیے ایک بے مثال نمونہ تھی۔ رات دن کی نماز گزاری اور مسلسل روزہ داری کے علاوہ ۲۵ حج آپؑ نے پایادہ کیے۔

ان تمام حجوں کے واقعات اور زمانہ کی تفصیل سے ہمارے موجودہ معلومات کوتاہ ہیں ایک مرتبہ کے سفر حج کا تذکرہ یہ ملتا ہے کہ خلیفہ ثالث کے زمانہ میں امام حسینؑ اپنے والد بزرگوار جناب امیرؑ کی معیت میں حج کے لیے متوجہ ہوئے مگر آپؑ سقیاء اور عرج کے درمیان فتنے کہ بیمار پڑ گئے۔ عبداللہ بن جعفرؑ آپؑ کو اٹھا کر اپنے ساتھ لے گئے۔ حضرت علیؑ شاید کچھ آگے بڑھ چکے تھے۔ آپؑ کو بھی خبر دی گئی۔ آپؑ آسمانِ بنتِ خمیس کو لے کر تشریف لائے تقریباً بیس دن تک اور ایک روایت کے مطابق چالیس دن تک تیمارداری ہوئی رہی تب آپؑ صحت یاب ہو کر مدینہ واپس آئے لیکن یہ واقعہ اگر درست ہو تو اس

۱۔ تہذیب الاسماء نووی ج ۲ ۲۔ تفسیر جامع البیان طبری ج ۲ ص ۲۷۲

نہ ہو جائیں جن کے بعد وہ ایسا کر گزرنے خالق کی طرف سے اپنا فرض سمجھے چنانچہ جب ایسی صورتیں پیدا ہو جاتی ہیں تو وہ ایسا کر گزرتا ہے اور اس سے اُس کے نفس کی ارادی طاقت اور عملی قوت کی پختگی اور اپنے ذاتی جذبات کو فرض کے مقابلہ میں فنا کر دینے کی وہ بلند منزل ظاہر ہوتی ہے جس پر ہر انسان نہیں پہنچ سکتا۔

نفسانیت کی فنا اور فرض شناسی کا مالک یہی وہ ایک جامع اور وسیع مفہوم ہے جس کے تحت میں انسانی کردار کے تمام مظاہرات جزئی و کلی طور پر داخل ہو جاتے ہیں مگر حضرت حسینؑ کے کمالات و اوصاف کی تشریح کے لیے جب اہل معرفت نے قلم اٹھایا تو اس پر اجمالی تبصرہ کے لیے بھی بلند ترین الفاظ تلاش کرنا پڑے اور تفصیل کے موقع پر بھی زیریں روایات سامنے آئے۔ ابن ابی شیبہ مشہور محدث نے امام حسینؑ کا حال درج کرتے ہوئے لکھا ہے کہ کانِ عالمہا بالقرآن عامل علیہ، زاهد اتقیا ورعاجواد افصیحا بلیغا عادفا باللہ و دلیلا علی ذاتہ تعالیٰ۔ آپؑ قرآن کے عالم اور اس پر عامل، زہد و تقویٰ کے جوہر کے حامل، پاکیزہ خصال، پرہیزگار، سخی، شہسبزیں بیان اور شیوا زبان خدا کی معرفت رکھنے والے اور ذاتِ الہی کا ایک ثبوت تھے۔

آخری فقرہ سے ظاہر ہے کہ لکھنے والا پہلے تو اوصاف کے اظہار میں مجبوری ان الفاظ کو صرف کرتا رہا جو معمولی درجہ کے علماء اور زہاد کے متعلق بھی صرف ہوتے رہتے ہیں پھر اس کا حوصلہ اظہار ان الفاظ کی کوتاہی سے تنگی کرنے لگا اور اس نے آخری الفاظ میں صفات انسانی کی معراج کمال کا پتہ دے دیا کہ وہ اپنے خالق کے اوصاف کا مظہر بن جائے۔ علامہ ابن عربیؒ نے اسی لیے پہلے ہی کوتاہ دامن الفاظ کے دفتر کو تہہ ہی رکھنا مناسب سمجھا اور انھوں نے کہہ دیا کان الحسین السبط ائیمۃ من آیات اللہ۔ سبط رسولؐ امام حسینؑ حسد کی نشانیوں میں سے ایک بڑی نشانی تھے۔ یہ اختصار بیان اوصاف میں وہ ہوتا ہے جو ہزار تفصیلات سے بڑھ کر فائدہ دیتا ہے۔

ساتھیوں نے اس طرح گزاری کہ لہم ددقی کد دق الخصل یعنی ان کے تسبیح و تہلیل اور ذکر و مناجات کی آواز زرات کے تاریک سناٹے میں اس طرح گونج رہی تھی کہ جیسے شہد کی مکھی کے چھتے سے آواز بلند ہوتی ہے۔ اور دوزخ عاشر ایلے سخت دقت میں نماز جماعت ادا کی جب کہ موت کا بازار گرم تھا۔ کربلا کی زمین پر خون کی بارش الگ تھی۔ تیروں کی بارش الگ تھی اور گرمی سے آگ الگ برس رہی تھی مگر اس موقع پر ظہر کی نماز جماعت کے ساتھ یوں ادا ہوئی کہ دو جہان نثار دل کو محافظت کے لیے سلسلے کھڑا کیا کہ جو تیر آئے اسے اپنے سینہ پر رکھیں۔ ادھر نماز تمام ہوئی اور ادھر ان میں سے ایک صحابی سعید بن عبد اللہ حنفی زخموں سے چوڑ ہو کر زمین پر گرے۔ اس طرح حسینؑ نے خالق کی عبادت اور فرائض نماز کی اہمیت دنیا میں ثابت کی۔

اسی کے ساتھ آپ فیاض تھے۔ اور خلق خدا کو فائدہ پہنچانے کی فکر رکھتے تھے۔ اس کے واقعات تاریخ میں بکثرت ملتے ہیں۔

خود رسول اللہؐ نے اپنے اس نواسے کے اندر بچپن ہی سے اس صفت کو کچھ ایسا نمایاں پایا کہ ارشاد فرمایا۔ اما الحسن فان له هيبتي وسوددي واما الحسين فان له جوددي وشجاعتي (یعنی حسنؑ کے لیے میرا رعب و داب اور شان سرداری ہے اور حسینؑ میں میری سخاوت اور میری بہادری۔ یوں تو حسینؑ اوصاف رسولؐ کے وارث تھے ہی لیکن خصوصیت سے اپنی سخاوت و شجاعت بخشے سے ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت کے یہ اوصاف دیگر اوصاف سے ضرور کچھ امتیاز رکھتے ہیں۔

خدمت خلق اور نوج انسانی کی ہمدردی کے بہترین جذبہ کے ساتھ ساتھ آپ نے اس کی بھی تقویت فرمائی ہے کہ اس بارے میں حفظ مراتب کا خیال رکھنا چاہیے۔ یعنی مسائل جہت نا صفات کے اعتبار سے قابل عزت ہو اور علم و معرفت میں بلند درجہ رکھتا ہو اتنا اس کے ساتھ سلوک بہتر کیا جائے۔ اس کا بہترین ثبوت یہ واقعہ ہے کہ ایک اعرابی امام حسینؑ کی خدمت

نے ارشاد فرمایا

تعداد سے خارج ہوگا۔ ہاں ایک مرتبہ کا یہ تذکرہ ہے کہ آپ اور آپ کے بھائی امام حسنؑ دونوں شاہزادے پیادہ حج کے لیے جا رہے تھے۔ اتفاق سے راستے میں حاجیوں کا قافلہ بھی ان تک پہنچ گیا۔ اب جو ان شاہزادوں کو لوگوں نے پیادہ دیکھا تو ہر شخص جس کی نظر پڑتی وہ فوراً ان کے احترام کے لحاظ سے سواری سے اتر پڑتا۔ کچھ دیر تو لوگ ساتھ ساتھ پیادہ چلتے رہے۔ آخر طاقت رفتار نے جواب دیا۔ سب مل کر سعد بن ابی وقاص کے پاس آئے جو اس قافلہ میں سن رسیدہ صحابی تھے۔ ان سے آکر کہا کہ اب تو راستہ چلنا ہم لوگوں پر بہت بار ہے۔ مگر یہ اچھا نہیں معلوم ہوتا کہ ہم لوگ سوار ہوں اور یہ دونوں شاہزادے راستہ طے کریں۔ سعد، امام حسنؑ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور کہا کہ حضور آپ کے ساتھ والوں میں سے بعض پر پیادہ چلنا نہایت شاق ہو رہا ہے۔ مگر لوگ جب آپ دونوں بزرگوں کو پیادہ چلتے دیکھتے ہیں تو ان کا دل نہیں چاہتا کہ وہ سوار ہو کر راستہ چلیں۔ اس لیے بہتر معلوم ہوتا ہے کہ اب آپ دونوں حضرات سوار ہو جائیں۔ امام حسنؑ نے فرمایا کہ یہ تو نہیں سکتا کیونکہ ہم نے اپنے اوپر فرض ہی قرار دیا ہے کہ ہم خانہ کعبہ کی طرف اپنے پیروں سے چل کر جائیں۔ مگر لوگوں کو تکلیف دینا بھی ہمیں گوارا نہیں ہے اس لیے ہم اس راستے کو چھوڑے دیتے ہیں چنانچہ وہ دونوں بزرگوں ارشاد ہراہ سے ہٹ کر دوسرے راستے سے روانہ ہو گئے۔ ایک مرتبہ حج کا یہ تذکرہ ہے کہ آپ کے بھتیجے عبدالرحمن بن حسنؑ آپ کے ساتھ تھے اور حالت احرام میں آبوار کے مقام پر ان کی وفات ہو گئی۔

عبادت الہی کے ساتھ جود و وابستگی تھی اس کا اندازہ آپ کو امام حسینؑ کے ان الفاظ سے بھی ہو سکتا ہے جو ۹ محرم کی سہ پہر کو آپ نے ایک شب کی ہمت طلب کرنے کے موقع پر ارشاد فرمائے تھے۔ آپ نے کہا کہ اس شب کو ہم عبادت و ذکر الہی میں سیر کر لیں جسدا ہی جانتا ہے کہ مجھے اس کی عبادت و ذکر سے کتنی محبت ہے۔ چنانچہ یہ شب آپ نے اور آپ کے

سے ارشاد فرمایا

یہ طرز عمل غرباء اور مساکین کو معلومات مذہبی حاصل کرنے کا بہترین محرک تھا اور اس ذریعہ سے عوام میں علوم و معارف کی اشاعت ہوتی تھی۔ یہ اس لیے تھا کہ آپ خود اپنے تمام صفات جلیلہ کے ساتھ ساتھ عالم تھے۔ ایسے جن سے لوگ مذہبی مسائل اور اہم مشکلات میں رجوع کرتے تھے۔ عرب کی مثل ہے الناس اعداء لہما جہلوا لوگ دشمن ہوتے ہیں اس چیز کے جس کو وہ نہ جانتے ہوں، رؤساء اور حکام جو خود علم و دہن سے بے بہرہ ہوتا کرتے ہیں۔ اپنی اس کمزوری پر پردہ ڈالنے کے لیے عام افراد کی علمی سطح کو پست رکھنے کی فکر کرتے اور لوگوں کی نظر میں علم و دہن کی قدر و قیمت گھٹانے کی کوشش کرتے ہیں لیکن اسلام کے حقیقی رہنما ہمیشہ مسلمانوں کی علمی سطح کے بلند کرنے میں منہمک رہے۔ حضرت علیؑ کی زندگی اسی میں گزری اور آپ کے فرزند اسی راستے پر قائم رہے۔

علاوہ ان خطب اور امتعار کے جو آپ کی زبانی منقول ہیں اور جو علم الہیات اور معارف حقہ کے خزانہ دار ہیں یا ان دعاؤں اور مناجاتوں کے جو آپ کی زبان سے نکلی ہیں اور جن میں سے بعض کا مجموعہ ”صحیفہ حسینؑ“ کے نام سے اس وقت بھی موجود ہے اور خالی و مخول کے باہمی ربط کی بے نظیر آمیزہ دار ہیں اگر جو اربع حدیث کی سیر کی جائے تو ان میں مسائل فقہیہ کے بارے میں کثیر احادیث آپ سے منقول ملیں گے۔

اس وقت بھی جب آپ اہل حرم کو لے کر مکہ معظمہ سے برآمد ہوئے ہیں اور سفر غربت اختیار کیا ہے تو راستے میں فردوسی بن غالب شاعر سے ملاقات ہوئی اور اس نے کچھ مسائل آپ سے نذر اور مناسک حج کے متعلق دریافت کیے اور ان کا جواب حاصل کیا۔

اسی کا نتیجہ ہے کہ کربلا میں آپ کے اصحاب کی فرست پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ عوام نہیں تھے بلکہ اس وقت کی اسلامی جماعت کی پوری روح اور علم و عمل کا مکمل خزانہ تھا جو حسینؑ پر نشانہ ہو رہا تھا۔ ان میں حافظان قرآن بھی تھے، علما کتاب بھی اور حاملان حدیث بھی۔ ان کے جذب اور کشش کا مرکز کوئی ہو ہی نہیں سکتا سوا ایسی ذات کے جو خود

میں حاضر ہوا اور تسلیم بجالایا اور عرض حال کرتے ہوئے کہنے لگا کہ میں نے آپ کے جہد بزرگوار کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ جب کوئی حاجت پیش کرنا ہو تو چار قسم کے آدمیوں میں سے کسی ایک کے سامنے پیش کرنا۔ یا تو شریف النفس عرب یا سخی سردار یا حامل قرآن یا دجیبہ و ثلیل انسان۔ آپ میں یہ چاروں صفاتیں جمع ہیں۔ عرب قوم اس کو تو شرف آپ کے جہد بزرگوار سے حاصل ہوا اور سخاوت، یہ آپ کا شہوہ اور خصلت ہے۔ اور قرآن، وہ آپ ہی کے گھر میں نازل ہوا اور خوبصورتی، اس کے متعلق میں نے آپ کے جہد بزرگوار کو فرماتے ہوئے سنا کہ اگر مجھے دیکھنا ہو تو حسن و حسینؑ کو دیکھ لینا۔ یہ پُر معرفت تقریر سن کر حضرت نے فرمایا کہ تمھاری حاجت کیا ہے؟ اس نے اپنی حاجت زمین پر لکھ دی۔ آپ نے فرمایا کہ میں نے اپنے والد بزرگوار کا یہ قول سنا ہے کہ ہر انسان کی قدر و قیمت وہی ہے کہ جو اس میں بہتر موجود ہے اور میں نے اپنے جہد بزرگوار کا ارشاد یہ سنا ہے کہ احسان بقدر معرفت ہونا چاہیے۔ اس لیے میں تم سے تین سوال دریافت کرتا ہوں۔ اگر تم نے ایک سوال کا جواب ٹھیک دیا تو تم کو میں ایک تہائی مال دے دوں گا۔ اگر دو جواب تم نے ٹھیک دیے تو دو تہائی مال دوں گا اور اگر تم نے تینوں سوالوں کا جواب درست دیا تو جو کچھ میرے پاس موجود ہے وہ سب میں تمھیں دے دوں گا۔ میرے پاس مال دنیا سے اس وقت یہ ایک تھیلی ہے، نہ نقد کی جو عراق سے بھیجی گئی ہے۔ اس نے کہا۔ پوچھیے! اللہ میری مدد کرے گا۔ آپ نے فرمایا۔ بتاؤ کونسا عمل سب میں بہتر ہے؟ اس نے کہا اللہ پر ایمان لانا۔ پوچھا کہ اچھا بندہ کی نجات کا ذریعہ ہلاکت سے کیا ہے؟ اس نے کہا اللہ پر بھروسہ رکھنا۔ حضرت نے فرمایا۔ انسان کی زینت کیا ہے؟ اس نے کہا علم جس کے ساتھ عقل موجود ہو۔ فرمایا۔ اگر یہ نہ ہو؟ اس نے کہا پھر مال جو جس کے ساتھ سخاوت ہو۔ فرمایا اگر یہ بھی نہ ہو؟ اس نے کہا پھر فقری ہو جس کے ساتھ صبر موجود ہو۔ حضرت نے فرمایا اور اگر یہ بھی نہ ہو تو؟ اس نے کہا تو پھر ایک بجلی گرے اور اس شخص کو جلا کر خاکستر کر دے۔ حضرت سننے لگے اور وہ پوری تھیلی اس کی جانب پھینک دی۔

مکہ سے روانگی کے بعد اپنی جماعت کی تعداد کو قائم رکھنے کے لیے کبھی آئندہ کے خطرات کو پوشیدہ نہیں کیا بلکہ برابر صورت حال سے مطلع کرتے رہے اور بار بار آئندہ کے خطرات کو یقینی بنا کر ساتھ والوں کی حفاظت جان و مال کے لیے الگ ہو جانے کا مشورہ دیا اور یہ طریقہ اس وقت تک جاری رکھا جب تک کہ کسی ایک شخص کے بھی غلط فہمی میں مبتلا ہونے کا امکان سمجھا جاسکتا تھا۔

آپ امن پسند بھی ایسے تھے کہ آخر وقت تک دشمن سے صلح کرنے کی خود اپنی طرف سے کوشش جاری رکھی مگر اس کے ساتھ غم و استقلال اور بہت ایسی رکھتے تھے کہ جان دے دی مگر جو راستا پہلے دن صحیح سمجھ کر اختیار کر لیا تھا اس سے ذرہ بھر بھی نہ ہٹے۔

انہوں نے بحیثیت ایک فرزند کے باپ کی اطاعت کی اور پھوٹے بھائی ہو کر بھائی کی اطاعت کی اس طرح کہ ان کی وفادارانہ اطاعت میں کبھی کمزوری نظر نہ آئی اور پھر بحیثیت ایک سردار کے کربلا کے واقعہ میں ایک پوری جماعت کی قیادت کی۔ اس طرح کہ ان کے نظم قیادت کی مثال مشکل سے ملتی ہے۔ اس کے ساتھ آپ کی نگاہ نے مردم شناسی کا وہ جبروت انگیز نمونہ پیش کیا کہ اتنے سخت اور دشوار گزار راستے کے لیے جن ساتھیوں کو منتخب کر کے اپنے ساتھ لے لیا تھا ان میں سے ایک نے بھی وفاداری اور جان نثاری میں کمی نہ کی اور سب کی جان و یک دل ہو کر مقصد حق کے لیے کوشاں رہے یہاں تک کہ جانیں قربان کر دیں۔

امام حسینؑ کے مقولات

بلند مرتبہ افراد میں بھی بیشتر وہی افراد ہوتے ہیں جن کے اقوال کو ان کے اعمال پر نمایاں فوقیت حاصل ہوتی ہے مگر حسینؑ کا کردار بذات خود اتنا بلند تھا کہ اس نے دنیا کی زبان اور اس کے قلم کی تمام تر توجہ کو اپنے لیے مخصوص کر لیا لہذا آپ کے مقولات کو یکجا کرنے کی زیادہ کوشش نہیں کی گئی۔ پھر بھی آپ کے مقولات متفرق طور سے مختلف کتابوں میں کچھ نہ کچھ مل ہی جاتے ہیں اور وہ بڑی حد تک آپ کی زندگی کے مختلف رنوں کی ترجمانی کرتے

ان صفات میں بلند تر درجہ رکھتی ہو۔ بلکہ جو آپ کے خاندانی مخالفت تھے وہ بھی آپ کی بلندی مرتبہ اور برتری صفات کے قائل تھے۔ چنانچہ ایک مرتبہ مسجد نبویؐ میں ایک مجمع تھا جس میں ابو سعید خدری اور عبد اللہ بن عمرو بن العاص بھی موجود تھے۔ ادھر سے حضرت امام حسینؑ کا گزر ہوا اور آپ نے تعلیم اسلام کے مطابق مجمع کو سلام کیا۔ سب نے جواب سلام دیا۔ اس وقت عمرو بن العاص کے فرزند عبد اللہ چپ رہے جب سب جواب دیکر خاموش ہو گئے تو انہوں نے آواز بلند کی اور کہا وعلیک السلام ورحمة اللہ وسرکاتہ پھر مجمع کی طرف مخاطب ہو کر کہا، کیا میں آپ لوگوں کو بتلاؤں کہ اہل زمین میں سب سے زیادہ محبوب شخص اہل آسمان کا کون ہے؟ سب نے کہا، ضرور بتلائیے۔ انہوں نے کہا، وہ یہی راستے سے گزرنے والا ہے۔ انہوں نے مجھ سے جنگ صفین کے بعد سے اب تک بات نہیں کی اور اگر یہ مجھ سے کسی طرح راضی ہو جائیں تو یہ میرے لیے سرخ رنگ کے اونٹوں سے زیادہ محبوب چیز ہوگی بلکہ

یہ عبد اللہ خاندان بنو امیہ میں زہد و تقویٰ اور عبادت و ریاضت میں مشہور تھے مگر جنگ صفین میں اپنے باپ عمرو بن العاص کے ساتھ حضرت علیؑ سے جنگ کرنے کے لیے آگئے تھے۔ اس وقت سے حضرت امام حسینؑ نے ان سے بات کرنا چھوڑ دی تھی، مگر اس کے باوجود ان کے دل پر حضرت کے بلند اوصاف کا اس درجہ اثر قائم تھا۔

راست بازی میں داخل ہے، اخلاقی جرأت۔ حسینؑ میں اخلاقی جرأت ایسی تھی کہ بچپن میں خلیفہ دوم کو منبر پر ٹوک دیا اور فرمایا انزل عن مجلس ابی۔ اتر پڑو میرے باپ کی جگہ سے۔ حضرت عمرؓ نے کہا، سچ کہتے ہو صابن زادے، تمہارے ہی باپ کا منبر ہے خدا کی قسم میرے باپ کا منبر نہیں۔

راست بازی اور راست کرداری کا کھلا ہوا نمونہ یہ تھا کہ آپ نے معرکہ کربلا کے پہلے

۴۔ من وصل الى الله القطع عن غيره۔ ”جو خدا سے متصل ہوا اس کے غیر سے جدا ہو گیا۔“

ابن کثیر نے ”ہدایۃ النہایہ“ میں اسمعیل بن ابراہیم کی روایت سے نقل کیا ہے کہ امام حسینؑ نے جنت البقیع میں قبور شہداء کی زیارت کی اور حسب ذیل اشعار پڑھے:-

نادیت سكان القبور فاستكوا فاجابني عن صمتهم ترب الحشا
نالت اندري ما صنعت لياكني مزقت لحمهم وخرقت الكسا
وحشوت اعينهم ترا بالبعد ما كانت تأذى باليسير من القدا
اما العظام فانني مزقتها حتى تباینت المفاصل والثوى
قطعت ذا من ذا ومن هذا لذا فتركها مما يطول بها النبلا

”میں نے قبروں کے رہنے والوں کو آواز دی تو وہ خاموش رہے مگر مجھے جواب دیا ان کی خاموشی پر خاک مرقد نے کہ کیا تمہیں معلوم ہے کہ میں اپنے رہنے والوں کے ساتھ کیا سلوک کیا ہے؟ میں نے ان کے گوشت کو ٹکڑے ٹکڑے اور کھال کو پارہ پارہ کر دیا ہے اور ان کی آنکھوں کے اندر مٹی بھر دی ہے حالانکہ اس کے پہلے ذرا سناٹا پڑ جاتا تھا ان کی آنکھ میں تو حسینؑ نہ آتا تھا۔ رہ گئیں ہڈیاں، وہ بھی جدا جدا ہو گئیں۔ یہاں تک کہ جوڑ بندھنا نہ تھا ہر میں۔ میں نے اس کو اُس سے اور اُس کو اس سے الگ کر دیا ہے۔ یہاں تک کہ بوسیدگی و کھنگی کے آثار ان سے ہویدا ہو گئے ہیں۔“

ذهب الذين احبهم فيمن اراد ان لا يستبني
فيمن اراد ان لا يستبني فيمن اراد ان لا يستبني
يبغى فساد ما استطاع وامره مما اربته
حتا يبد الى الفتر عوداك مما لا ادبه

نظر آتے ہیں۔ ان میں نظم بھی ہیں اور نثر بھی۔

چنانچہ آپ نے فرمایا ہے کہ:-

۱۔ من جاد ساد ومن بخل ذل۔ ”جس نے دیا لیا اس نے سرداری پائی اور جس نے کچھ بھی کی اس نے ذلت اٹھائی۔“

۲۔ اجود الناس من اعطى من لا يرجوه۔ ”سخی وہی ہے جس نے اس کو بھی دیا جو اس سے کوئی توقع وابستہ نہ رکھ سکتا ہو۔“

۳۔ من انعم الله منكم فليتنعم على غيره۔ ”جس کو خدا نے دیا ہے وہ اوروں کو بھی دے۔“

۴۔ حواجز الناس اليكم من نعم الله عليكم۔ ”اہل حاجت کا تمہارے پاس آنا بھی تم پر خدا کی نعمتوں میں سے ہے۔“

۵۔ اغن عن المخلوق بالخالق تفن عن الكاذب والصادق

دامتوزق الرحمن من فضله فليس غير الله من سارق

من ظن ان الناس يغنونه فليس بالرحمن بالواثق

او ظن ان الناس يكتونونه ذلت به الغلان من حاق

”خدا سے لو لگا کر مخلوق سے بے نیاز ہو جاؤ تو پھر کسی جھوٹے سچے کی تمہیں پروا

نہ رہے گی۔ مانگنا ہو تو خدا ہی سے مانگو۔ غیر خدا روٹی دینے والا نہیں ہے۔ جس

کا خیال ہو کہ لوگ اس کو غنی کر دیں گے اس کو خدا پر اعتماد نہیں اور جو یہ سمجھتا ہو کہ

لوگ اس کے لیے کافی ہیں وہ یقیناً بڑی ہستی میں گرنے والا ہے۔“

۶۔ كلما زيدا صاحب المال مالا زيدا في همته وفي الاشغال

”ادھر تو مال والوں کے مال بڑھتے ہیں اور ادھر ان کے انکار و اشتغال میں اضافہ

ہوتا ہے۔“

فلو عشت وطوفت من الغرب الى المشرق
لما صادفت من يقدر ان ليسعد اولي شقي
”جب زمانہ کے دانت تمھیں زخمی کریں تو خلقِ خدا کی طرف کبھی نہ جھکنا اور
سوا خدائے برتر کے جو رزق کا تقسیم کرنے والا ہے کسی سے سوال نہ کرو اس
لیے کہ مغرب سے مشرق تک پھر لگائے کے بعد بھی تم کو کوئی شخص ایسا نہ ملے
گا جو مقدر کو بتا یا بگاڑ سکتا ہو۔“

وان تكن الدنيا تعد لغيري فدار ثواب الله اعلى وانبل
وان تكن الابدان للموت الثابت فقتل امرئ بالسيف في الله افضل
وان تكن الارزاق قسما مقعدرا فقلتم حرص المرء في الرزق اجل
وان تكن الاموال للترك جمعها فما بال متروك به المرء يتجمل
”اگر یہ فرض بھی کر لیا جائے کہ دنیا کوئی اچھی جگہ ہے تب بھی خدا کے اجر و ثواب
کا محل زیادہ بلند و برتر ہے اور جب کہ یہ صحیح ہے کہ اجسام پر موت کا طاری ہونا
لازم ہے تو انسان کا راہِ خدا میں تہ تیغ کر دیا جانا زیادہ بہتر ہے۔ اور جب کہ یہ
حقیقت ہے کہ رزق میں ہر ایک کا حصہ معین ہے تو اس کے بارے میں ہوس
سے کام نہ لینا ہی انسان کے لیے مناسب ہے۔ اور جب کہ یہ یقینی ہے کہ اموال
جبر ہوتے ہیں بعد میں چھوڑ جانے کے لیے تو کیا یہ حماقت نہ ہوگی کہ ایسی چیز
کے بارے میں انسان بخل سے کام لے۔“

ایک شخص نے حضرت کو لکھا کہ مجھے دو جہلوں میں موعظہ فرمائیے۔ آپ نے تحریر فرمایا۔
”من حال دامت بعمصية الله كان انوت لما يروح واسرع لمجيبى
يخذل“ ”جو شخص اللہ کی نافرمانی کر کے کسی مقصد کو حاصل کرنا چاہے گا اپنے
آفتات میں ناکام اور خطرات سے نہ زیادہ نزدیک رہے گا۔“

وريري ذباب الشتر من حولي ليطن ولا يذبت
واذا خبا وعن الصدر فلا يزال به ليشب
فلا يعيهم بعقله افلا يثوب اليه لبه
افلا يرى ان فعله مما يسور اليه غبه
حسبي بربي كافيا ما اخشئ والبغي حبه
ولقد من يبغي عليه فما كفاه الله ربه

”گزر گئے وہ افراد جن کو میں محبوب رکھتا تھا۔ اور اب میں رہ گیا ہوں ایسے
لوگوں میں جو مجھے کسی طرح پسند نہیں۔ ان کا کردار یہ ہے کہ میں انھیں ذرا بھی
بُرا بھلا نہیں کہتا۔ مگر وہ پیٹھ پیچھے مجھے گالیاں دیتے رہتے ہیں اور جہاں تک
ممكن ہوتا ہے وہ میرے نقصان کے درپے رہتے ہیں درانحالیکہ میں ان کو
فائدہ پہنچاتا رہتا ہوں۔ وہ گرد و پیش شرارتوں کے گس اڑتے دیکھتے ہیں مگر اتنا
نہیں کرتے کہ انھیں ہٹا دیں بلکہ جب دلوں میں عداوت کی آگ بجھنے لگی ہے
تو وہ اسے اور ہوا دے دیتے ہیں۔ کیا یہ ممکن نہیں کہ وہ اپنی سمجھ سے کام لیں؟
کیا ایسا نہ ہوگا کہ ان کی طرف عقل واپس آئے؟ کیا وہ یہ نہیں سمجھتے کہ ان کا یہ
طرز عمل نتیجہً خود انہی کے لیے تباہ کن ثابت ہوگا۔ میرے لیے میرا پروردگار
کافی ہے جس کے ہوتے ہوئے مجھ کو کوئی اندیشہ نہیں۔ ناممکن ہے کہ کسی پر ظلم و
ستم کیا جائے اور خدا اس کی مدد نہ کرے۔“

ابن صباغ مالکی نے ”فصول مہمہ“ میں علی بن عیسیٰ الرہلی نے کشف الغمہ میں ابن

خثاب کی روایت سے حسب ذیل اشعار نقل کیے ہیں:-

اذا ما عضتك الدهر فلا تجتخ الى خلق
ولا تسأل سوى الله تعالى فاسم الرزق

اس بارے میں اپنے اور پرانے دوست اور دشمن کی تفریق کو بھی کام میں نہ لایا جائے۔ یہ بات اس صورت میں پیدا ہی نہیں ہو سکتی کہ جب ہمارے تعلقات دوسروں کے ساتھ مادی بنیادوں پر قائم ہوں اس لیے کہ ایسی صورت میں طبعی میلانات و رجحانات کی بنا پر نزدیک و دور اور موافق و مخالف کے امتیازات کا بروئے کار آنا لازمی ہے۔ البتہ یہ بات اس وقت ہو سکتی ہے کہ جب ہمارے تعلقی دوسروں کے ساتھ اس مشترک رشتہ کی بنا پر ہو جو ہم سب کو ایک خالق کے ساتھ وابستہ کر دیتا ہے اور جس کے لحاظ سے تمام افراد انسانی ایک سلسلہ وحدت میں منسلک ہو جاتے ہیں۔ اس صورت میں ہم اس قابل ہو سکیں گے کہ صحیح معنی میں غرض خلقت کو سمجھتے ہوئے عمومی طور پر تمام خلق کو اپنی ذات سے زیادہ سے زیادہ فائدہ پہنچانے کی کوشش کریں اور اس کو اپنے ادھر خدا کا ایک احسان سمجھیں کہ اس نے ہمارے ذریعہ سے دوسروں کو فائدہ پہنچایا۔ اس کا نتیجہ ہو گا کہ ایسے لوگوں پر بھی احسان کیا جائے گا جو عام عادات و خصائل کی بنا پر اس سے توقع نہ رکھتے ہوں۔ مثلاً ایک دشمن اپنے دشمن سے کب اس کی امید کر سکتا ہے کہ وہ اس کے ساتھ کوئی اچھا سلوک کرے گا مگر بلند معیار فیاضی کا یہی ہے کہ اس کو بھی اپنے انعام سے محروم نہ کیا جائے۔

۴۔ مادی زندگی کے تاریک پہلوؤں پر توجہ، ان کا لحاظ رکھنے سے تمام لہذا دنیا ہماری نظریں ہیچ ہو جائیں گے اور ہم اللہ کے ساتھ وابستگی پیدا کر کے نیکی کے راستے پر قائم رہنے ہی کو اپنی بہترین کامیابی سمجھنے لگیں گے۔

مجموعی حیثیت سے مذکورہ بالا تمام تعلیمات میں وزن پیدا ہوا ہے حسین کے عمل اور فکری کردار سے جس نے ان میں سے ہر ہر مقولہ اور تعلیم کو چلتی پھرتی تصویر کی شکل میں آنکھوں کے سامنے پیش کر دیا۔ اس طرح کہ یہ مقولات صرف آپ کے خیالات ہی کے حامل نہیں رہے بلکہ بچے علی انسان کی تاریخ زندگی بن گئے۔

امام حسین کے اس طرح کے اقوال آپ کی زندگی کے کسی منہگامی یا اتفاقی موقع سے

مندرجہ بالا مقالات اور اشعار کو نظر غائر سے دیکھنے پر حسب ذیل تعلیمات ان میں نمایاں طور پر موجود پائے جاتے ہیں:-

ذات اللہی پر توکل - یعنی ہم کو کسی نفع کی امید کسی ضرر سے تحفظ کی توقع اور کسی خواہش کی تکمیل کا آسرا اللہ کے غیر سے نہ رکھنا چاہیے۔ یہ وہ دشوار منزل ہے کہ کہنے کو جو بھی چاہے کہہ دے لیکن حقیقتاً عملی حیثیت سے اس راہ میں جو بھی قدم رکھے وہ ماسوی اللہ سے بے نیاز ہو جائے۔

انسان سچائی کے راستے سے الگ ہوتا ہے۔ زیادہ تر طبع مال زر کی بدولت یا بچہ خطرہ امروز اور اندیشہ فردا کے سبب سے مگر جب یہ خیال پورے طور پر کسی کے دل و دماغ پر چھ جائے کہ خدا کی مشیت کے خلاف نہ کوئی نفع پہنچا سکتا ہے نہ نقصان، تو پھر دنیا کی کوئی طاقت اسے راہ حق سے منحرف نہیں کر سکتی۔

محفوظ رہے کہ اللہ اپنے ماننے والوں کے صحیح عقیدہ کے مطابق وہ پاک و منزہ ذات ہے جو صرف نیکی کو پسند کرتی ہے اور برائی سے نفرت رکھتی ہے۔ لہذا جب کوئی ایک ایسی بزرگ و برتر ذات کو اپنے تفکرات و احساسات کا مرکز بنائے گا تو اس کے لیے ناممکن ہے کہ بھول کر بھی وہ برائی یا ظلم کے قریب جائے۔ چنانچہ امام حسین کی جگہ اگر کوئی ایسا شخص ہوتا جو دنیوی نفع اور نقصان کی پروا کرتا یا کسی مادی طاقت کو قبیلہ حاجات سمجھتا یا اس کے اقتدار سے مرعوب کیا جاسکتا تو بالفرض وہ یزید کی بیعت شروع میں نہ بھی کرتا تو اس وقت تو ضرور کر لیتا کہ جب حکومت باطل کا ہزاروں کا لشکر اس کے خلاف صفت بستہ ہوتا اور ان کے ظلم و تشدد کی بجلیاں آنکھوں کے سامنے کوندنے لگتیں مگر حضرت امام حسین، آپ تو دنیا کی کسی طاقت اور نعمت کو کچھ سمجھتے ہی نہ تھے اس لیے راہ حق سے آپ کو کوئی شے ہٹا ہی نہیں سکتی تھی۔

۲۔ خلق خدا کی ہر حال بھی خواہی اور فائدہ رسانی کی فکر ہونا جس کا بلند معیار یہ ہو کہ

احکام کی تعمیل میں جدوجہد کے سلسلہ میں کوئی کوتاہی ہونے دیتا ہوں، بلکہ تیری سے چلتا ہوں اسی راستے پر جس کی تونے مجھے ہدایت کی، اور عہدہ برآ ہوتا ہوں میں ان فرائض سے جن کا تونے مجھے محافظ قرار دیا ہے۔ اب تو بھی مجھے اپنی حمایت میں رکھ اور اپنی نظر رحمت سے مجھے علیحدہ نہ کر اور اپنی طاقت کی امداد سے مجھے محروم نہ کر اور اس مقصد سے الگ نہ کر جس کے ماتحت میں تیری مشیت کو پورا کرنا چاہتا ہوں اور بصیرت پر قرار دے میری رفتار کو اور ہدایت پر میرے مسلک کو اور صحیح منزل کی محنت میرے راستے کو، یہاں تک کہ مجھے پہنچا تو میری آرزو تک، اور مجھے اتار تو اسی منزل پر جس کا تونے میرے لیے ارادہ کیا اور جس کے لیے تونے مجھے پیدا کیا اور جس کی طرف تونے مجھے متوجہ کیا۔

کیا اس قنوت کے الفاظ ظاہر بظاہر آپ کے کسی عزم مستقل کی ترجمانی نہیں کرتے؟ کیا ان سے عمل طور پر یہ واضح نہیں ہوتا کہ آپ بس کسی خاص مقصد کی خاطر اپنی زندگی کو وقف کیے ہوئے تھے اور یہ کہ آپ کی زندگی کا ہر لمحہ خالق کے اشاروں کا تابع تھا۔ سند یہ کہ یہ الفاظ قول تھے اور لہجہ ہجری میں وہ عمل بن کر آنکھوں کے سامنے آگئے۔ یہ دعا بھی حضرت امام حسینؑ کی ہے جو آپ قنوت میں پڑھتے تھے:-

اللهم من أدنى إلى مآدى فانت مأوى ومن لجأ إلى ملجأ فانت ملجأ ومن أوجس في بلاء من أفتان الامتحان ولمة الشيطان بعظمتك إلى لا يشوبها ولم لنس بفتين ولا وارء طيف تبظنين ولا يلم الصالح حتى تغلبني إليك بارادتك غيظنين ولا مظنون ولا يلب ولا مرتاب۔

خداوند اتیرے سوا کسی کی طرف اگر کوئی پناہ لیتا ہے تو لیا کرے۔ میرا پناہ دینے والا

لہ من الدعوات منہ۔ ۷۱

متعلق نہ تھے بلکہ آپ کے روزمرہ کے نظام زندگی کا ایک جزو تھے چنانچہ روزانہ کی نمازوں میں جو مختلف قنوت آپ پڑھا کرتے تھے وہ بھی اسی طرح کے مضامین پر مشتمل ہوتے تھے۔ ان میں سے ایک قنوت کے الفاظ درج ذیل ہیں:-

اللهم منك البدء ولك المشيئة ولك الحول ولك القوة۔ اللهم واثق مع ذلك كلمه عائد بك لا اشد بحولك وقوتك راض بحكمك الذي سبق الى في علمك جارحيث اجر ميتني قاصدا ما امستني غير ضنين بنفسي فيما يرضيك عني اذ به قدر ضيقتي ولا قاصر بجهدي عما اليه تدبتني مسارع لما عرفتنني شارح فيما اشرعتني مستبصر فيما بصرتني مراحم ما ارعيتني فلا تخلني من رعايتك ولا تخرجني من عنايتك لا تقعد في عن حولك ولا تخرجني عن مقصد انال به ارادتك واجعل علي البصيرة مدرجتى وعلى الهداية محجتى وعلى الرشا دمسلكى حتا تنيلني امنيتي ومحل بي على ما به اردتني وله خلقتني واليه اديت بي۔

”خداوند اتیری ہی طرف سے انعام و احسان کی ابتداء ہے اور جو کچھ مشیت اور طاقت و قوت ہے وہ صرف تیری ہے۔ اس سب کے ہوتے ہوئے میں تیری ہی طرف پناہ لیتا ہوں اور تیری ہی قوت و طاقت کا سہارا ڈھونڈتا ہوں اور تیرے اس فیصلہ پر راضی ہوں جو میرے بارے میں تو پہلے ہی کر چکا ہے۔ میں چلنے والا ہوں اسی راستے پر جس پر کہ مجھے تونے چلایا ہے اور قصد رکھتا ہوں وہی جو تیری مرضی کے مطابق ہو اور ان امور کے متعلق جو تیری رضا مندی کا باعث ہو سکتے ہیں۔ اپنے نفس کی ذرا بھی رعایت نہیں کرتا۔ نہ میں اپنی طرف سے تیرے

تو صرف تو ہے۔ تو اپنی اس عظمت کے ساتھ جس پر نہ کسی کی نفسانی خواہش اثر انداز ہو سکتی ہے اور نہ بذلتی اور نہ اس میں کسی طرح کی بدگمانی اور کسی وقتی خوش مزاجی کا دخل ہے۔ آزمائش کے موقع پر مجھے محفوظ رکھ فتنہ میں مبتلا ہونے اور شیطانی جماعت سے مرعوب ہو جانے سے۔ یہاں تک کہ تیری طرف میری بازگشت ہو۔ تیرے منشائے کے مطابق۔ اس طرح کہ نہ میرے دل میں بڑے خیالات ہوں اور نہ دوسرے میری نسبت بڑے خیالات قائم کر سکیں۔ نہ دوسروں کے متعلق میں کسی شک میں مبتلا ہوں اور نہ میرے متعلق دوسروں کو شک ہو سکے۔" شہ

آپ صبح و شام دونوں وقت حسب ذیل دعا پڑھا کرتے تھے۔
اللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَسْلَمْتُ نَفْسِیْ اِلَیْکَ وَجِہْتِیْ وَجِہَیْ اِلَیْکَ وَتَوَضَّعْتُ اَمْرِیْ اِلَیْکَ اَللّٰهُمَّ اِنِّکَ تَکْفِیْنِیْ مِنْ هَلٍّ اَحَدٍ وَلَا یُکْفِیْنِیْ مِنْکَ اَحَدٌ -

"خداوند! میں تیرے سپرد کیے ہوئے ہوں اپنے نفس کو اور تیری طرف موڑے ہوئے ہوں اپنے رخ کو اور دیے ہوئے ہوں اپنے کو تیرے ہاتھ میں۔ خداوند! تو ہر دوسرے شخص کے شر سے محفوظ رکھ سکتا ہے مجھ کو لیکن تیرا غیر مجھ کو تیرے شر سے نہیں بچا سکتا۔" بھلا جس شخص کا مستقل عقیدہ یہ ہو اور جس کی زندگی کا نصب العین یہ ہو جس نے دل اسی کو سوچا ہو اور اسی کو اپنی زبان سے ڈیرا تاجارہا ہو وہ کہیں ممکن ہے کہ کسی طاغوتی طاقت سے دب جائے اور خدا نے قادر و توانا کو بھول کر دنیوی جبروت کے سامنے تسلیم خم کر دے۔ یزید، حسینؑ سے اسی کا تو طالب تھا کہ "آپ خدا کے راستے سے ہٹ کر شیطان کے راستے پر ساتھ ہو جائیں"۔ مگر حسینؑ نے جو اپنے جان و روح کو کلیۃً خدا کے حوالے کر چکے تھے اس کے کوٹھکا دیا۔

ال لیے کہ آپ کو یقین کامل تھا کہ یزید میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ جب تلواریں آپ کے جسم اطہر کے ٹکڑے ٹکڑے کر رہی تھیں اس وقت بھی آپ اپنے اسی یقین پر قائم تھے۔ چنانچہ جب معرکہ کربلا کے نتائج دنیا کی آنکھوں کے سامنے آگئے تو عالم ظاہر میں سب کو اس کا مشاہدہ ہو گیا کہ حسینؑ کا خیال حزن بخت صحیح تھا۔ اس لیے کہ کتنے کو خون بہا حسینؑ اور انصاریہ حسینؑ کی گردنوں سے، مگر دراصل شہرگ قطع ہوئی یزید کے اقتدار کی حسینؑ زندہ جاوید ہو گئے اور یزید صحیح معنی میں ہلاک و فنا ہوا، جو نتیجہ تھا محض حسینؑ کی اس قوت ارادی کا جس کا مظاہرہ آپ کے اقوال برابر کرتے رہتے تھے۔ لذت حیات دنیا سے سرشار تنگ ظرفوں کے نزدیک اپنے مخالفت کو دھمکاتے کا سب سے بڑا ذریعہ موت کا تصور پیدا کر دینا ہے مگر وہ افراد جو راہ حق میں موت آنے کو کمال زندگی سمجھتے ہوں اس دھمکے سے کب متاثر ہو سکتے ہیں؟

حسینؑ کا فلسفہ زندگی وہی تھا جس کی امام حسینؑ کو آپ کے والد بزرگوار حضرت علیؑ میں اسی طرح کی طرف سے مخصوص وصیت ہوئی تھی کہ اصبر علی الحق وان کان مستراً سچائی کتنی ہی سچ کیوں نہ ہو اس پر قائم رہو اور ہر شکل کا مقابلہ کرو۔ یہی وصیت حسینؑ نے اپنے فرزند زین العابدینؑ کو کی اور اسی پر وہ خود مکمل طور سے کاربند رہے۔

معاویہ کا رویہ یزید کے آئندہ اقدامات میں محنت افزائی کا باعث ضرور ہوا۔ مثال کے طور پر معاویہ کا مدینہ پہنچنے کے وقت حضرت امام حسینؑ کو ان الفاظ سے مخاطب کرنا کہ تم ایک قربانی کا دنبہ ہو جس کا خون جوش کھا رہا ہے۔ قسم ہے خدا کی یہ خون ضرور گرایا جائے گا۔

یزید اپنی ذہنیت کے مطابق اس سے یہی نتیجہ نکال سکتا تھا کہ میرے باپ کا ارادہ اس دشمن سلطنت کے ساتھ اس طرح کا تھا جسے انھوں نے قسم کھا کر ظاہر کیا تھا۔ اور انھیں اس کی تکمیل کا موقع نہیں ملا۔ پھر اگر پدرتواند سپر تمام کند، خصوصاً جبکہ آخر وقت تک معاویہ اپنے بعد ہونے والے خلیفہ کو ان ہی چند منکرین بیعت کے خطرہ کی طرف بار بار متوجہ بھی کرتے رہے۔ یقینی گزشتہ دھکی سے جو خیال یزید کے دماغ میں پیدا ہو چکا تھا اس کے ساتھ یہ آخری وقت کی وصیتیں بھی اثر پیدا کر سکتی تھیں کہ یزید اپنا سب سے پہلا نصب العین اور مقصد زندگی اپنے باپ کے بعد اسی کو قرار دے لے کہ خطرہ کو کسی طرح دور کیا جائے اور باپ کا جو مقصد تھا اور جس کی تکمیل کا انھیں موقع نہ مل سکا اب اس کو پایہ تکمیل تک پہنچایا جائے۔ چنانچہ یزید نے تخت سلطنت پر قدم رکھتے ہی سب سے پہلا جو سیاسی کام کیا وہ یہی کہ اپنے چچا زاد بھائی ولید بن عتبہ بن ابی سفیان کو جو مردان کی معزولی کے بعد اس زمانہ میں مدینہ کا حاکم تھا خط لکھا کہ خلیفہ وقت یزید کی طرف سے ولید بن عتبہ کو معلوم ہو کہ معاویہ ایک خدا کے بند سے تھے جنھیں اس نے عزت دی اور سلطنت عطا کی اور اپنی نعمتوں سے مالا مال کیا۔ وہ جب تک مقتدر ہیں تھا زندہ رہے اور جب عمر پوری ہو گئی تو دنیا سے رخصت ہو گئے۔ خدا ان پر رحمت نازل کرے کہ انھوں نے قابلِ تعریف زندگی گزاری اور پرہیزگاری و نیکو کاری کے ساتھ مکہ مردان ایک مرتبہ معاویہ کی طرف سے مدینہ کا حاکم آٹھ برس دہمیت تک رہا اور پھر ربیع الاول ۴۰ھ میں معزول کیا گیا اور سعید بن عاص کو حاکم مدینہ مقرر کیا گیا (طبری ج ۶ ص ۱۲۷) دوبارہ ۴۰ھ میں مسجد کی معزولی کے بعد مردان کو حاکم مدینہ مقرر کیا گیا (طبری ج ۶ ص ۱۲۷) پھر ۴۱ھ یا ایک قول کے مطابق ۴۲ھ میں اسے معزول کیا گیا اور ولید بن عتبہ کو حاکم مدینہ بنایا گیا (طبری ج ۶ ص ۱۲۷)

چودھواں باب

یزید کا بیعت پر اصرار اور حسینؑ کا انکار

تخت خلافت پر بیٹھنے کے بعد یزید کے لیے عیش و آرام کی کمی نہ تھی۔ دنیا تمام زیب و زینت کے ساتھ اس کے سامنے موجود تھی اور تاج و تخت، مال و دولت، احترام و خدم اور عیش پرستی و شہوت رانی کے تمام اسباب پوری فراوانی کے ساتھ مہیا تھے۔ لیکن ایک خیال تھا جو اس کے دل و دماغ کو پریشان کیے ہوئے تھا اور اس کی نظروں میں اس تمام جہاد و حشم کو خاک سیاہ بنائے ہوئے تھا۔ وہ ان چند آدمیوں کا بیعت سے انکار تھا کہ جن میں اول درجہ کی شخصیت حسینؑ بن علیؑ کی تھی۔ ان کے نفسیات اس کے کسی طرح متحمل ہو ہی نہیں سکتے تھے۔ جوانی کا نشہ اور پھر شراب کی ترنگ بے ہوشی و مشقت کے حاصل شدہ سلطنت کا غرور۔ اپنے باپ کی کوششوں کی کامیابی کا گھمڑا اور تمام ملک عرب کے سرِ اطاعت خم ہو جانے کا غرور۔ ناامودہ کسی نا عاقبت اندیشی سیاست حکومت ہے ناشامی اور نظم سلطنت سے بے خبری۔ اس کے بعد مرنے والے باپ کا مرتے مرتے اسی بات کو کرنا اور نفس کے آخری آمد و شد تک اسی فکر و اضطراب کی کشمکش میں مبتلا رہنا۔ یہ وہ باتیں تھیں کہ جن کی وجہ سے یزید کو یہ کد ہو گئی تھی کہ ان انگلیوں پر گنے جانے والے اشخاص سے جلد از جلد بیعت حاصل کر لی جائے۔ کوئی شک نہیں کہ ان سب کی اور بالخصوص امام حسینؑ کی بیعت سے علیحدگی اور خاموشی معاویہ کو بھی اتنی ہی شاق تھی جتنی یزید کو مگر معاویہ کو تشدد کے نتیجہ کا

تھا اور یزید کو نہ تھا۔

یہ کہا جاسکتا ہے کہ اگر معاویہ کی زندگی اور طولانی بھی ہوتی تو ان کی طرف سے ایسا فیصلہ طرزیہ عمل نہ اختیار کیا جاتا جیسا یزید کی طرف سے اختیار کیا گیا مگر واقعات یہ کہنے پر مجبور کرتے

عالم آخرت کو سدھارے۔ والسلام۔

اس خط میں تو صرف معاویہ کے وفات کی اطلاع ہے۔ ایسے رسمی الفاظ میں جو عموماً خبر وفات کے طور پر لکھے جایا کرتے تھے مگر اس کے ساتھ ہی ایک اور چھوٹا سا پرچہ بھی ولید کو بھیجا گیا۔ اس کا مضمون یہ تھا کہ حسینؑ اور عبداللہ بن عمرؓ اور عبداللہ بن زبیرؓ کو بیعت پر سختی سے مجبور کرو اور بغیر بیعت لیے ہوئے انھیں ذرا سا بھی موقع نہ دو۔ والسلام

یہ خط ہے کہ جس میں شروع ہی سے سخت گیری کا عنصر نمایاں ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ اب صورت حال خاموشی کے حدود پر باقی نہیں رہ سکتی۔ یعنی حضرت امام حسینؑ کا یہ لائحہ عمل کہ ہم شریک ظلم نہ ہوں اور یزید کی خلافت کو تسلیم کر کے اس کے افعال و اعمال کی ذمہ داری اپنے اوپر نہ لیں لیکن اس کے ساتھ ہم اپنی طرف سے کوئی ایسا اقدام بھی نہ کریں کہ ملک کے امن و امان کو صدمہ پہنچے اور شورش و ہنگامہ برپا ہو۔ یہ منہ پرانی روایت ہے۔ اب تو عمل کی منزل ہے۔ یا تو مختتم اقرار یا مختتم انکار۔ مگر انکار ایسا جس میں نتائج کی ایک پوشیدہ ہے۔ یزید کا خط ولید کو پہنچا۔ ولید ابوسفیان کا پوتا اور معاویہ کا بھتیجا سہی لیکن وہ ایک حد تک امام حسینؑ کی عظمت و شخصیت سے متاثر تھا۔ اس میں بظاہر اتنی سفاکی اور ستم کشی بھی نہ تھی کہ ایک بے گناہ کا خون بہاتے ہوئے اس کو لذت محسوس ہو۔ یزید کے فرمان شاہی نے اس کے باطنی جذبات میں ایک تامل پیدا کر دیا اور اس شش درج میں پڑ گیا کہ یزید کے اس حکم کو کس طرح انجام دیا جائے۔ لہذا اس نے مروان بن الحکم سے جو اس وقت مدینہ میں موجود تھا مشورہ کیا۔ حالانکہ اس سے پہلے ولید کے مدینہ کی حکومت پر آنے کے وقت سے اس میں اور مروان میں اس حد تک کشیدگی ہو گئی تھی کہ مروان نے ولید کے یہاں کی آمد و رفت ترک کر دی مگر اس وقت ولید کو ضرورت یہی معلوم ہوئی کہ مروان کو مشورہ میں ضرور شریک کرے شاید اسی لیے کہ کہیں جو طرز عمل وہ اختیار کرنا چاہتا ہے اس کی سیاست کے خلاف نہ ہو

اور مروان اس کے خلاف جاسوسی یا چغلی خوری کا کام انجام نہ دے۔ مروان نے محمد رسول اللہؐ کے زمانہ ہی میں ایسی شرارتیں کر چکا تھا کہ رسول اللہؐ نے اس کو اور اس کے باپ کو مدینہ سے باہر نکال دیا تھا، کہا کہ عبداللہ بن عمرؓ اور عبدالرحمن بن ابی بکرؓ کی تم فکر نہ کرو۔ وہ تو طالب خلافت ہوں گے نہیں۔ ہاں حسینؑ بن علیؑ اور عبداللہ بن زبیرؓ کو پابند بنانا ضروری ہے۔ لہذا تم ابھی ان لوگوں کو بلو ابھیجو اور وفات معاویہ کی خبر پھیلنے کے قبل ہی ان سے بیعت یزید کا مطالبہ کرو اور اگر وہ بیعت نہ کریں تو قتل کر دو۔ اس لیے اگر انھیں معاویہ کے انتقال کی خبر ہوگئی پھر ایک ایک طرف کھڑا ہو جائے گا اور علانیہ مخالفت کرنا اور خود اپنی طرف لوگوں کو دعوت دینا شروع کر دے گا۔ سہ

ولید محسوس کرتا تھا کہ اس پورے مشورہ پر وہ عمل نہیں کر سکتا، تاہم اس نے اسی وقت عبداللہ بن عمر بن عثمانؓ کو جو ایک محسن لڑکا تھا حضرت امام حسینؑ اور عبداللہ بن زبیرؓ کو بلانے کے لیے بھیجا۔ یہ دونوں آدمی اس وقت مسجد نبویؐ میں بیٹھے ہوئے تھے اور بوقت واحد دونوں کو یہ پیغام پہنچا کہ امیر نے آپ کو بلایا ہے۔ یہ وقت ایسا تھا کہ اس وقت ولید کبھی باہر نہ بیٹھتا تھا۔ اور لوگوں کی ملاقات نہ ہوتی تھی۔ ان حضرات نے کہا کہ تم چلو ہم آتے ہیں۔ آدمی واپس گیا۔ عبداللہ بن زبیرؓ نے کہا کہ یہ ولید کے بیٹھے وقت نہیں ہے، اس وقت بلانے کا کیا سبب ہو سکتا ہے؟ کچھ آپ کے خیال میں آتے ہیں کیا بات ہے؟ امام حسینؑ نے فرمایا۔ میرا خیال ہے کہ ان کا ظلم کا دیوتا دنیا سے اٹھ گیا ہے اور ہمیں اس وقت صرف بیعت کے لیے بلایا گیا ہے کہ لوگوں میں ابھی خبر پھوٹنے نہ پائے اور ہم لوگ پابن کر لیے جائیں۔ عبداللہ بن زبیرؓ نے کہا خیال تو میرا بھی یہی ہے۔ پھر اب کیا کرنا چاہیے؟ امام نے فرمایا۔ میں تو ابھی اپنے خاندان کے جو افراد کو جمع کرتا ہوں اور ان سب کے ساتھ وہاں جاتا ہوں۔ ان لوگوں کو دروازہ پر کھڑا کر دوں گا اور میں اندر جاؤں گا۔ عبداللہ بن زبیرؓ نے کہا مجھے اس میں آپ کی جان کا اندیشہ ہے۔ کہیں

جبکہ اس کی طرف سے عملی طور پر کوئی شورش انگیزی کی جارہی ہو۔ خلافت کے ہر دور میں کچھ لوگ ایسے رہے جنہوں نے بیعت نہیں کی تھی۔ خود حضرت علی بن ابی طالب کے زمانہ خلافت میں حسان بن ثابت، کعب بن مالک اور زید بن ابیہ وغیرہ کئی آدمی ایسے تھے جنہوں نے آپ کی بیعت سے کنارہ کشی کی تھی۔ مگر صرف بیعت نہ کرنا کوئی قابلِ مزا جرم نہیں سمجھا گیا۔ یہ بھی اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ معاویہ نے مکہ اور مدینہ میں چاہے کتنی ہی بڑی کانفرنس یزید کی بیعت لینے کے لیے منعقد کی ہو لیکن یقیناً مکہ اور مدینہ کی مردم شماری کے اعتبار سے سیکڑوں ہزاروں آدمی ایسے رہ گئے ہوں گے جو گھروں میں بیٹھے ہوں گے اور جنہوں نے یزید کی بیعت نہیں کی ہوگی لیکن کسی کے لیے بیعت کی ضد نہیں کی گئی اور سلطنت کو ان سے کاوش پیدا نہیں ہوئی۔ پھر ایک حسینؑ میں کیا بات ایسی تھی کہ آپ سے بیعت حاصل کر لینے کے لیے سلطنت شام کی پوری مشینری حرکت میں آجائے اور ناہی جبروت کی تمام طاقت صرف کر دی جائے۔ ماننا پڑے گا کہ حسینؑ سے بیعت بھٹی۔ ملک عرب کے ایک فرد کے نہیں طلب کی جارہی تھی بلکہ اس بتا پر کہ ایک فرد ایک جماعت یا قوم بن جاتی ہے۔ نمائندگی کے اعتبار سے۔ حقیقت میں حسینؑ فقط حسینؑ ہی نہ تھے وہ تو اس وقت خاندان رسالت کی بزرگ ترین ہستی ہونے کے لحاظ سے اس ورثہ کے حامل تھے جو دین خدا کی صحیح معنی میں حفاظت سے متعلق تھا اور جو پیغمبر اسلامؐ کے بعد ان کے اہل بیت میں یکے بعد دیگرے مستقل ہو رہا تھا اور اسی لیے خاندان رسولؐ یا خاندان علی بن ابی طالبؑ میں محمد بن حنفیہ بھی تو تھے۔ عبداللہ بن جعفر بھی تو تھے۔ حضرت عباس بن علیؑ اور ان کے بھائی بھی تو تھے۔ کوئی شک نہیں کہ ان میں سے کسی نے یزید کی بیعت نہیں کی مگر تاریخ نہیں بتا سکتی کہ ان میں سے کسی سے بھی بیعت طلب کی گئی ہو۔ صرف اس لیے کہ ان میں سے کسی کو حسینؑ کی موجودگی میں وہ ذمہ دارانہ حیثیت حاصل نہ تھی جو حسینؑ کو حاصل تھی۔

یزید کو حسینؑ سے بیعت حاصل کرنے کی کوئی ضرورت نہ ہوتی اگر وہ صرف دنیوی

یہ اس کی ایک دلیل ہے کہ خط میں بیعت نہ کرنے کی صورت میں حسینؑ کے قتل کے متعلق ضرور لکھا تھا۔ ظاہری اسباب کی بنا پر بھی کوئی شک نہیں ہو سکتا کہ حضرت امام حسینؑ نے اسی وقت صورت حال کی نزاکت کا پورا احساس کر لیا اور یقیناً اس کے بعد جو کچھ طے کیا وہ تمام نتائج سوچ لینے کے بعد آپ نے یہ طے کر لیا کہ میں یزید کی بیعت ہرگز نہیں کروں گا۔ ابھی تک دنیا نفی کے معنی نہیں سمجھ سکتی تھی کیونکہ وہ انکار بیعت کی صورت میں ان تشدد کے درجوں کا اندازہ نہیں کر سکتی تھی جو بعد میں حسینؑ کے سامنے آئے لیکن حسینؑ جس وقت کہہ رہے تھے کہ میں بیعت نہیں کروں گا اس وقت وہ بیعت نہ کرنے کے معاوضہ میں ظلم و تشدد کے تمام امکانات پر غور کر کے اور اپنے نفس کی قوت برداشت کا پورا جائزہ لے کر کامل اعتماد کے ساتھ بیعت کی نفی کر رہے تھے اور اسی لیے آپ دیکھیں گے کہ تشدد اپنی آخری حد پر پہنچ گیا مگر حسینؑ کے صبر برداشت کی قوت ختم نہ ہو سکی۔ وہ اپنی بات پر آخر تک قائم رہے۔ اسی عزم و استقلال کے ساتھ جس کو انھوں نے پہلے دن طے کر لیا تھا۔

یہاں پر یہ بحث پورے طور پر صاف ہو جانی چاہیے کہ آخر یزید کی رسمی بیعت اختیار کر لینا کونسا ایسا ناقابلِ برداشت امر تھا جسے حضرت امام حسینؑ کسی صورت سے گوارا نہیں کرتے تھے۔ اس کے لیے ایک نظر حسینؑ کی ان ذمہ داریوں پر ڈالنا ہوگی جو خاندان رسولؐ کے اس وقت سب سے بڑے ذمہ دار رکن ہونے کے اعتبار سے ان پر عائد تھیں اور ان قدیم روایات کو دیکھنا ہوگا جو اسلام اور حقانیت کی حفاظت کے لیے امام حسینؑ کے آباؤ اجداد کی ذات سے وابستہ رہی تھیں اور جن کے اس وقت حسینؑ ذمہ دار تھے اور پھر یہ دیکھنا ہوگا کہ اس وقت حسینؑ اپنے فرض کی تکمیل کس طرح کر سکتے تھے۔ یہ بھی سمجھنا ہوگا کہ یزید کو حضرت امام حسینؑ سے بیعت لینے کے لیے اس قدر کدو کاوش کی ضرورت کیا تھی؛ جبکہ جمہوریت کے اصول پر اکثر افراد کا کسی حکومت کو قبول کر لینا آئینی طور پر اس کے مسلم ہو جانے کے لیے کافی اور اقلیت کی رائے ناقابلِ اعتبار ہے۔ اس کے ساتھ یہ کوئی قانون نہیں کہ اقلیت کو جبری طور پر اپنی رائے بدلنے کے لیے مجبور کیا جائے۔

کاندھ پر باری باری ہاتھ رکھ کر چل رہے تھے اور آپ کی زبان پر ابنِ مقررغ کے پرشمار
تھے سہ

لاذعرت السّوام فی فلق الصّبح مغیرا ولا دعیت سیزیدا
یوم اعطی من الہابۃ ضیما والمنایا یرصد فی ان اجیدا
”ان کا مطلب یہ ہوا کہ خدا وہ دن نہ لائے کہ موت کی طاقتیں کمینگا ہوں سے
حمد کر کے مجھے میرے راستے سے ہٹانے کی کوشش کریں اور میں ان کے خوف
سے ذلت کو برداشت کر لوں۔“

ابوسعید کا بیان ہے کہ ان اشعار کو سن کر اسی وقت میری سمجھ میں آیا کہ آپ کسی خاص
اقدام کا ارادہ رکھتے ہیں۔

دو ہی دن گزرے تھے کہ معلوم ہوا آپ مکہ کی طرف روانہ ہو گئے۔



قسم کی ایک سلطنت کا دعویدار ہوتا۔ مگر وہ جس قسم کی سلطنت کے مالک ہونے کا مدعی تھا وہ
تو خلافتِ اسلامیہ والی حکومت تھی جو رسول اللہ کی جانشینی کی مراد تھی سمجھی جاتی تھی۔ اس کا
نصب العین یہ تھا کہ بادشاہ مذہب کے جز و کل کا مالک ہو اور مذہبی قوانین بادشاہ کی خواہشوں
کے پابند ہوں۔ اس کے لیے ضرورت تھی کہ وہ پیغمبرِ اسلام کے مذہبی وارث سے اپنی حکومت
کو تسلیم کرائے اور وہ خوب سمجھتا تھا کہ اس وراثت کی حامل اس وقت صرف حسین کی ذات ہے
اس لیے وہ لازم سمجھتا تھا کہ آپ سے اپنی بیعت حاصل کرے۔

حسینؑ سمجھتے تھے کہ اگر اس وقت میرے بھائی حضرت امام حسنؑ زندہ ہوتے تو بیعت
کی خواہش ان سے کی جاتی مجھ سے نہ کی جاتی۔ اگر میرے پدر بزرگوار حضرت علیؑ ہوتے تو مجھ کو
ان سے کیا جاتا، مجھ سے نہ کیا جاتا اور اگر میرے جد بزرگوار رسول اللہؐ ہوتے تو اپنی حکومت
کے جواز کی تصدیق ان سے حاصل کرنے کی کوشش ہوتی مجھ سے نہ ہوتی۔ مگر اب تو وہ دیکھ لے
تھے کہ میرے نانا رسول اللہؐ نہیں ہیں، میرے بابا علی مرتضیٰ نہیں ہیں اور میرے بھائی حسنؑ
مجتبیٰؑ بھی نہیں ہیں۔ اب تو میں ہوں اس لیے مجھ سے بیعت طلب کی جا رہی ہے۔ اس صورت
میں اگر میں نے بیعت کر لی تو وہ ایسا ہے جیسے میرے بھائی حسنؑ ہوتے اور وہ بیعت کر لیتے۔
میرے بابا علیؑ ہوتے اور وہ میرے نانا رسول اللہؐ ہوتے اور وہ اس حکومت کو جائز تسلیم کر لیتے۔ انھوں نے اس سخت احساسِ ذمہ داری کی بنا پر تمام مشکلات
کو برداشت کرنا گوارا کر لیا اور یہ طے کیا کہ میں بیعت نہیں کروں گا۔

یہ عزت نفس، شرفِ حق اور وقارِ دینی کا سوال تھا اور پہلے ہی دن آپ نے
اس مرحلہ میں آخر تک ثابت قدم رہنے کا عزم کر لیا تھا جس کا آخری نتیجہ بھی معلوم تھا۔ اس کا
آپ نے کوئی بلند بانگ اعلان نہیں کیا تب بھی آپ کی زبان سے نکلے ہوئے الفاظ سننے
والوں کو اس کا پتہ دے رہے تھے۔ چنانچہ ابوسعید مرقری کا بیان ہے کہ میں نے امام حسینؑ کو مدینہ
کی مسجد میں داخل ہوتے ہوئے دیکھا۔ آپ کے ساتھ اس وقت دو آدمی تھے جن کے

کی تہدید تھی اس لیے کہ ہر اقدام جو اپنے وقت پر ہو غید نتیجہ خیز اور مؤثر ہوتا ہے لیکن اگر وقت سے پہلے عمل میں لایا جائے تو وہ نتیجہ معین ہو۔ کے بجائے مسئلہ ثابت ہوتا ہے بلکہ اپنے مترتب کو اکثر ہمیشہ کے لیے مورد الزام بنا دیتا ہے۔

واقعات کی رفتار کیا حالت پر نہیں رہتی کہ تدریجی حیثیت سے ترقی کرتی ہے اور ان کا طریقہ علاج بھی اسی اعتبار سے مختلف ہوتا ہے۔ ال کے طور پر زخم رسیدہ پکے ہوئے جزد بدن ماتھ یا پیر کا علاج کرو، پچھلے لگاؤ، مرہم بدو، ضرورت ہو تو بار بار نشتر دلاؤ، پھر اگر گناہ چھا ہو اور اس کی سمیت کے جسم میں سرایت کرنے کا خطر ہو تو اسے کاٹ کر بھی پھینک دو کسی کو اعتراض کا حق نہ ہوگا۔ لیکن اگر زخم پیدا ہونے کے ساتھ ہی اور کوئی علاج معالجہ کرنے کے پہلے ہی کاٹ ڈالتے تو ضرور مورد الزام ہوتے۔ عام طور پر بے عقل سمجھے جاتے ہمارا کام یہ ہے۔ عملی دہی ہے جو بعد میں امتیاز کیے جانے پر مدد و دستخیز قرار پائیگا۔

دشوار گزار حالات کی اصلاح کے لیے قربانی اور وہ بھی جان کی قربانی کامیاب اور مؤثر ترین حربہ ہے لیکن سب سے آخری جب تمام وسائل اور ذرائع ختم ہو جائیں اور کوئی تدبیر کارگر نہ ہو اسی وقت اس کا درجہ ہے۔ وہ جہاں سے پہلے عمل میں آجائے تو جلد بازی غیر موقع شناسا اور نا عاقبت اندیشی وغیرہ کا الزام آ جاتا ضروری ہے جس کے بعد اس کو حق بجانب نہیں سمجھا سکتا اور اسی کے ساتھ اس کی کامیابی اور تاخیر رخصت۔

حالات کی اصلاح کے لیے احتجاج و استغاثہ صاحت اور معاہدہ موت یا ایسی چیزیں ہیں جن کا اختیار کیا جانا ابتدائی حدود میں ضروری۔ بیشک جب یہ سب ذرائع اختیار کیے جانے پر ناکام ثابت ہوں تو پھر عربی مش من جتوب الا جتوب حلت بہ الذی امتہ اور فارسی مثلاً آلودہ را آلودہن ہل است کے مطابق ان سے ان ذرائع کا مطالبہ ہو سکے گا۔ اس کی رفتار عمل کو آگے بڑھ کر دوسرے اقدام کی پہنچنے کا حق ہوگا۔ یہی تدریجی رفتار ہے۔

پندرہواں باب

امام حسنؑ کی خاموشی اور امام حسینؑ کا اقدام

اس مقام پر اکثر یہ سوال پیش کیا جاتا ہے کہ آخر حضرت امام حسنؑ نے بھی تو زبیر کے باپ معاویہ سے مصالحت کر لی تھی۔ اسی طرح اگر امام حسینؑ صلح کر لیتے تو کیا حرج تھا؟ بظاہر دونوں بھائیوں کے طرز عمل میں اختلاف ہے اور اسی سے سلطنت بنی امیہ کے ہوا خواہوں نے دونوں بھائیوں کے اختلاف رائے کی حکایتیں بھی تصنیف کی ہیں لیکن تاریخی واقعات کی رفتار کا بغور مطالعہ اس اختلاف طبیعت کے سوال اور اس خیال کی کوئی گنجائش باقی نہیں رکھتا۔

حقیقت یہ ہے کہ حالات مختلف ہوتے ہیں اور ان حالات کے لحاظ سے فرائض کا تقاضا بھی مختلف ہو جاتا ہے۔ بنائے زمانہ زیادہ رجحانات کے پابند ہوتے ہیں اور جذبات اکثر افراط و تفریط کی بنا پر حد اعتدال سے بڑھے ہوئے ہوتے ہیں لیکن اخلاق انسانی میں کامل اشخاص ہر موقع پر فرض کا اندازہ کرتے ہیں۔ انھیں اس سے بحث نہیں ہوتی کہ وہ بنائے زمانہ کے جذبات کے مطابق ہے یا مخالفت اس لیے ان کا طرز عمل اکثر عام افراد انسانی کو متضاد نظر آتا ہے اور اکثر ان پر دونوں طرح کے معترض پائے جاتے ہیں۔ کبھی ان پر اقدام پسند طابع اعتراض کرتے ہیں اور کبھی رجعت پسند طبیعتیں معترض ہوتی ہیں لیکن وہ ان اعتراضات کی کوئی پروا نہیں کرتے اور اپنے مسلک کے پابند رہتے ہیں۔ اس لیے کہ وہ ان کے نزدیک فرض کا تقاضا ہوتا ہے۔

یہی صورت ہم کو پیغمبر اسلامؐ کے طرز عمل کے متعلق ملتی ہے۔ یہی علی رضیؑ کی سیرت اور ان کے ہونے اور حسینؑ کے طرز عمل کے متعلق نظر آتی ہے۔

واقعات سے کہ جس مجتہبی کی سطح میں کے واقعات کا تذکرہ پہلے ہو چکا ہے۔ وہی مجاہدہ کرنا

اس کے بعد لوگوں کے انتہائی اصرار پر خلافت قبول کرنا اور بنی امیہ کا آپ کے مقابلہ میں برسرِ بیکار ہوجانا آپ کا شہید ہونا اور امام حسن کا مسندِ خلافت پر متمکن ہونا لیکن حالات کی نامازگاری کی وجہ سے صلح کر لینا اور مخصوص شرائط معاہدہ کے ساتھ سلطنت کی ذمہ داریوں سے دستکش ہو کر دس برس خاموشی کی زندگی بسر کرنا اور پھر دس ہی برس تک خود امام حسین کا بھی عملی حیثیت سے خاموش رہ کر حالات کا مطالعہ کرتے ہوئے اکثر زبانی یا کتبی احتجاج کرتے رہنا لیکن باوجود اس کے حالات کا ردِ باصلاح ہونے کے بدلے بدلے بد سے بدتر ہوتے جانا، شرائط معاہدہ کو ٹھکرا دیا جانا، صلح نامہ کی دفعات کا پامال ہوجانا، زبانی احتجاج و استغاثہ پر کوئی شنوائی نہ ہونا بلکہ اپنے غنایت سوز اور اسلام کش افعال پر بیش از بیش اصرار کیا جانا اور اس سلسلہ میں پانی کا سر سے لٹکا ہوجانا اور معاملات کا رے گزر جانا وہ تھا جس نے امام حسینؑ کے لیے اس عظیم اقدام کا موقع پیدا کر دیا تھا کہ جو انھوں نے کرنا کب سے زمین پر اچھا دیا۔

حسینؑ سے سامنے اب معرکہ ہوا ابی نہیں سلتا تھا اس لیے کہ صلح کی منزل کو امام حسینؑ نے کر چکے تھے اور اب شرائط صلح کی مخالفت ہی وہ صورت حال تھی جو امام حسینؑ کے سامنے تھا حالانکہ معاویہ اپنے اعمال میں بہر حال کچھ نہ کچھ پردہ رکھنے کی کوشش کرتے تھے۔ پھر جب معاویہ کے ساتھ مصالحت نتیجہ میں ناکام رہی تو یزید کے ساتھ مصالحت کے کیا معنی؟ پھر امام حسنؑ نے جو صلح کی اس کی نوعیت تو یہ تھی کہ پہلے حضرت امام حسنؑ مسندِ خلافت پر نہ تھے۔ صلح کے ذریعہ سے آپ نے حکومت ظاہری کو چھوڑ دیا اور مخصوص شرائط کے تحت معاویہ کے سپرد کر دیا مگر اس کے معنی یہ نہیں تھے کہ آپ نے خلافتِ اہلبیت امامت یا حق اسلامی کے بارے میں اپنے دینی مسلک اور معاشرتی و اجتماعی اصول سے دست برداری اختیار کر لی۔ یہ صلح اس کے بعد سے صرف ایک معاہدہ عدم تعرض کی حیثیت رکھتی تھی جسکی وجہ روحانیت کا مرکز دنیوی اقتدار کے مرکز سے ایک عرصہ تک کے لیے علیحدہ ہو گیا اور ابی یسے حضرت امام حسنؑ کی زندگی اس معاہدہ کے بعد بھی محفوظ نہیں رہی سلطنتِ شام

عمل میں جب تک قائم ہے کامیابی کی توقع ہے ورنہ نہیں۔ ایک بات ہو جانے پر پہلے ہی دن مرنے مارنے پر آمادہ ہو جانے والا مغضوب الغضب کہا جائے گا۔ وہ کسی تعریف کا مستحق نہیں برخلاف اس کے اگر تمام دیگر ذرائع و اسباب سے اتمامِ حجت کے بعد انسان کسی اہم مقصد کے لیے جان دینے پر تیار ہو جائے تو فداکاری و جان نثاری اور مؤخر قربانی قرار پائے گی۔

ایک انسان اگر اپنے اعمال و افعال میں توازن کو ملحوظ رکھتا ہے اور اپنی کارگزاری میں صرف جذبات کا فرمانبردار نہیں بلکہ عقلی غور و تدبیر کا پابند ہے تو اسے اس نظام کا پابند ہونا ضروری ہے۔ شام کی اموی سلطنت کے ہاتھوں بے شک مذہبِ خطرہ میں تھا اور سچی و راستی پامال ہو رہی تھی جس کی اصلاح کے لیے قربانی درکار تھی لیکن اس قربانی کے سچے بجانب قرار پانے کے لیے دوسرے پُر امن اور صلح پروردہ مسائل و ذرائع صرف کیے جانے کی ضرورت تھی۔

اگر امام حسینؑ بغیر کسی قسم کے سابقہ حالات کے اچانک یزید کی بیعت سے کنارہ کشی کر کے باوجود فقدانِ اعوان و انصار مخالفت پر جس کا لازمی نتیجہ آپ کا قتل ہونا تھا تیار ہو جاتے اور ایسا کرنے تو ان سوالوں کا پیدا ہونا ناگزیر تھا کہ آخر امام نے اتحادِ عمل کے ساتھ حالات کی درستگی کی کوشش کیوں نہ کی؟ مخصوص شرائط کے ساتھ صلح کر کے ان مقاصد کو کیوں نہ حاصل کیا؟ کم سے کم امورِ سلطنت سے بے تعلقی اختیار کر کے مدینہ رسولؐ میں قیام پذیر کیوں نہ رہے اور کر بلا آکر اپنے کو معرضِ خطر میں کس لیے ڈالا؟

ان سوالات کے پیدا ہونے کے بعد جن کا کوئی صحیح حل بھی بظاہر موجود نہ ہوتا یقینی آپ کا قتل ہونا صرف جذبات کی کارفرمائی کا نتیجہ قرار پاتا اور اس لیے نہ قابلِ تائیس ہوتا اور نہ مؤثر کامیاب مگر یہاں صورت حال یہ تھی کہ امام حسینؑ کا اقدام ایک مکمل نظام کے تحت میں واقع ہو رہا تھا جس کے لیے برسوں کی طویل مدت کے حالات موقع کو قریب لارہے تھے یہاں تک کہ سنہ ۶۰ سے لے کر ۶۱ھ تک میں اس کا وقت آگیا۔

شروع شروع میں جناب امیرؑ کا اپنے حقوق کی پامالی کے باوجود ۶۰ سال خاموش رہنا

مگر مذکورہ الفاظ میں یزید کی غلامی کا اقرار کر کے لیے تیار نہ تھے بلکہ
ان ہی باتوں کا نتیجہ تھا جیسا کہ بعد میں معلوم ہو گا کہ امام حسینؑ کو آپ کے اس اقدام کے
سلسلہ میں مختلف اوقات میں بہت سے دے دیے گئے۔ یہ کہا گیا کہ مدینہ ہی میں قیام کیجیے۔
یہ کہا گیا کہ مکہ کو مستقر بنائے رکھیے۔ یہ کہا گیا کہ طائف یا یمن کی طرف چلے جائیں۔ یہ کہا گیا
کہ کوہِ اجال میں چل کر پناہ لیجیے۔ مگر یہی غریب یا مست نے مشورہ نہیں دیا کہ آپ یزید کی بیعت
کر لیجیے کیونکہ یہ ایک تسلیم شدہ بات تھی کہ یزید کی بیعت امام حسینؑ کے لیے کسی طرح ممکن نہیں۔
یزید کی بیعت کرنے کے معنی یہ تھے کہ ہر قسم کے شریفانہ شعور اور مسلمانوں کے
ہر قسم کے حقوق کو بیچ ڈالنے حسینؑ کے لیے مل تھا کہ حسینؑ فضیلت اور نسلالت کو ایک
درجہ میں رکھتے۔

عبداللہ بن عباس، عبدالرحمن بن ابی اور عبداللہ بن زبیر وغیرہ نے بھی یزید کی خلافت
کو پسند نہیں کیا۔ ان سب نے معاویہ کے سامنے ہی یہ کہہ دیا تھا کہ ان کا یہ طریق عمل کسی طرح
جائز نہیں ہے۔ پھر حسینؑ ہر دوسرے شخص سے زیادہ اسلام کا درد رکھتے تھے۔
حسینؑ زیادہ سچی رکھتے تھے کہ وہ یزید کے مطالبات کو حقارت کی نظر سے دیکھیں
اور ہر قسم کی قربانی اسلام کی حمایت میں پیش کریں۔

امام حسینؑ سے اس عدم تعرض پر اکتفا کرنے والی ہوتی تو طلبِ بیعت کی ضرورت نہ تھی کیونکہ
عدم تعرض نوان حضرات کی جانب سے قائم ہی تھا۔ دمشق کی سیاست اب اس پر رضامند نہیں
تھی کہ روحانیت کا مرکز مادی اقتدار کے مرکز سے الگ دنیا میں موجود رہے۔ معاویہ کا معاہدہ دفعتی
طور پر ایک مجبوری کا نتیجہ تھا۔ بغیر اس کے حضرت امام حسنؑ کی تسلیم شدہ حیثیت جو مسلمانوں میں
باعثِ احترام حکومت حاصل تھی ختم نہیں ہو سکتی تھی۔ اس کے بعد ان کو خود ادران کے بعد یزید کو
شدت کے ساتھ اس کا احساس تھا کہ یہ کاٹنا ہمیشہ کے لیے راستے سے نکل جائے۔ تسخیرِ ممالک اور
تسخیرِ قلوب مختلف چیزیں ہیں۔ ایک کو دوسرے سے کوئی لگاؤ نہیں ہے۔ فاتحِ ممالک کو فاتحِ
قلوب سے ہر وقت اندیشہ رہتا ہے۔ یہی خطہ تھا جس کی وجہ سے اہل بیت رسولؐ سلطنتِ دمشق
کی نظر میں بہر حال قابلِ مزاحمت تھے خواہ وہ مزاحمت کریں یا نہ کریں۔
ان حالات کے ہوتے ہوئے امام حسینؑ کے لیے اس طرح کی صلح کا کوئی محل نہ تھا جیسی صلح
امام حسنؑ کر چکے تھے۔ وہ صلح ایسی تھی کہ اگر اس وقت ذمہ دارانہ حیثیت امام حسینؑ کی ہوتی
تو آپ بھی اس صلح کے مسلک کو اختیار کر کے مسلمانوں میں امن قائم کر دیتے۔ آپ کے
سامنے تھا بیعت کا سوال۔ اس کے معنی تھے اس روحانی مرکز کی شکست جس کے حسینؑ ذمہ دار
تھے۔ اس کے معنی تھے اس تمدن اور نظامِ سیاست کو قبول کر لینا جو سلاطینِ دمشق نے قائم کیا
تھا۔ یہ ایسی چیز تھی جو اہلِ محمدؐ کے لیے کسی طرح قابلِ قبول نہیں ہو سکتی تھی خواہ حسینؑ ہوتے یا ان کے
جائے اس وقت امام حسنؑ ہوتے۔

پھر سابق زمانہ میں تو خلفاء اپنے کو کتاب اور سنت کا محافظ ظاہر کیا کرتے تھے اور بیعت
بھی اسی پر لی جاتی تھی کہ کتاب و سنت پر عمل کیا جائے۔ مگر یزید نے دو بینِ عظمت کی مطلق العنانی
اور خود سری اس درجہ پر پہنچ گئی تھی کہ بیعت لی جاتی تھی اس بات پر کہ ہم خلیفہ کی ملکیت ہیں۔ وہ
ہمارے جان و مال اور اولاد کے ساتھ جو چاہے سلوک کر سکتا ہے۔ مدینہ میں یزید بن عبداللہ بن
ربیع بن السدوسی جرمِ پر قتل کیے گئے کہ وہ کتاب اور سنت پر بیعت کرنے کے لیے تیار تھے۔

سولھواں باب

حسینی موقف کی تشریح

جب کوئی صورت سمجھوتے اور مصالحت کی تھی نہیں تو پھر اب کیا رہ جاتا ہے؟ جنگ! مگر مادی طور پر جنگ کرنے کا سوال اس وقت پیدا ہی نہیں ہو سکتا تھا۔ تاریخی صورت حال یہ ہے کہ اس وقت حضرت علی بن ابی طالب کی وفات کو بیس برس گزر چکے تھے۔ بنی امیہ کی طاقت جو شام میں تھی حضرت علیؑ ہی کے زمانہ میں اتنی مضبوط ہو گئی تھی کہ حضرت علیؑ کی قوت سے صفین میں گویا برابر کی ٹکرے سکی اور حضرت امام حسنؑ کو اس سے مقابلہ میں ایک شدید خونریزی کے آثار نظر آئے جس کی وجہ سے آپؑ نے صلح کرنا بہتر سمجھا حالانکہ اس وقت شیعان علیؑ کی جمعیت منظم تھی مگر اب بیس برس کی طولانی مدت گزرنے پر وہ جتنا پرانہ ہو چکا تھا۔ ہزاروں آدمیوں کے نمبر خریدے جا چکے تھے۔ بہت سے ثابت قدم لوگوں کے سر قلم کیے جا چکے تھے اور بہت سوں کو جیلوں میں بھرا جا چکا تھا۔ بقیہ لوگ خوف و دہشت اور بددی سے ادھ اُدھر پریشان و پاشان ہو گئے تھے۔ ایسی صورت میں دشمن کے شہنشاہی اقتدار کے مقابلہ میں جنگ کا سوال ہی کیا پیدا ہو سکتا تھا؟ اس کے علاوہ آپؑ کا مقصد جو یزید کے مقابلہ میں تھا وہ مادی جنگ سے حاصل بھی نہیں ہو سکتا تھا اس کی تشریح آئندہ کی جائے گی۔

اس کے بعد حضرت امام حسینؑ بیعت سے انکار کر رہے تھے تو کیا کریں گے؟ اسے اگر حسینؑ کر کے نہ دکھلاتے تو ہماری ہرگز سمجھ میں نہ آتا۔ حسینؑ نے یہی طے کیا کہ وہ جنگ سے گریز نہیں کر سکتے۔

ہوتا ہے۔ حسینؑ نے سب سے پہلے یہ نمونہ پیش کرنا چاہا کہ آپؑ طاقت کا مقابلہ کردار سے کریں گے۔ آپؑ نے یہ طے کیا کہ آپؑ اقتدار کا مقابلہ بے بسی سے، کثرت کا مقابلہ قلت سے اور ظلم کا مقابلہ مظلومیت کے ساتھ کریں گے اور یہ وہ طریقہ جنگ تھا جس کا مشاہدہ اس سے پہلے دنیا نے نہیں کیا تھا۔

آپؑ محسوس کر رہے تھے کہ تعلیمات اسلام پر ایسا غلات چڑھ گیا ہے جس سے آئندہ صدیوں کو اور کیا مت تک آنے والی نسلوں کو پتہ بھی نہیں چلے گا کہ حقیقتاً وہ تمدن، وہ آئین معاشرت اور وہ نظام زندگی کیا تھا جسے پیغمبر اسلامؐ نے دنیا کے سامنے پیش کیا تھا۔

یہ ظاہر ہے کہ بعد کی آنے والی نسلوں کے لیے سابقہ حالات معلوم کرنے کا ذریعہ اگر کوئی ہو سکتا ہے تو وہ کتب تواریخ۔ یہی تاریخ کی دورین وہ ہے جس کے ذریعہ سے صدیوں اور ہزاروں برس پہلے کے حالات کا انسان مطالعہ کرتا ہے۔ اسلامی دنیا میں سلاطین اسلام کا شاہنشاہی اقتدار اتنا نمایاں تھا کہ اگر اسلامی تمدن و تہذیب کی جانچ کے لیے کوئی طالب تحقیق تاریخ کے اوراق پر نظر ڈالتا تو اس کو اسلام کی سرزمین پر دمشق اور بغداد کے ادب و تہذیب نظر آتے۔ وہ بڑے بڑے چھانگ دکھائی دیتے جن پر زرتار پردے پڑے ہوئے ہیں وہ ایوان جلوہ دکھاتے جہاں دیواروں پر زرد و سیاہ کا کام بنا ہوا ہے اور سونے چاندی کے دروازے ہیں اور اگر محل کے اندر بار بار بی بی ہو جاتی تو زرد و سیاہ سے مرصع تخت نظر آتا اور زریں مکر غلام صفت باندھے ایستادہ، مہ جبینوں کا جھرمٹ، شراب کے دور، مغنی کی صداؤں ساز و طرب کے نغموں کی گونج۔ پیشوائے اسلامؐ کی بارگاہ میں نماز کا وقت آتا ہے تو وہ بھی سلام کرتا ہوا چلا جاتا ہے۔ مؤذن کی صدا آتی ہے مگر نشاط و طرب کے نقار خانہ میں طوطی کی آواز بن کر سنائی نہیں دیتی۔ جب وہ نظارہ دیکھتا تو کیا یہی رائے قائم نہ کرتا کہ اسلام کا تمدن ہی ہے اور یہی وہ تہذیب ہے جس پر مسلمان نازاں ہیں؟ یقیناً ایسا ہی ہوتا کہ وہاں کا آئین و نظام بطور مثال پیش کیا جاتا۔ ان کے افعال مسلمانوں کے افعال بن جاتے اور ان کا کردار

کوشش کرتے رہے مگر اس کو جس صورت سے آپ نے حاصل کیا وہ ایک ایسی مثال ہے جو نہ اس سے پہلے نظر آئی اور نہ بعد کو۔

سیاسیات ام کے واقف کار خوب جانتے ہیں کہ ظلم و جور کی طاقت اور شہنشاہیت جس وقت افراد انسانی کو اپنے شکنجہ میں قید رکھنا چاہتی ہے تو کچھ ذرائع اختیار کرتی ہے اور ان تمام ذرائع کا اصلی مقصد دو چیزیں ہوتی ہیں۔ ایک یہ کہ عوام سے قوت احساس کو سلب کیا جائے دوسرے جرات اظہار کو ختم کیا جائے۔ شام کی اموی حکومت نے اپنے اقتدار کو قائم رکھنے کے لیے ان ہی دو باتوں پر پوری طاقت صرف کر دی تھی ورنہ مسلمان جن کو پیغمبر نے محنت و مشقت کے ساتھ اصول انسانیت کی تلقین کی ہو اور جنہوں نے دیکھا ہو کہ پیغمبر کس طرح مادی ساز و سامان کو بیچ بکھتے تھے جنہوں نے اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کیا ہو کہ پیغمبر کے دروازے پر پھٹا ہوا پردہ پڑا رہتا تھا جنہوں نے دیکھا ہو کہ تین تین دن تک پیغمبر کے گھر سے دھواں نہیں اٹھتا، جتنا روپیہ آتا ہے غریبوں اور مسکینوں کو دے دیا جاتا تھا۔ وہی کیونکر اس کو برداشت کر سکتے کہ بادشاہ کے خزانہ میں غریبوں کا خون چوس کر روپیہ جمع ہو اور اس کو رنگ رلیوں میں صرف کیا جائے۔ خلیفہ کی بارگاہ میں رقص و سرود کی محفلیں ہوں اور شراب کباب کے مشطے رہیں مسلمان اس کو صرف خاموشی سے دیکھتے ہی نہ رہیں بلکہ ایسے شخص کو پیشوائے تسلیم کریں۔ یہ فطرت کا انقلاب مسلمانوں میں کس طرح پیدا ہو سکتا تھا؟ صرف قوت حس ختم ہونے اور جرات اظہار کے سلب ہونے سے۔

قوت احساس ختم کرنے کی صورتیں بہت سی ہیں ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ عوام صاحب رائے نہیں ہوتے۔ ان کے پاس دل ہوتا ہے مگر دماغ نہیں ہوتا۔ دماغ رکھنے والے متنازعات اور لیڈر ہوتے ہیں۔ خاص خاص لیڈروں کو اپنے ہاتھ میں لے لیا جائے تو جلد صریح لیڈر لے جانا چاہیں عوام بے خبری کے ساتھ اسی طرف چلے جائیں گے خواہ یہ راستہ کتنا ہی غلط کیوں ہو۔ اسی بنا پر عموماً جمہوریتوں میں ظاہری کثرت رائے حقیقی رائے عامہ کی ترجمان نہیں ہوتی۔ اموی

ہی ایک ایسا آئینہ ہوتا ہے جس میں مسلمانوں کی تصویر نظر آتی۔ کہاں نظر آتے محمد بنی ہاشم کے وہ ٹوٹے بھوٹے کھنڈ رہن میں کچھ بوڑھے کچھ جوان اور کچھ بچے اپنے خالق کی یاد میں مصروف ہیں۔ وہ دروازے جہاں غریب محتاج اور مسکین آتے ہیں تو اپنے سامنے کا کھانا اٹھا کر دے دیا جاتا ہے اور خود خاق سے دل گزار لیے جاتے ہیں۔ جہاں غلام اور کنیز سے مساویہ بنا دیا گیا جاتا ہے۔ کہاں نظر آتے وہ پھرے جن پر محنت و مشقت برداشت کرنے سے زردی چھائی ہوئی ہوتی ہے۔ وہ ہونٹ جو ذکر الہی سے خشک ہو گئے ہوں۔ وہ افراد جن کا نصب العین یہ ہے کہ کسی غریب کو اٹھاؤ، کمزور کی مدد کرو، کسی محتاج دے کس کی دستگیری کرو، کسی مظلوم کو ظلم سے نجات دلاؤ اور دنیا کو اپنے اخلاق سے نمونہ جنت بناؤ۔

بہن حسین بن علی کا مقصد یہ تھا اور وہ یزید کی بیعت کا انکار کرتے ہوئے اسی پر کمر بستہ ہو گئے تھے کہ توسی وہ انسانیت کی نگاہ کو ان ادبے مناظر سے ہٹا دیں۔ ان نصرتوں اور دنیاؤں سے موڑ دیں اور اسلامی اصول کی برقی تخیل کو عمل کی اس معراج پر آنکھوں کے سامنے لائیں کہ نظر اٹھے ہی سب سے پہلے اسی پر جا پڑے اور اسی کی چمک دمک میں محو ہو جائے انہوں نے چاہا کہ اپنے کردار کو ایسی بلندی پر لے جائیں جہاں وہ تارے کی طرح چمک اٹھے۔ سلاطین دنیا کے بڑے بڑے محل اور مینار نظر نہ آئیں بلکہ آپ کا کردار نظر آئے۔ وہ چاہتے تھے کہ انسانیت کے کانوں کو اس نقارہ خانہ ساز و نغمہ سے بہرا بنادیں اور حقانیت اسلام کی اس سر بلبل اور دلکش آواز سے شہنا سا کر دیں جو موجودہ فضا میں سنائی نہیں دیتی۔

دوسرے لفظوں میں آپ کا مطلب یہ تھا کہ ایک مرتبہ دنیا کے سامنے اس حقیقت کو پوری شدت و قوت سے پیش کر دیں کہ حکومت و شہنشاہیت اور ہے اور اسلامی تہذیب و تمدن اور اس کے اصول اور ہیں۔

حضرت امام حسینؑ جس مقصد کو لے کر اٹھ رہے تھے وہ اپنی نوعیت و خصوصیت میں کوئی نیا نہ تھا۔ وہ تو وہی تھا جسے تمام انبیاءؑ لے کر آئے تھے اور جس کے لیے تمام مصلحین ہمیشہ

نے بس یہ چاہا کہ مسلمانوں کے بیہوش احساسات پر ایک ایسا تیز چھینٹا دے جس کے بعد وہ پھر بری لے کر آنکھ کھول دیں اور گھبرا کر یہ دیکھنے لگیں کہ دنیا میں کیا ہو رہا ہے؟ یہ بھی قابل غور امر تھا کہ اس بیہوشی کا سبب کیا ہے؟ یقیناً اس کا سبب یہ تھا کہ وہ جماعت جو تعلیمات اسلامی کو مٹا رہی ہے اگر صاف صاف کوئی غیر مسلم جماعت ہوتی تو مسلمان جلدی سے چونک پڑتے لیکن وہ جماعت جو اس وقت تعلیمات اسلام کو برباد کر رہی ہے اپنے چہرہ پر ایسی دہکی اسلام کی نقاب ڈالے ہوئے تھی اور مسلمانوں کی جماعت میں داخل تھی اس لیے مسلمان بیدار نہیں ہوتے تھے۔ حضرت امام حسینؑ نے یہ ارادہ کر لیا کہ اپنی مقابل جماعت کے چہروں سے اسلام کی اس نقاب کو اتار کر پھینک دیں اور دنیا کو دکھادیں کہ اس نقاب کے پیچھے کیسے لوگ چھپے ہوئے ہیں اور یہ کہ ان کو اسلام سے حقیقتاً کوئی تعلق نہیں ہے۔ اس طرح ایک تو موجودہ مسلمان ان سے بیزار ہو جائیں گے اور ان کے خلاف انقلاب پیدا کرنے کے لیے تیار ہو جائیں گے۔ دوسرے بعد میں مسلمانوں کے لیے ان کے افعال سند نہ رہیں گے۔ جب مسلمانوں کو ان کے اسلام کی صحیح تصویر معلوم ہو جائے گی تو مسلمان دھوکا کھا کر ان کے دام میں نہ پھنس سکیں گے۔ نیز غیر مسلم دنیا کے سامنے اسلام کی جانب سے صفائی پیش ہو جائے گی۔ اگر بنی امیہ کے اوصاف و اخلاق کو اسلام کے خلاف پیش کیا جائے گا تو مسلمانوں کی گردنیں جھکیں گی نہیں بلکہ حسینؑ بن علیؑ کا کردار مسلمانوں کے سر کو بلند کرے گا کہ اگر یزید کے افعال کو اسلام سے کوئی تعلق ہوتا تو بغیر اسلام کا تو اس اپنے کو خطرہ میں کیوں ڈال دیتا۔ یہی مقاصد وہ تھے جو تمام دھمال مادی جنگ سے حاصل نہ ہو سکتے تھے۔ مادی جنگ سے جو فتح حاصل ہوتی ہے اس سے افراد و اشخاص قتل ہوتے ہیں مگر ذہنیت قتل نہیں ہوتی۔ سلطنتوں میں انقلاب ہو سکتا ہے مگر افراد جامعہ کے احساسات میں انقلاب نہیں ہوتا۔ حسینؑ بن علیؑ اشخاص کو قتل کرنے نہیں اٹھے تھے۔ یزید کو ہلاک کرنا نہیں چاہتے تھے۔ وہ تو یزیدیت کو قتل کرنا چاہتے تھے۔ ہو سکتا تھا کہ یزید حتم ہو جاتا اور اس کے تمام عمال اور فوجی افسر بھی ہلاک ہو جاتے پھر بھی یہ نہیں سمجھا جاسکتا

سیاست نے خواص کو اپنے قبضہ میں کیا۔ اس طرح کہ جس کو ذرا مخالفا نہ رجحان رکھتے ہوئے پایا اس کی حبیب میں اشرفیوں کی ایک جھیلی پہنچا دی گئی۔ اگر اس نے قبول کر لی تو مجھ لیجیے کہ جتنا ان اشرفیوں کا وزن تھا اتنا ہی اس کی مخالفت کا سر جھک گیا۔ پھر جھپٹی نہیں ہے منہ سے یہ کافر لگی ہوئی؟ جہاں خیال پیدا ہوا کہ اب کی دفعہ دو توڑے ملے ہیں اس کے بعد بجائے دو کے چار ملیں گے۔ وہیں قوت احساس ختم ہو گئی یعنی یہ خیال ہونے لگا کہ دنیا کے لیے چاہے جیسے ہوں یہ حکام ہمارے لیے تو بہت اچھے ہیں۔ اس طرح بہت سے لوگوں کا غمخیز بن گیا اور بہت سے اصول کے بچہ جن کے سراٹھے ہی رہے ان کے سر اور جسم میں جدائی پیدا کر دی گئی اور اگر یہ حسد بہ خطرناک معلوم ہوا تو شہد کا ایسا جام بولب تک پہنچے ہی موت کی میٹھی نیند سلا دے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ عوام نے یہ سوچنا موقوف کر دیا کہ ہو کیا رہا ہے اور بہت سے لوگوں نے جب کچھ سوچا تو ان لوگوں کے انجام کو دیکھا جو اس کے پہلے کچھ سوچ کر اختلاف کا اظہار کر چکے تھے کہ آج صفحہ ہستی ان کے نقش وجود سے خالی ہے۔ اس طرح جرأت اظہار ختم ہوئی۔

یہی دو چیزیں ایسی تھیں جن کو از سر نو پیدا کرنے کا بیڑا اٹھا کر حضرت امام حسینؑ میدان میں آئے۔ آپ نے سوچا کہ قوت احساس کو نکر پیدا کی جائے؟ اس کے لیے ایک حاذق طبیب کی طرح مرض کے سبب پر غور کرنے کی ضرورت تھی۔ آخر مسلمانوں کی اس بے حسی کا سبب کیا ہے؟ کیا یہ واقعی مسلمان نہیں رہے؟ دیکھا تو اب بھی لوگ اسلام کو ماننے ہیں اور اپنے کو مسلمان کہنا فخر سمجھتے ہیں مگر ان کے احساسات اسلامی پر غشی چھا گئی ہے جیسے کوئی آدمی بیہوش ہو جائے تو اس میں نفس کی آمد و شد قائم رہتی ہے جو زندگی کا پتہ دیتی ہے مگر آثار زندگی مفقود ہوتے ہی احساس اور حرکت ارادی دونوں چیزیں گم ہوتی ہیں۔ اسی طرح اس وقت جامعہ اسلامیہ میں کلمہ توحید کے نفس کی آمد و شد ہے جو ان کے ظاہری طور پر اسلام کی دلیل ہے مگر اسلامی روح کام کچھ نہیں کر رہی ہے اور احساسات اسلامی فنا ہو گئے ہیں۔ ہر ایک کو معلوم ہو گا کہ جب کسی کو غش آجاتا ہے تو اس کے چہرے پر چھینٹا دیا جاتا ہے۔ جتنی گری بے ہوشی ہوا اتنا ہی تیز چھینٹا دیا جائے گا۔ امام حسینؑ

حکومتوں میں مقابلہ ہوتا اور مسلمانوں کی طاقتیں آپس میں دوکر پاش پاش ہوتی رہتیں۔ مگر امام حسینؑ ایسی کامیابی حاصل کرنا چاہتے تھے جو نہ باعتبار حدود مملکت محدود ہو اور نہ باعتبار حدود زمانہ محدود۔ ممکن ہے یہ سوال اٹھایا جائے کہ حسینؑ کے واقعہ شہادت کے بعد بھی تو بہت سے سلاطین انہی افعال کے مرتکب ہوتے رہے جن کا یزید از کباب کرتا تھا مگر یاد رکھنا چاہیے کہ حسینی مقادیرت نے اسلام کے تمدن و اصول کو اتنا نمایاں کر دیا کہ اب اس کے خلاف جو افعال ہوتے ہیں وہ انفرادی اور شخصی جرائم کی حیثیت رکھتے ہیں اور انھیں آئینی اور مذہبی درجہ نہیں حاصل ہوتا یعنی یہ خطرہ اب ہمیشہ کے لیے دور ہو گیا ہے کہ انہی کو اسلام کا مستقل اصول اور طریق معاشرت سمجھ لیا جائے کیونکہ امام حسینؑ نے اسلام کی آئینی عظمت کا نہ مٹنے والا نقش قائم کر دیا ہے۔

گزشتہ بیانات سے صاف ظاہر ہو گیا کہ حسینؑ بن علیؑ کے لیے اپنے مقصد کے حصول کا صرف ایک ہی ذریعہ تھا اور وہی جسے انھوں نے اختیار کیا اور اس کے سوا کوئی دوسرا ذریعہ نہ تھا۔

آپ اس راستے میں موت کے استقبال پر ہمیشہ سے تیار تھے جو آپ کے الفاظ اور مخاطبات سے ظاہر تھا۔

چنانچہ مکہ سے روانگی کے وقت اپنے خطبہ میں آپ نے ارشاد کیا کہ ”موت انسان کی گردن سے اسی طرح وابستہ ہے جیسے گلو بند جوان عورت کی گردن سے۔“ بادی النظر میں تو آپ کو اس سے مرث اتنا ظاہر کرنا مقصود تھا کہ انسان کے گلے میں موت کا پھندا پڑا ہوا ہے اور بہر حال اس کو ایک نہ ایک دن اس دارِ فانی سے رخصت ہونا ہے مگر آپ نے اس تلخ حقیقت کا کچھ ایسے دلکش انداز سے تذکرہ فرمایا ہے جس سے صاف محسوس ہوتا ہے کہ آپ کے نزدیک موت کوئی ناگوار شے نہیں بلکہ حسینؑ دیدہ زیب چیز ہے۔ یہ عام قاعدہ ہے کہ انسان کی جیسی ذہنیت ہوتی ہے۔ ویسے ہی الفاظ اس کی زبان پر آتے ہیں۔ چونکہ حسینؑ اس گھرانے کے ایک فرد تھے جس کے افراد عمومی حیثیت سے موت کو کبھی خاطر میں لاتے ہی نہیں تھے اور آپ کے پیش نظر بقائے

تھا کہ یزیدیت ختم ہو گئی اور یزیدی مسلک فنا ہو گیا۔ ذہنیت دنیا کی جب مادّہ تھی تو اگر عسکری طاقت نے کر جنگ کرتے تو جو اسکی واقعی حیثیت تھی اس کے سمجھنے والے بہت کم ہوتے اور یہ سمجھنے والے زیادہ ہوتے کہ حکومت و سلطنت کی غرض سے دو بادشاہوں کی جنگ ہے اور سیاسی حیثیت سے یزید کا پتہ گراں رہتا اس لیے کہ وہ بادشاہ تسلیم کیا جا چکا تھا۔ اس صورت میں اگر آپ کو نفع حاصل بھی ہوتی جو گزشتہ اسباب کی بناء پر بظاہر غیر ممکن تھی تو اس کا اثر ایک فتنی انقلاب سلطنت کی صورت سے ہوتا جس کا نتیجہ دیر پا نہ ہوتا اور بنی امیہ پر جو ظاہری اسلام کا پردہ تھا وہ اسی طرح پڑا رہتا اور اگر کچھ لوگ حسینؑ کو حق پر سمجھتے بھی ہوتے تو فریقِ محارب کو خطا، اجتہادی کی سند دے دیتے جیسا کہ اس سے پہلے صفین کی جنگ کے متعلق ہو چکا تھا۔ اس صورت میں بنی امیہ کے باطنی حالات کا اس درجہ انکشاف کہ جو ان سے ہمدردی کا کوئی گوشہ انسانیت کے دل میں باقی نہ رکھے ہرگز نہیں ہو سکتا تھا اور جب تک ان سے نفرت انتہائی درجہ پر پیدا نہ ہوتی اس وقت تک ان امتیازات و اقدار کی مکمل شکست نہیں ہو سکتی تھی، جنھیں بنی امیہ نے عملی طور پر قائم کرنا چاہا تھا۔

اگر امام حسینؑ طاقت کے ذریعہ سے یزید کی طاقت کو شکست دیتے تو پھر بھی دنیا اس چیز کو نہ سمجھتی کہ حقانیت اور حکومت دو الگ چیزیں ہیں۔ حسینؑ بن علیؑ کی فتح و فوج سمجھی جاتی جو بادشاہوں کی فتح ہوتی ہے۔ یعنی اگر آپ یزید کو شکست دے کر سلطنت پر قابو حاصل کر لیتے تو آپ کی سلطنت کو دنیا سلطنت ہی سمجھتی اسلام کی حقیقت نہ سمجھتی۔ حالانکہ تاریخی حالات بتاتے ہیں کہ اس طرح کی مکمل فتح آپ کو کبھی حاصل ہی نہیں ہو سکتی تھی۔ بڑی سے بڑی مادی کامیابی بھی آپ کی محدود حیثیت رکھتی، یعنی اس صورت میں کہ جب کونہ میں حالات سازگار ہوتے اور سب لوگ آپ کی حکومت تسلیم کر لیتے تو زیادہ سے زیادہ وہی ہوتا جو حضرت علیؑ بن ابی طالبؑ کو وقت سے مجبور ہو کر کرنا پڑا تھا یعنی عراق و حجاز و غبیرہ کی حکومت امام حسینؑ کے پاس اور شام کی حکومت یزید کے پاس ہوتی۔ دونوں طرف کی

خفاہیت کا اہم ترین مقصد بھی تھا لہذا آپ کے تاثرات اس بارے میں بہت زیادہ قوی تھے۔ چنانچہ مکہ سے روانگی کے بعد پہلی ہی منزل پر جب آپ کی فرزدق شاعر سے ملاقات ہوئی اور انھوں نے کوفہ کی حالت آپ سے بیان کی کہ لوگوں کے دل تو آپ کی طرف ضرور ہن گرتواریں ان کی بنی امیہ کے ساتھ ہونگی تو آپ نے فرمایا۔ ”تم سچ کہتے ہو، لیکن ہر بات خدا کے ہاتھ میں ہے اور وہ جو چاہتا ہے کرتا ہے اور ہر دن وہ ایک نیا کرمہ قدرت کا دکھاتا ہے۔ خدا کی تعذیر اگر ہماری خواہش کے مطابق ہوئی تو ہم خدا کی حمد کہیں گے اور ادا کے شکر کے لیے اسی سے مدد کے طالب ہوں گے اور قضائے الہی ہمارے سہرا رہے ہوئی تو انسان کے لیے یہی کیا کم ہے کہ اس کی نیت میں سچائی اور اس کے ضمیر میں پارسائی کا خیال باقی رہے۔“

عراق کے راستے میں حر کے ساتھ جو آپ کی گفتگو ہوئی تھی وہ بھی آپ کے اسی مستقل نظریہ کے ماتحت تھی یعنی یہ کہ حر نے کہا کہ میں آپ کو خدا کا واسطہ دیتا ہوں آپ اپنے اوپر رحم کریں اس لیے کہ اگر آپ نے جنگ کی تو آپ یقیناً قتل کر دیے جائیں گے اور آپ تباہ ہوں گے۔ تو آپ نے جواب دیا کہ تم مجھے موت سے ڈراتے ہو؛ کیا تم اس سے زیادہ کچھ کر سکتے ہو کہ مجھے قتل کر ڈالو؟

اس کے بعد آپ نے قبیلہ اوس کے ایک شاعر کا یہ شعر پڑھا کہ

سامضی وما بالموت عار علی الفتی اذا ما نوى حقاً وجاہد مسلماً

”میں اپنے ارادہ پر قائم رہوں گا اور موت سے دوچار ہونے میں جو افسردگی کے لیے کوئی عار و فتنہ نہیں ہے جب کہ اس کی نیت میں سچائی ہو اور وہ راہ حق میں جہاد کر رہا ہو۔“

یہ بظاہر عجیب چیز ہے۔ انسانی نگاہ میں آخری اور انتہائی انجام قتل ہونا ہے لیکن حضرت امام حسینؑ فرماتے ہیں کہ ”کیا اس سے زیادہ تم کچھ کر سکتے ہو کہ مجھے قتل کر ڈالو؟“ یعنی آپ قتل ہونے کو ایک درمیانی منزل قرار دیکر آخری معیار فتح و شکست کا کچھ اور قرار دے رہے ہیں۔

ذو حسم ہی کے مقام پر جب حر کا لشکر امام کی مزاحمت کے لیے آچکا ہے تو حضرت نے اپنے اصحاب کے سامنے خطبہ ارشاد کیا جس میں حمد و ثنائے باری کے بعد فرمایا:-

”صورت حال جو پیش آئی ہے وہ غم دیکھ رہے ہو اور یقیناً دنیا کا رنگ بدل گیا ہے اور اس کی نیکی رخصت ہو چکی ہے اور اس میں کچھ رہ نہیں گیا ہے۔ سوائے تھوڑے حصے کے جو پانی بہنے کے بعد برتن میں بچ رہتا ہے۔ اور ایک پست زندگی مثل زہر ملی گھاس کے کیا تم نہیں دیکھتے کہ حق پر عمل نہیں ہوتا اور باطل سے علیحدگی نہیں اختیار کی جاتی۔ اس صورت میں مومن یقیناً خدا کی ملاقات کا آرزو مند ہوتا ہے۔ میرے نزدیک تو موت کی صورت میں شہادت کی سی نعمت ہے اور زندہ رہنا ان ظالموں کے ساتھ دبا جان ہے۔“

اسی کے ساتھ آپ نے حکام اور عوام کے حقوق و فرائض کے حدود قائم کر لیے اور بتایا کہ حکومت عوام کی ذہنی و عملی ترقی اور دین کے احکام نافذ کرنے کے لیے ہے اور وہ اس وقت تک قابل احترام ہے جب تک عوام کی زندگی کو اس سے فائدہ پہنچ رہا ہو۔ ایک موقع پر آپ نے حاکم کے اوصاف ان الفاظ میں بیان فرمائے۔ ”حاکم کے لیے ضروری ہے کہ اسلامی دستور پہنچا ہو۔ عدل و انصاف سے پیش آتا ہو۔ حق کا پابند ہو اور رضائے الہی میں اپنے نفس کو تنقید کیے ہوئے ہو۔“ اور جس حکومت کے خلاف آپ احتجاج کرنے رہے اس کے طرز عمل پر تبصرہ کرتے ہوئے کئی بار اظہار خیال کیا۔ حر کے لشکر کے سامنے آپ نے فرمایا۔ ”رسول اللہؐ نے فرمایا ہے کہ جو ظالم بادشاہ کو دیکھے کہ وہ عہدِ خدا اور سنتِ رسولؐ کی مخالفت کر رہا ہے اور بندگانِ خدا کے ساتھ ظلم و تعدی سے پیش آتا ہے اور وہ قول یا فعل سے اس ظالم کو نذر دے کہ تو خدا اسے بھی اس چہرہ دست بادشاہ کے زمرہ میں شمار کرے گا۔ دیکھو موجودہ حکومت شیطان کی حلیف بن گئی ہے اور خدا کی فرماں برداری سے روگردانی کر رہی ہے۔“

سترھواں باب

حرم رسولؐ سے سفر اور نرم خدا میں پناہ

دلید سے گفتگو کے بعد وہ دقت آگیا کہ اب امام نے مدینہ کو ترک کرنا ہی اپنے لیے ضروری سمجھا۔ یہ خیال کرنا کہ آپ مدینہ ہی میں قیام دیتے تو مدینہ والے آپ کی حفاظت میں کوئی دقیقہ اٹھانہ رکھتے، تاریخ کے مسلسل واقعات سے بخبری یا ان کے نتائج سے غفلت کا مظاہرہ ہوگا۔

وفات رسولؐ خدا کے بعد ہی سے مدینہ پر کچھ ایسے اثرات چھلے ہوئے نظر آتے ہیں جن کی بنا پر یہ توقعات غلط ثابت ہو۔ ہیں۔

آخر یہ مدینہ ہی تو تھا جہاں وفات رسولؐ خدا کے بعد ہی حضرت فاطمہ زہراؑ پر مصائب کی پوری صفائی مگر اہل مدینہ کی طرف سے ان کے ساتھ ہمدردی کا کوئی مظاہرہ کہیں تاریخ میں نظر نہیں آتا۔

پھر وہ مدینہ ہی تھا جہاں حضرت علیؑ نے ناگوں دلشکن حالات کا پچیس برس تک مقابلہ کیا مگر اہل مدینہ نے ان کے ساتھ کسی بھی بہت و غم خواری کا ثبوت نہیں دیا۔ اس کے بعد اسی مدینہ میں وہ موقع آنکھوں کے سامنے آیا کہ حضرت امام حسنؑ کے جنازہ کو روضہ رسولؐ پر لے جانے میں مزاحمت کی گئی مگر مدینہ کے لوگوں نے ذرہ بھر بھی اس پر احتجاج نہیں کیا۔ کیا یہ واقعہ ایسا اہم نہ تھا کہ مدینہ کے جسم میں اگر رنج ہوتی تو اس میں حرکت پیدا ہوتی اور کسی قسم کے احساس کا مظاہرہ کیا جاتا؟

یہ تو کربلا کے پہلے کے کچھ نمونے ہیں اور عود اسلام میں ہجرت انگیز مگر ناقابل انکار صورت

نقشہ و فساد برپا کر رکھا ہے اور حدود و آئین کو بے کار بنا دیا ہے۔ ملک کے سارے سرمایہ کو اپنی ملکیت بنا لیا ہے۔

عمر سعد کے لشکر سے خطاب کر کے فرمایا۔ تم دیکھتے نہیں کہ حکومت حق پر عمل نہیں کر رہی ہے اور باطل سے باز نہیں آتی۔ یہ وہ وقت ہے کہ مومن کو موت کی تمنا کرنا چاہیے میں تو اس ماحول میں موت کو اپنے لیے آسودگی اور نیک بختی اور ظالموں کے ساتھ زندگی کو سراسر تکلیف سمجھتا ہوں۔

شب عاشور کے خطبہ میں احوال و انصار کو مخاطب کر کے فرمایا۔ میں باعزت مرجانے کو زندگی سمجھتا ہوں اور ذلت کی زندگی بسر کرنے کو موت خیال کرتا ہوں۔

کربلا میں روز عاشور کے خطبہ میں آپ نے فرمایا۔ خدا کی قسم میں ذلت کے ساتھ اپنے کو تمھارے قبضہ میں نہ دوں گا اور نہ غلاموں کی طرح تمھارے سامنے سے بھاگوں گا۔ یہ تمھاری بہادری اور جان بازی کی موت کا اعلان۔

پھر ارشاد کیا :-

”میں پناہ مانگتا ہوں ایسے ہر شخص سے جو نخوت و غرور رکھتا ہو اور روز قیامت پر ایمان نہ رکھتا ہو۔ موت عزت کے ساتھ بہتر ہے اس زندگی سے جو ذلت کے ساتھ ہو۔“ پہلے فقرہ میں جبار و سرکش یزید کے جبروت سلطنت کی تحقیر ہے اور دوسرے فقرہ میں اس کی تشریح ہے کہ مادی طاقت کے آگے بند مقاصد کے خلاف سر جھکا دینا عزت انسانی کے خلاف ہے اور اس زندگی سے جو اس طرح ہو موت بہتر ہے۔

————— ❦ —————

کے متعلق رائے دریافت کی اور اس میں اہل حجاز کے متعلق پوچھا تو اس نے کہا: ”فستہ انگریزوں میں سب سے آگے مگر اس کے نتائج کے برداشت کرنے میں بہت کمزور اور کمزور کے سر کرنے میں ناکارہ“۔

اس صورت میں حالات اور بعد کے واقعات بتاتے ہیں کہ اگر امام حسینؑ عاقبت اندیشی کر کے مدینہ رسولؐ کو خالی نہ کر دیتے تو مروان جس نے ولید کو قتل حسینؑ کا مشورہ دیا تھا اور ولید کے اس مشورہ پر عمل نہ کرنے سے سخت برہم ہوا تھا وہی ولید کے ملازم طرز علیؓ کی اطلاع پر ولید کو دیا اور اس وقت یزید کا عتاب نامہ ولید کے پاس آتا تو یا تو خود ولید ہی کو پھر عمر سعدؓ کی طرح باوجود اپنے ضمیر کی مخالفت کے مال و جاہ دنیا کی طمع اور سطوت حکومت کے خوف سے حسینؑ کے خلاف اقدام کرنا پڑتا یا کوفہ کے نعمان بن بشیرؓ کی طرح اسکو معزول کر کے مروان بن الحکم یا اسی کے مثل کسی دوسرے سفاک اور سخت ترین دشمن اہل بیت کو مدینہ کا حاکم مقرر کیا جاتا اور فرزند رسولؐ کے خون سے مدینہ رسولؐ کی زمین کو گل رنگ بنا دیا جاتا۔

یہ خطرہ بالکل یقینی تھا اور اس نے فعلی حیثیت اختیار کر لی تھی۔ اس خط سے جو ولید نے یزید کے نام لکھا جس کا مضمون یہ تھا کہ خلیفہ المسلمین یزیدؓ کی خدمت میں ولید بن عقبہؓ کی جانب سے گزارش ہے کہ حسینؑ بن علیؓ آپ کی خلافت کو تسلیم نہیں کرتے اور نہ وہ آپ کی بیعت پر تیار ہیں۔ اب آپ کی جو رائے ہو۔“ اس کے جواب میں یزید نے لکھا کہ ”اس میرے خط کی تعمیل جلد کرنا کہ تمام ان ممتاز افراد کی جنہوں نے میری بیعت کر لی ہے اور جنہوں نے بیعت نہیں کی ہے مکمل فہرست جلد بھیجو۔ لیکن اس جواب کے ساتھ حسینؑ بن علیؓ کا سر موجود ہو۔“ اس حکم کی گہری کے مقابلہ میں ولید کہاں ٹھہر سکتا تھا؟ وہ تو اتفاق سے اس خط کے آنے سے پہلے ہی حضرت حسینؑ مدینہ سے روانہ ہو چکے تھے اس لیے ولید تعمیل حکم سے مجبور رہا۔ مگر اس کے بعد بھی ولید معتبوب ہونے سے نہیں بچا اور ماہ رمضان میں اسے معزول کر کے عمرو بن سعیدؓ ہی کو جو ابھی تک حاکم مکہ تھا مدینہ کا بھی حاکم مقرر کر دیا گیا۔

منہ کتاب البلدان ص ۱۲۵ ۱۲۶ ج ۱ ص ۱۲۶ و ۱۲۷

سے اہل مدینہ کی خاندان رسولؐ کے بارے میں بے حسی کا ثبوت یہ ہے کہ حضرت امام حسینؑ جب شہید ہو گئے اور آپ کے دردناک مصائب و مظالم کا تفصیل اہل مدینہ کو حال معلوم ہو گیا تب بھی اہل مدینہ نے خون حسینؑ کے انتقام کے لیے کسی بے حسینی کا مشاہدہ نہیں کیا اور باوجودیکہ عراق میں تلاطم ہو رہا تھا حجاز اس بارے میں بالکل خاموش تھا۔

وہ تو امام حسینؑ کی قربانی کا طبعی اثر تھا کہ یزیدؓ کی بد اعمالیوں پر نگاہیں متوجہ ہو گئیں اور پھر دوسرے سال یزیدؓ کے افعال و اعمال کے تفصیلی حالات معلوم ہونے کے بعد انہوں نے اعلان مخالفت کر دیا جس کے نتیجے میں واقعہ حرہ ظہور یزیدؓ جسکی اجمالی تفصیل اپنے محل پر بعد کو آئے گی مگر خود قتل حسینؑ کا جرم ان کو اتنا اہم معلوم نہ ہوا کہ وہ اسکی بناء پر یزیدؓ کے مقابلہ کے لیے کھڑے ہو جاتے۔

پھر اس کے بعد واقعات کا ایک طویل سلسلہ ہے جس میں سادات بنی فاطمہؓ پر بنی امیہ کے آخری دم تک اور پھر بنی عباس کے دور حکومت میں کیے کیے ہولناک مظالم ہوتے رہے مگر اہل مدینہ نے کبھی ان کی کوئی امداد نہیں کی۔ حضرت امام زین العابدینؓ سے لے کر امام علی نقیؓ تک تمام وہ مقدس ہستیاں جو اپنے وقت میں خاندان رسولؐ کی چشم و چراغ اور تعلیمات اسلام کی محافظ تھیں اپنے ابتدائی دور حیات میں اسی مدینہ میں مقیم تھیں۔ پھر یہیں کسی کو زہر دیا گیا۔ کسی کو مقید کر کے جلا وطن کیا گیا۔ کسی کو بجز مدینہ سے بلایا گیا مگر کیا کبھی مدینہ نے ان کی حفاظت کی کوشش تو درکنار اس پر اُٹ بھی کی؟ کبھی نہیں۔

کیا ان ماقبل اور بعد کے واقعات کو پیش نظر رکھنے کے بعد پھر یہ تصور صحیح ہوگا کہ امام حسینؑ مدینہ میں قیام فرماتے تو مدینہ والے آپ کی حفاظت میں جان لٹا دیتے؟ ہرگز نہیں۔

عام طور سے ہم چنانچہ کے متعلق درج ذیل باتیں کہیں کہیں کر دہشتناکات میں سمجھتے ہیں کہ ہم بہت کم رہتے ہیں۔ سچا یہ سب مساویہ نے اہل الزما سے محبت سرب حال

پھر اگر حضرت امام حسین مدینہ میں شہید ہوتے تو کیا آپ کی شہادت اسی نمایاں حیثیت کے ساتھ ہوتی جس طرح کربلا جاکر ہوئی؟ سیاست حکومت کا یہ تقاضا ہرگز نہ ہوتا بلکہ اسے طرح طرح کے لباس پہنائے جاتے۔ یا تو امام حسن کی شہادت کی طرح کوئی ”جعدہ بنت اشعث“ فراہم کی جاتی یا حضرت علیؓ کی طرح کوئی ”ابن ملجم“ کی طرح کا خارجی جس کے بعد بھی حکومت دمشق کا دامن اس الزام سے بری ہی ثابت کیا جاتا۔ اس صورت میں حسین واقعی قتل ہوتے یعنی وہ دنیا سے جاتے بھی اور سلطنت دمشق کے چہرہ پر اسلام و انسانیت کی نقاب چہر بھی پڑی رہتی۔

حضرت امام حسینؓ اس کے لیے ہرگز تیار نہ تھے۔ تدبیر کا اقتضا تھا کہ مدینہ میں قیام اسی وقت کیا جاتا جب مدینہ میں قیام ممکن ہو اور جب بیعت نہیں کرنا تھی تو اپنے اصول اپنے مقصد اور اپنی قربانی کو اسی افق پر لے جا کر پیش کرنا چاہیے تھا جس پر آپ کربلا کے میدان میں انھیں لے جاسکے۔ بے شک یہ سفر کوئی معمولی سفر نہ تھا۔ وہ کربلا کی منزل کا پہلا مرحلہ یا آخرت کے سفر کا پہلا قدم تھا اس لیے یہ رات حضرت امام حسینؓ نے پوری جاگ کر بسر کی اور اسے اپنے نانا (حضرت رسول خدام) ماں (حضرت فاطمہ زہرا) اور بھائی (حسن مجتبیٰ) کے مقدس مزارات سے رخصت ہونے میں صرف کیا۔

رات ختم نہ ہوئی تھی کہ آپ مدینہ سے روانہ ہو گئے۔ مدینہ کی صبح آج بے رونق تھی۔ اس لیے کہ حقیقی آفتاب اس کا آنکھوں سے اوجھل ہو چکا تھا اور رسولؐ کی قبر بے چراغ تھی۔ اس لیے کہ رسولؐ کو زیدہ آج صبحائے غربت میں گامزن تھے۔

سند: ۱۔ رجب کی اٹھائیس تاریخ تو کی رات تھی جب امام حسین مدینہ سے روانہ ہوئے۔ اس وقت آپ کی زبان پر قرآن کی یہ آیت تھی ”فخرج منها خائفاً يتوفى بقلب رب يخشى من القوم الظالمين“ اس آیت میں حضرت موسیٰؑ کا ذکر ہے اس وقت کا جب وہ فرعون کے ظلم و تشدد سے بیزار ہو کر مصر سے باہر نکلے میں۔ روانگی کے بعد امام حسینؓ شاہراہ عام سے مکہ کی طرف روانہ ہوئے۔ حالانکہ آبن زبیر اس کے پہلے شاہراہ (عام

کو چھوڑ کر غیر معروف راستوں سے مکہ کی طرف روانہ ہو چکے تھے۔ یہی مشورہ آپ کو بھی دیا گیا مگر آپ اپنی مدینہ سے روانگی کو فرار کی حیثیت دینے پر تیار نہیں تھے۔ آپ نے اس مشورہ پر عمل کرنے سے انکار کر دیا اور کہا کہ نہیں میں تو اسی راستے سے جاؤں گا۔ پھر خدا کو جو منظور ہو۔

آپ نے اپنے دادا ابوطالب کی تمام اولاد کو اپنے ساتھ لیا جن میں آپ کی دو بہنیں حضرت زینب اور ام کلثوم بھی تھیں۔ اس کے علاوہ سب اپنی بیعتیں اور متعلقین آپ کے ساتھ تھے۔

سوا محمد بن الحنفیہ کے سب جو کسی مجبوری یا مصلحت سے مدینہ میں چھوڑ دیے گئے اور ام بانی بنت ابوطالب پیرائے سالی کی وجہ سے نہ جاسکی تھیں۔ بس ان کے علاوہ اولاد ابوطالب میں سے کوئی بھی حسینؓ سے جدا نہیں ہوا اور ایک تاریخی حقیقت ہے کہ حسینؓ کے ساتھ بنی ہاشم میں سے سوا اولاد ابوطالب کے کسی اور ساتھ کا ایک شخص بھی میدان کربلا میں نظر نہیں آتا۔ اس طرز عمل سے بھی کہ آپ نے صرف اپنے والوں کو ساتھ لیا صاف نمایاں تھا کہ آپ جنگ کے ارادہ سے روانہ نہیں ہو رہے ہیں۔ مدینہ سے باہر نکلنے کے بعد امام حسینؓ نے مکہ معظمہ کی طرف رخ کیا۔ اس لیے کہ مکہ میں عرب کے قدیم آیات اور نیز اسلام کے مخصوص تعلیمات کی بناء پر کسی جانور تک کا قتل بلکہ گھاس تک کا بھی اکڑنا جائز نہیں ہے۔ امام حسینؓ نے یہاں پہنچ کر اپنے کو ظاہری طور سے ایک محفوظ آغوش کی بناء میں ڈالا دیا اور یہاں آپ نے نماز و شہر کی زندگی گزارنے لگے۔ نہ امور سلطنت سے غرض اور نہ مہمانداری سے کوئی تعلق۔ آپ نے مکہ پہنچ کر بھی نہ کہیں خطوط و رسائل روانہ کیے اور نہ مختلف اطراف جو اب کے لوگوں کو اپنی نصرت کی طرف دعوت دی۔ یہ بھی آپ کے مقصد کے تعین کے۔ آپ کے کردار کا ایک اہم جزو ہے۔

آپ کا مکہ میں ورود شب جمعہ ۳ شعبان سنہ ۶۰ھ کے لیے اس وقت آپ کی زبان پر قرآن کی یہ آیت تھی ”ولما توجه تلقاء مدين قال عسى ربي ان يهديني سواء السبيل“ یہ بھی حضرت موسیٰؑ کے واقعہ سے متعلق ہے جب انھوں نے مَدین میں پناہ لی تھی۔

۱۹ مئی ۶۰ھ لاخبار الطوال ص ۲۳ طبری ۶۲ھ ۱۹ مئی ۶۰ھ صحیح بخاری ج ۲ ص ۲۶۲ صحیح مسلم ج ۱ ص ۲۹۴ طبری ج ۶ ص ۱۹۶ ارشاد خدا ص ۲۵ طبری ۶۲ھ ۲۲ مئی ۶۰ھ قرآن مجید سورہ قصص آیت ۲۲

۲۱۲

حضرت امام حسینؓ اس کے لیے ہرگز تیار نہ تھے۔ تدبیر کا اقتضا تھا کہ مدینہ میں قیام اسی وقت کیا جاتا جب مدینہ میں قیام ممکن ہو اور جب بیعت نہیں کرنا تھی تو اپنے اصول اپنے مقصد اور اپنی قربانی کو اسی افق پر لے جا کر پیش کرنا چاہیے تھا جس پر آپ کربلا کے میدان میں انھیں لے جاسکے۔ بے شک یہ سفر کوئی معمولی سفر نہ تھا۔ وہ کربلا کی منزل کا پہلا مرحلہ یا آخرت کے سفر کا پہلا قدم تھا اس لیے یہ رات حضرت امام حسینؓ نے پوری جاگ کر بسر کی اور اسے اپنے نانا (حضرت رسول خدام) ماں (حضرت فاطمہ زہرا) اور بھائی (حسن مجتبیٰ) کے مقدس مزارات سے رخصت ہونے میں صرف کیا۔

رات ختم نہ ہوئی تھی کہ آپ مدینہ سے روانہ ہو گئے۔ مدینہ کی صبح آج بے رونق تھی۔ اس لیے کہ حقیقی آفتاب اس کا آنکھوں سے اوجھل ہو چکا تھا اور رسولؐ کی قبر بے چراغ تھی۔ اس لیے کہ رسولؐ کو زیدہ آج صبحائے غربت میں گامزن تھے۔

سند: ۱۔ رجب کی اٹھائیس تاریخ تو کی رات تھی جب امام حسین مدینہ سے روانہ ہوئے۔ اس وقت آپ کی زبان پر قرآن کی یہ آیت تھی ”فخرج منها خائفاً يتوفى بقلب رب يخشى من القوم الظالمين“ اس آیت میں حضرت موسیٰؑ کا ذکر ہے اس وقت کا جب وہ فرعون کے ظلم و تشدد سے بیزار ہو کر مصر سے باہر نکلے میں۔ روانگی کے بعد امام حسینؓ شاہراہ عام سے مکہ کی طرف روانہ ہوئے۔ حالانکہ آبن زبیر اس کے پہلے شاہراہ (عام

۱۹ مئی ۶۰ھ لاخبار الطوال ص ۲۳ طبری ۶۲ھ ۱۹ مئی ۶۰ھ صحیح بخاری ج ۲ ص ۲۶۲ صحیح مسلم ج ۱ ص ۲۹۴ طبری ج ۶ ص ۱۹۶ ارشاد خدا ص ۲۵ طبری ۶۲ھ ۲۲ مئی ۶۰ھ قرآن مجید سورہ قصص آیت ۲۲

اس کے بعد بھی کیا کہا جاسکتا ہے کہ حضرت امام حسینؑ کے ساتھ جو کچھ بھی تشدد ہوا اس کی ذمہ داری یزید پر نہیں بلکہ عمال حکومت پر تھی؟

اس وقت امام حسینؑ کا مکہ معظمہ میں قیام ایک پناہ گزین کی حیثیت سے تھا اور یہی مشورہ تھا جو آپ کو مدینہ سے روانگی کے وقت آپ کے بھائی محمد حنفیہ نے دیا تھا جسے آپ نے پسند کیا تھا۔ مکہ میں حالات کے ناسازگار رہنے کی صورت میں کیا ہوگا؟ اس کے متعلق محمد بن حنفیہ کی رائے یہ تھی کہ اگر وہاں حالات آپ کے موافق نہ ہوں تو آپ نکل جاتے گا، ریگستانی صحراؤں میں اور پہاڑوں کے دامنوں میں، اور ایک شہر سے دوسرے شہر میں منتقل ہوتے رہیں گے، یہاں تک کہ لوگوں کے حالات کا آخری نتیجہ سامنے آئے اور اس وقت کوئی قطعی رائے قائم کیجیے۔

آپ کا قیام مکہ میں ظاہری طور پر مستقل حیثیت رکھتا تھا اور کوئی خاص مقصد آپ کے پیش نظر نہیں تھا۔ سوا ایک پُر امن زندگی کے جسے ”جیوا اور جینے دو“ ہی کے لفظوں میں ادا کیا جاسکتا ہے۔ یہاں آپ نے نہ تو اپنی موافقت میں کوئی عسکری طاقت فراہم کی اور نہ جمہور کو یزید کے خلاف مشتعل کیا۔ تقریر اور تحریر کسی حیثیت سے بھی ایسی کوئی کوشش ثابت نہیں کی جاسکتی۔

آپ نے مکہ میں پہنچ کر شعب علیؑ میں قیام کیا۔ عبداللہ بن زبیر آپ سے دو ایک دن پہلے پہنچ چکے تھے۔ ان کے مکہ میں اچانک پہنچنے کے ساتھ لوگ ان کے گرد جمع ہو گئے تھے اور انھیں ایک مرکزیت سی محاسن ہو گئی تھی لیکن حضرت امام حسینؑ کے مکہ میں پہنچنے کے ساتھ لوگوں نے عبداللہ بن زبیر کو چھوڑ دیا اور اب وہ حضرت امام حسینؑ کے گرد و پیش رہنے لگے۔ اس بات سے عبداللہ بن زبیر کو کبوتہ ناگواری پیدا ہوئی اور انھیں اندازہ ہو گیا کہ حسینؑ کی موجودگی میں ان کا کوئی اثر قائم نہیں ہو سکتا۔ مصلحت وقت کی بنا پر وہ بھی صبح و شام دونوں وقت امام حسینؑ کے پاس آنے جانے لگے۔

جب معاویہ کی وفات ہوئی ہے تو مدینہ میں ولید بن عتبہ بن ابی سفیان کی حکومت تھی اور مکہ میں یحییٰ بن حکیم بن صفوان بن امیہ اور کوفہ میں نعمان بن بشیر النضاری اور بصرہ میں عبداللہ بن زبیر گورنر تھا۔

معلوم ہوتا ہے کہ حکومت دمشق کو یحییٰ بن حکیم پر اطمینان نہ تھا چنانچہ حضرت امام حسینؑ کے مکہ میں پہنچنے کے بعد یحییٰ بن حکیم کو معزول کیا گیا اور عمرو بن سعید بن عاص بن امیہ کو گورنر مقرر کیا گیا۔ پھر جب ولید کے طرز عمل کی اطلاع اور شاید مروان کی طرف سے رپورٹ یزید کو پہنچی تو ولید کی بجائے بھی اسی عمرو بن سعید کو مقرر کیا گیا مگر یہ بعد کی بات ہے۔ بعد میں یہ بھی ظاہر ہوگا کہ کوفہ کے گورنر کی پالیسی بھی حکومت دمشق کو ناگوار ثابت ہوئی اور وہاں بھی تبدیلی کی ضرورت پیش آئی۔ اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ امام حسینؑ کے معاملہ میں یزید کا طرز عمل اتنا غیر منصفانہ اور جارحانہ تھا کہ اسے اپنے مقصد کی تکمیل کے لیے آدمی نہ ملتے تھے۔ اور خود اس کے گورنر اس کے احکام کی تعمیل اس کی خواہش کے مطابق نہ کر سکتے تھے۔ صورت حال سے ظاہر ہے کہ عمال حکومت میں سے جو بھی حسینؑ کے ساتھ ذرا مراعات برتنے کا رجحان ظاہر کرتا تھا وہ فوراً ہٹا دیا جاتا تھا۔ تلاش تھی ایسے لوگوں کی جو اہل بیت رسولؐ کے ساتھ کسی مراعات کی جگہ اپنے دل میں نہ رکھتے ہوں۔

اٹھارواں باب

دعوت اہل کوفہ اور سفارت مسلم بن عقیل

کوفہ کی داغ بیل قرأت اور ہجرہ کے بیچ میں اس وقت ہوئی جب ۱۲ھ سے ۱۳ھ تک فاطمہ اور دوسرے محاذوں پر ایرانیوں کے مقابلہ میں فتوحات کے بعد مسلمانوں کی فوج نے عراق میں سکونت اختیار کی اور مدائن کی آب و ہوا ان کو اس نہ آئی اور سعد بن ابی وقاص کی ہدایت کے ماتحت یہ جگہ تلاش کی گئی اور یہاں مسجد اور مسلمانوں کے قیام کے لیے مکانات کی بنیاد ڈالی گئی۔

۱۳ھ میں سعد بن ابی وقاص اپنی فوج کے ساتھ مدائن سے منتقل ہوئے اور اس جگہ آکر مقیم ہوئے۔ کوفہ، عربی زبان میں اس جگہ کو کہتے ہیں جہاں سنگریزے اور ریگ مخلوط ہوں۔ چونکہ یہ جگہ اسی قسم کی تھی اس لیے اس کا نام کوفہ ہوا۔

دوسری طرف سمندر کے کنارے اس زمین پر جو "ارض الہند" کہلاتی تھی ایک دوسرے شہر کی بناء قائم کی گئی جس کا نام بصرہ ہوا اور اس طرح عراق کے ان دونوں شہروں کوفہ اور بصرہ کی آبادی بالکل ایک ساتھ شروع ہوئی۔

ابتداءً سیلیٹوں کے مکان بنائے گئے اور پھر ڈالے گئے۔ پھر اسی سال دونوں جگہ آتش زدگی واقع ہوئی جس میں یہ مکانات جل گئے تو اینٹوں کے مکانات کی تعمیر ہوئی۔ کوفہ کی آبادی اسی وقت سے کہ جب وہ آباد کیا گیا ایک لاکھ فوجیوں کی تھی۔

۱۲ھ طبری ج ۴ ص ۱۲۲

۱۳ھ طبری ج ۴ ص ۱۲۹

۱۴ھ طبری ج ۴ ص ۲۶۲

۱۳ھ طبری ج ۴ ص ۱۲۵

۱۴ھ طبری ج ۴ ص ۱۲۹

۱۵ھ طبری ج ۴ ص ۱۹۱

جب جناب امیر تخت خلافت پر متمکن ہوئے اور طائفہ و زبیر نے عائشہ کو ساتھ لے کر آپ کے خلافت فوج کشی کی تو انھوں نے اپنی سرگرمیوں کا مرکز عراق کو قرار دیا اس لیے حضرت امیرؓ کو ان کے تدارک کے لیے عراق آنا پڑا اور جنگ جمل واقع ہوئی۔ اس مقابلہ میں بصرہ والوں نے طعمہ اور زبیر کا ساتھ دیا تھا اور کوفہ کے لوگ حضرت علیؓ بن ابی طالب کے ساتھ رہے۔ اس کے بعد حضرت علیؓ نے اسی کو اپنا پایہ تخت رکھا۔

بارہ رجب ۳۵ھ کو پہلا وہ دن تھا جب آپ کوفہ میں تشریف لائے۔ لوگوں نے کہا کہ قہر میں قیام فرمائیے جہاں اب تک حاکم قیام کیا کرتے تھے۔ آپ نے اسے ناپسند کیا اور مقام رجبہ کے ایک مکان میں سکونت اختیار فرما لیا۔

اس کے بعد زیادہ تر اہل کوفہ ہی تھے جنہوں نے آپ کے ساتھ صفین اور نہر دان میں بھی مخالفین کا مقابلہ کیا۔ اسی لیے وہ "شیعہ علی" کہلائے۔ حالانکہ مذہبی طور پر ان میں سے اکثر اس معنی میں شیعہ نہ تھے کہ وہ حضرت علیؓ بن ابی طالب کو خلیفہ بلا فصل جانتے ہوں اور آپ کے قبل دوسرے خلفاء کو تسلیم نہ کرتے ہوں۔ مگر "شیعہ بنی امیہ" کے مقابلہ میں وہ اپنے "شیعہ علی" کہنا فرماتے تھے۔

یہ وہ وقت تھا کہ کوفہ ایسے شیعان اہل بیت سے چھلک رہا تھا لیکن ادھر معاویہ کا ممالک اسلامیہ پر تسلط ہوا اور کوفہ پر زیادہ بن امیہ کی حکومت ہوئی اور اہل کوفہ پر مظالم کے پہاڑ ٹوٹ پڑے اور عراق کی زمین ان کے لیے تنگ ہو گئی۔ جو لوگ محب علیؓ سمجھے جاسکتے تھے ان کا نفس آئندہ آنے والے خطرات کی پیشین گوئی کرتا اور ہر دقیقہ و ثانیہ اپنے آہستہ آہستہ ہونے کا پیغام دیتا تھا۔

یہ صورت حال دو ایک ماہ، دو ایک سال نہیں بلکہ بیس سال تک قائم رہی۔ اہل صورت میں ناممکن تھا کہ کوفہ کے اندر شیعہ علیؓ کے لیے کوئی نمایاں حیثیت حاصل رہتی بلکہ مارے جانے، سولی پانے اور جلا وطن ہونے کے بعد جو بچے کچھے توڑے سے اشخاص موجود تھے وہ گوشوں

۱۵ھ طبری ج ۴ ص ۱۹۱

لہو و لعب میں سرگرمی، احکام شرعیہ سے آزادی اور نفسانی خواہشوں کی پرستاری ایسی نہ تھی جو مخفی حیثیت رکھتی ہو۔

جاننے والوں کو یاد آگیا اور انجام کا نقشہ آنکھوں میں پھرنے لگا اور نہ جاننے والوں کو پوچھ گچھ میں معلوم ہو گیا کہ ہمارا ہونے والا خلیفہ و مالک سلطنت ان صفات و عادات کا شخص ہے۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ بلا تخصیص فرقہ و مذہب ایک عام بے صغی، اضطراب اور نفرت و بیزاری خلی خدائیں پھیل گئی اور اسی کے ساتھ آنکھیں گردش کرنے لگیں کہ کون ہے جو اس سخت وقت پر کام آئے اور وقت کی ذمہ داریوں کو اپنے کاندھے پر اٹھا کر ملت اسلامیہ کو اس بدکردار خلیفہ سے چھٹکارا دلانے۔

اسی کے ساتھ یہ خبریں بھی شہر ہوئیں کہ حسین بن علیؑ نے یزید کی خلافت تسلیم کرنے سے انکار کر دیا ہے۔ اور وہ اسی لیے مدینہ سے ہجرت کر کے مکہ معظمہ آ گئے ہیں اور یہ طے کر لیا ہے کہ جو کچھ بھی ہو یزید کی بیعت نہ کریں گے۔ اس وقت دوستان علیؑ کی اس قلیل جماعت کو بوسیس برس کی طویل مدت تک طرح طرح کے صبر آزما مصائب برداشت کرتے کرتے عاجز آچکی تھی اور ہر آن حضرت احدیت کی جانب سے کشائش کی منتظر تھی اپنی مایوسیوں کی مدت سے چھائی ہوئی تاریک گھاٹی میں امید کی شعاعیں نظر آنے لگیں اور ان کے ضمیر نے آواز دی کہ اس موقع سے بہتر کوئی موقع نہ ملے گا اور اس وقت کا سکوت خود کشی کا مرادف ہوگا۔

یہ سوچ کر وہ سب سلیمان بن مرد صحابی رسولؐ کے گھر میں مجتمع ہوئے۔ بن ربیعہ اور تجربہ کار سلیمان نے بوسیعہ خدا کی آنکھیں دیکھ کر ہوئے اور حضرت علیؑ بن ابی طالبؑ کے ساتھ معرکے جھیلے ہوئے تھے جمع کو ان الفاظ سے مخاطب کیا:-

”آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ معاویہ کا انتقال ہوا اور امام حسینؑ نے یزید کی بیعت سے انکار کیا ہے۔ اور وہ کہہ رہے ہیں کہ آپ لوگ ان کے اور

کے اندر اور پردوں کے پیچھے زندگی بسر کرنے پر مجبور تھے اور دوستی اہل بیتؑ کا نام بھی زبان پر لانا ان کے استحقاق قتل کی دستاویز خیال کیا جاتا تھا اور اس شکنجہ کے اندر شیعیت ایک مخصوص قلیل القعداد جماعت میں مخفی حیثیت سے مقید تھی اور وہ جماعت عراق و حجاز وغیرہ کے مختلف شہروں میں گمنامی کی زندگی بسر کر رہی تھی۔ رؤسائے عشائر اور شیوخ قبائل ذمہ دار و باعتبار اشخاص سب حکومت و قوت کے ساختہ و پر داختم تھے۔ رہ گئی عام خلقت جس پر انقلابات کا دار و مدار ہوتا ہے وہ بلا استثنا ہر ملک میں ہر کے سکے زند خطبہ نائش خواندہ کے مطابق ہوا کے رخ پراڑنے والی اور زمانہ کے غیر معمولی حوادث سے تیزی کے ساتھ رنگ بدلنے والی ہوا کرتی ہے۔ ان میں ایک ایسا اچانک واقعہ جس میں جوش پیدا کرنے کی صلاحیت ہو وہ انقلاب پیدا کر سکتا ہے جو برسوں کی دعوت و تبلیغ پیدا نہیں کرتی۔ اس کے نئے حکومتوں کے تغیر و تبدل اور باطن کے عزل و نصب کی صورت میں ہمیشہ نظر سے گزرتے رہتے ہیں اور وہ اکثر اسی قسم کی ناگہانی صورتوں کا نتیجہ ہوتے ہیں۔

بے شک میں سال تک صورت حال ایک طرح رہنے کا سبب یہ تھا کہ اس مدت میں کوئی تازہ حادثہ رونما نہیں ہوا جو رجحانات طبعی سے ٹکرا کر ان کو سیلاب کی طرح کئی خاص طرف متوجہ کر سکے۔

شعبہ کے رجب کا مہینہ تھا جب معاویہ نے انتقال کیا اور ان کا نامزد کردہ جانشین انکا بیٹا یزید ہوا۔ ایسے ہی مواقع وہ ہوتے ہیں جو پورے کون فضا میں تموج اور مطمئن سطح میں تلاطم پیدا کر دیتے ہیں۔ فطرتاً ہر شخص سابق فرمانروا کے بعد اپنے جدید دینی سلطنت اور قسمت کے مالک کی سابقہ زندگی اور اس کے اخلاق و عادات اور ذاتی خصوصیات کے متعلق معلومات حاصل کرنے میں لذت محسوس کرتا ہے اور بیک وقت مختلف حلقوں میں یہی چرچے شروع ہو جاتے ہیں۔

یزید کے اخلاق و عادات اسکی مے نوشی اور شہوت رانی، اس کی طفلانہ جوانی اور

ناگہانی انقلابات کا کہاں تک مقابلہ کر سکے گا؟ اس کا فیصلہ مستقبل ہی کے ہاتھ ہے۔
 سلیمان بن صدق کی حجت تمام ہو چکی تھی چنانچہ خط امام حسینؑ کے نام بایں عنوان لکھا گیا:-
 ”یہ خط ہے حسین بن علیؑ کی طرف سلیمان بن صدق، مسیب بن نجید، رفاعہ بن شداد، حبیب
 بن مظاہر اور دیگر دوستوں کی طرف سے مرہنیں و مسلمین اہل کوفہ میں سے“ اس کے بعد معاویہ
 کے انتقال اور نیرید کی وسیع مدی پر اپنے خیالات کا اظہار کیا گیا تھا۔ پھر لکھا تھا کہ ہمارے سر پر
 کوئی امام نہیں ہے۔ لہذا آپ تشریف لائیے۔ شاید آپ کی وجہ سے ہم حق کی نصرت پر یک دل
 ہو سکیں۔ اور دمشق کا گورنر نعمان بن بشیر دارالامارہ میں موجود ہے مگر ہم اس کے ساتھ نماز جمعہ
 میں شریک نہیں ہوتے۔ نہ عید گاہ جاتے ہیں۔ اگر ہم کو خبر معلوم ہو جائے گی کہ آپ تشریف لائے
 ہیں تو ہم اس کو یہاں سے نکال کر شام جانے پر مجبور کر دیں گے۔ والسلام
 اس خط کو عبد اللہ بن سبیح مہدانی اور عبد اللہ بن دال کے ہاتھ روانہ کیا گیا اور یہ سب سے
 پہلا خط تھا جو امام حسینؑ کو مکہ معظمہ میں دسویں ماہ رمضان کو ملا۔ جمعیت منتشر ہوئی اور اب
 ان میں سے ہر ایک نے اپنے حلقہ اثر میں اس تحریک کو پھیلا نا شروع کیا اور دہی دن کے
 عرصہ میں ۵۲ عرصہ اشتیاق تیار ہو گئیں جو ایک دو تین چار آدمیوں کے دستخط سے تھیں اور یہ
 سب خطوط قیس بن مسهر صیداوی اور عبد الرحمن بن عبد اللہ بن لکنن الرجبی اور عمارہ بن عبید
 سلوی کے ہاتھ روانہ کیے گئے۔ اسی اضطراب اور روحانی تلاطم کے سبب سے جو یزید کی
 خلافت کے باعث عام طور پر پیدا ہوا تھا اور جس میں کسی مذہب و مسلک کا افتراق نہ تھا۔
 ان حضرات کی مذکورہ بالا تجویز کا ہر طرف سے خیر مقدم کیا گیا اور وہ لوگ جو شیعیت کا جذبہ
 بند رکھتے تھے وہ بھی خاص حضرت امام حسینؑ کے ساتھ کسی عقیدت کی وجہ سے نہیں بلکہ اس
 خیال سے کہ یزید ایسے شرابخوار و فاسق سے آپ یقیناً بہتر ہیں۔ اس تجویز کے گرجوئی سے موید
 نظر آنے لگے جس کو دیکھ کر ان افراد کو جو حقیقتاً اس تجویز کے محرک تھے یقین پیدا ہو گیا

۱۹۶۶ء ج ۲ طبری ۱۹۶۶ء ارشاد ۲۰۹ء ۱۹۶۶ء ج ۲ طبری ۱۹۶۶ء

ان کے پدر بزرگوار کے شیعہ ہیں۔ اگر آپ اس بات کا یقین رکھتے ہیں کہ ان کی نصرت و مدد
 میں اور ان کے دشمنوں سے جنگ میں کوتاہی نہ ہوگی تو بسم اللہ ان کو خط لکھیے اور اگر
 سستی و کمزوری کا اندیشہ ہو تو برابر خدا ایک شخص کو فریب دے کر اس کی جان کو خطرہ
 میں نہ ڈالیے۔

الفاظ سے ظاہر ہے کہ سلیمان ایک مقرر کی طرح گرجتے برستے الفاظ سے وقتی جوش و
 ابھار کر اپنے مقصد کو حاصل کرنا نہیں چاہ رہے ہیں بلکہ وہ خود مجمع سے اس کے موجودہ
 جوش و ولولہ کی آخری تھام اور موقع اقدام پر اس کی انتہائی کارفرمائی کا جائزہ لوانا اور
 اسی کے ساتھ ان کو موقع کی نزاکت اور آئندہ کے خطرات کا اندازہ کر دینا چاہتے ہیں
 مگر یہ امر فطری ہے کہ جذبات کی طغیانی میں انسان کو اپنی طاقت کا اندازہ مشکل سے ہوتا
 ہے اور وہ اکثر عواقب کی فکر اور سخت مواقع پر اپنے ثبات و استقلال کی تشخیص میں
 غلطی کر جاتا ہے۔ مجمع کے اندر ان کے بڑھتے ہوئے جوش میں سلیمان کے الفاظ نے وہ
 کام کیا جو پانی کا چھینٹا بھڑکتے ہوئے آگ کے شعلوں میں۔ ایک مرتبہ سب بول اٹھے
 نہیں انہیں ہم یقیناً ان کے دشمنوں سے جنگ کرینگے اور اپنے کو حضرت کے قدموں پر نثار کر دیں گے
 یہ جمعیت کتنی تھی؟ اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ وہ کسی میدان یا عالی شان قصر
 کے وسیع صحن میں نہیں بلکہ عربی ساخت کے مختصر مکانات میں سے جن کے نمونے آج تک
 عربستان میں نظر آتے ہیں ایک مکان یعنی سلیمان بن صدق کے گھر میں مجتمع ہو گئی تھی۔ پھر
 ان میں بھی یقین نہیں کیا جاسکتا کہ وہ سب سچے اور راسخ العقیدہ حضرت علیؑ کو دیکھ کر
 اور امام برحق سمجھنے والے شیعہ ہی تھے۔

مذکورہ بالا سوال و جواب کے الفاظ میں بے شک سچائی کا جو ہر نظر آ رہا ہے اور وہ یقیناً
 لوہے والوں کے باطنی ضمائر کی مخلصانہ ترجمانی کر رہے ہیں لیکن ان میں سے ہر شخص ان لوہے

۱۹۶۶ء ج ۲ طبری ۱۹۶۶ء ارشاد ۲۰۹ء ۱۹۶۶ء ج ۲ طبری ۱۹۶۶ء

دوسری طرف مکتوب الیہ کے مذاق طبیعت سے اجنبیت اور ناشائسی کی دلیل ہے چنانچہ اس آخری خط کے لکھنے والے تقریباً سب کے سب واقف کر بلا میں حضرت امام حسینؑ سے لڑنے کے لیے موجود تھے۔ ممکن ہے کہ اس خط کے لکھنے میں کوئی خاص سازش مضمر ہو اور اگر ایسا نہیں تو اس سے اس موقع کی رائے عامہ کا اندازہ ہوتا ہے کہ ان لوگوں کو بھی یہ ضرورت پڑ گئی تھی کہ ہم بھی اس تحریک میں شامل ہو کر آئندہ کے لیے اپنے مستقبل کو محفوظ بنالیں۔ دنیوی کا بیان ہے کہ یہ سب فاسد اور ان کے ساتھ کے خطوط تا بڑ توں دودن کے اندر امام حسینؑ کو پہنچے اور اس کے بعد چند دن میں تو خطوط کی تعداد اتنی ہو گئی کہ ان سے دو خراجیاں بھر گئیں۔

گزشتہ تقریر سلیمان بن مرہ کی اور اس کے بعد کے واقعات ان سب کے مطالعہ سے حسب ذیل نتائج صاف طور پر برآمد ہوتے ہیں۔

۱۔ امام حسینؑ کی بعیت یزید سے کنارہ کشی اور مدینہ سے روانگی کسی خارجی تحریک اور اہل کوفہ کے ساتھ کسی متقدمہ گفت و شنید کا نتیجہ نہ تھی۔

۲۔ حضرت کو مدینہ سے روانگی کے موقع پر ظاہری اسباب کی بنا پر یہ خیال بھی نہ تھا کہ آپ کوفہ تشریف لے جائیں گے۔

۳۔ آپ نے مکہ پہنچنے کے بعد بھی خود اپنی جانب سے کسی قسم کی تحریک اہل کوفہ سے نہیں کی اور نہ دلمان اپنے مقاصد کی تبلیغ کے لیے کوئی خط بھیجا۔

مگر اب جبکہ کوفہ سے خود یہ آوازیں بلند ہیں کہ آپ ہمارے یہاں آئیے۔ ہم آپ کی نصرت و لڑاکے لیے تیار ہیں۔ ہم آپ کو امام جانتے ہیں اور آپ سے ہدایت کے طالب ہیں۔ یہ دو ایک آوازیں نہیں بلکہ کوفہ بھر ہی چلا رہا ہے۔ چاہے وہ دوست ہوں یا دشمن۔

یہاں تک کہ دو خراجیاں خطوط سے بھر گئیں جس کا ذکر پہلے ہو چکا ہے۔ اب موقع کی حالت کا تقاضا کیا ہے؟ حضرت امام حسینؑ کو ان خطوط کے بعد کیا کرنا چاہیے؟

کرائے عامہ ہمارے ساتھ ہے لیکن یہ ذریعہ نظر تھا۔ عام خلقت اس تحریک سے ہمدردی میں لپی ہی تھی جیسے آندھی کے رخ پر اڑتے ہوئے پرند۔ اس غلط فہمی کا یہ نتیجہ ہوا کہ یا تو پہلے خط کے یہ الفاظ کہ شاید خدا آپ کے ذریعہ سے ہماری شیرازہ بندی کرے، ہم درجہ کا اظہار کرتے تھے۔ یا اب دہوی روز کے بعد جو خط لکھا گیا اس میں پُر زور الفاظ صرف کیے جانے لگے کہ تشریف لائیے جلد اس لیے کہ لوگ آپ کے منتظر ہیں اور آپ کے سوا کسی کی امامت تسلیم کرنے پر آمادہ نہیں ہیں لہذا جلدی کیجیے جلدی، والسلام، اس خط کو مانی بن مانی سبھی اور سعید بن عبد اللہ جعفری کے ذریعہ روانہ کیا گیا۔

رائے عامہ کی قوت اور ہوا کے موجودہ رخ کا اس سے اندازہ ہو جاتا ہے کہ وہ سرداران قبائل جو یزید کے خاص آدمی تھے اور جنہیں اس تحریک کے محرکین نے اپنے ساتھ نہیں لیا تھا انھوں نے بھی سیاست کا تقاضا ہی سمجھا کہ اس آواز میں آواز ملا دیں چنانچہ ان اجتماعی کاروائیوں سے علیحدہ اور اس خط کے بعد جو اپنے مضمون کے اعتبار سے بالکل آخری کہا جاسکتا ہے۔ ایک خط کوفہ سے اور لکھا گیا جس کے الفاظ یہ تھے:-

”کمیتاں لہلہا رہی ہیں، میوے درختوں میں رسیدہ ہیں اور تالاب لبریز۔ پس جب آپ چاہیں تشریف لائیں۔ ایک ایسے شکر کی جانب جو آپ کی امداد کے لیے بالکل آراستہ موجود ہے۔ والسلام“

اس پر مندرجہ ذیل سات آدمیوں کے دستخط تھے۔ شیبث بن ربعی، حجار بن ابجر، یزید بن حارث، یزید بن روم، عزہ بن قیس، عمرو بن الحجاج زبیدی، محمد بن عمیرہ تمیمی۔ یہ خط اب و لمجر کے اعتبار سے گزشتہ خطوط سے بالکل مختلف تھا۔ ان میں اپنی دوستی و اخلاص کے اظہارات تھے اور ہدایت کی خواہش تھی۔ یہاں مادی طاقت کی پیشکش اور منافع دنیا کی نمائش تھی جو ایک طرف لکھنے والوں کی مادی ذہنیت کی ترجمان اور

سے اتنے اصرار و تاکید کے ساتھ آپ کو دعوت کی جارہی تھی اور آپ کی نصرت کا وعدہ کیا جا رہا تھا آپ اس دعوت کو ٹھکرا کر مکہ میں قیام کرتے اور شہید کیے جانے تو یہی لوگ جو آپ پر اب اعتراض کرتے ہیں کہ آپ کو ذہ کیوں گئے؟ یہی بنے اٹھ کھڑے ہوئے کہ یہ کون سی عقل مندی تھی کہ ایک اتنے بڑے خطہ کی دعوت اور وعدہ نصرت کو رد کر دیا جہاں کے لوگ آپ کے والد بزرگوار کی بھی نصرت کر چکے تھے اور خود آپ کی بھی محبت کا دم بھرتے تھے۔

اس وقت بجان و دل آپ کی حمایت کا وعدہ کر رہے تھے اور سینکڑوں عرضداشتیں بھیج کر آپ سے قیادت و ہدایت کے طالب تھے۔ نادر موقع کو ہاتھ سے دیکر مکہ میں قیام رکھا جہاں کی زمین بے آب و گیاہ، جہاں کے رہنے والے پت حوصلہ و بے انگ اور جہاں کی فضا بے ہوا و فضا، یہاں تک کہ خود بھی قتل ہوئے اور مکہ ظلمہ کی حرمت کو بھی برباد کر دیا۔ ان سورتوں میں ظاہر ہے کہ عقل و تدبیر کا اقتضا یہی تھا کہ ان بلانے والوں کی آواز پر لبیک کہی جائے۔ ان کی نصرت کے وعدوں کو آزمایا جائے اور اگر وہ سچے نہ بھی ثابت ہوں تب بھی ان پر ایمان نہ کیا جائے۔ بے شک تھے ایسے لوگ جو آپ کو عراق جانے سے منع کرتے تھے اور ان کا خیال تھا کہ عراق

والوں کے وعدہ کا کوئی اعتبار نہیں مگر وہ اس بلو کو نظر انداز کیے ہوئے تھے کہ مکہ معظمہ میں آپ کا قیام آپ کو قتل سے بچا نہ سکتا تھا بلکہ حق تعالیٰ اگر موازنہ کیا جاتا تو موجودہ حالات کے لحاظ سے مکہ میں قیام کی صورت میں آپ کا قتل کیا جانا یقینی اور کو ذ کی روانگی کی صورت میں شکوک تھا اس لیے کہ ظاہری اسباب و علل کے ماتحت، اہل کوفہ کے مواعید کے غلط ہونے کا کوئی ثبوت نہیں تھا بلکہ یہ خیال صرف ان کی ذاتی افتاد سے کے متعلق ایک غیر متیقن حکم بلکہ بدگمانی کی حیثیت رکھتا تھا۔ اس صورت میں اگر آپ مابین شہید ہو جاتے تو دنیا کے اندر آپ کی شہادت سے کوئی ہمدردی کا جذبہ پیدا نہ ہوتا لیکن اب جبکہ اہل کوفہ کی ان تمام خواہشوں پر لبیک کہنے پہنچے تو انسانی کے اتنے افراد کی درخواستوں کو منظور کرتے ہوئے روانہ ہو رہے ہیں تو اب اگر آپ شہید بھی ہو گئے تو ایک بڑے انسانی ذہن کو ادا کرتے ہوئے اور اخلاق و مردت کی

صورت حال یہ ہے کہ آپ یزید سے بیعت جیسا کہ اب تک نہیں کی آئندہ بھی کرنا نہیں چاہیے۔ مدینہ میں قیام یزید کے اس تہدید کی حکم کی بنا پر کہ آپ سے بیعت کی جائے یا قتل کر دیے جائیں، ناممکن ہو چکا ہے۔ مکہ معظمہ میں قیام وقتی حیثیت سے امن کا ذریعہ سہی لیکن ناجائز ہے جبکہ یزید کے اخلاق و عادات اور احکام مذہبی کے مقابلہ میں خود سری سے یہ توقع بعید تھی کہ وہ مکہ معظمہ کے مذہبی احترام کا لحاظ کرے گا بلکہ یہ خطرہ بہت قریب تھا کہ مکہ میں آپ کا قیام اس کا باعث ہوگا کہ وہیں مکہ میں آپ کے خلاف فوج کشی ہو اور مکہ میں نہ تو کوئی فوجی طاقت ایسی ہے جو آپ کی حفاظت کر سکے اور نہ آپ مکہ میں قیام کر کے حرم خدا کے اندر خونریزی ہونے کے خود باعث بننا چاہتے ہیں۔

اس کے علاوہ باد ہود کی رسول کے نواسے کی مہاجرت مدینہ سے مشہور ہو چکی ہے مگر طاقت ہو یا یمن، بصرہ ہو یا تیار کہیں سے کوئی آواز ایسی بلند نہیں ہوتی کہ ہم آپ کی مدد کے لیے حاضر ہیں اور آپ کی حفاظت کے لیے آمادہ۔

ایسے سخت اور نازک موقع پر عرب کے آباد ترین خطہ ملک (عراق) اور اس کے بھی اہم مرکز (کوفہ) سے یہ تحریک ہوتی ہے کہ آپ یہاں تشریف لائیں، ہم آپ کی حفاظت و حمایت کے لیے ہر طرح تیار ہیں اور صرف معمولی سی تحریک نہیں بلکہ بچپن عرضداشتیں اور دوزخ میں بھر کے خطوط اور سات قاصد کیے بعد دیگرے روانہ کیے جاتے ہیں اور لکھنے والوں میں بہت سے ایسے اشخاص بھی ہیں جن کی محبت پر آپ کو بھر دیا ہے۔ جیسے حبیب بن مظاہر، سلیمان بن مردث، بن شداد وغیرہ۔ ان حالات میں ظاہر ہے کہ امام حسین کو کیا کرنا چاہیے تھا۔ کیا آپ کے لیے مناسب تھا کہ اس دعوت کو مسترد کر دیتے؟

حقیقت یہ ہے کہ مکہ معظمہ کے قیام کی صورت میں بھی حضرت کا شہید ہونا یقینی تھا یعنی جیسے عبداللہ بن زبیر راسی مکہ میں فوج کشی ہوئی اور وہیں قتل کیے گئے، اسی طرح آپ پر بھی فوج کشی ہوتی اور یہیں محصور ہو کر آپ کو شہید ہونا پڑتا۔ اس صورت میں جبکہ اہل کوفہ کی جانب

ایک اعلیٰ مثال قائم کرتے ہوئے اور کوفہ کے لوگوں پر محبت بھی تمام فرماتے ہوئے اور حفاظت خود اختیاری کے اصول پر مجدداً مکان عمل کرتے ہوئے اور پھر اپنے کو مکہ سے علیحدہ کر کے مکہ کے احترام کو بھی پورے طور سے محفوظ کرتے ہوئے۔

اسی لیے امام نے ان لوگوں کے جواب میں جو آپ کو عراق جہلے سے منع کرتے تھے جیسے عبداللہ بن عباس وغیرہ کبھی یہ نہیں فرمایا کہ مجھے عراق کے لوگوں پر اطمینان ہے اور اگر میں وہاں جہاؤں گا تو ضرور وہ میری نصرت کریں گے، ہرگز نہیں بلکہ آپ نے زیادہ تر اہل عراق کے متعلق ان کی بے اطمینانی اور عدم اعتماد کے بارے میں اپنی رائے کو محفوظ رکھتے ہوئے اپنے ارادہ پر بہم و محمل طور پر قائم رہنے کا اظہار فرمایا جیسا کہ ابن عباس سے گفتگو کے موقع پر اور کبھی صاف کہہ دیا کہ میں یہاں رہوں گا تو بھی قتل ہوں گا اور خانہ کعبہ کا احترام میرے سبب سے زائل ہوگا جیسا کہ ایک مرتبہ عبداللہ بن زبیر سے فرمایا۔ مجھے معلوم ہے کہ یہاں ایک شخص منیڈ سے کی طرح ذبح ہوگا جس سے یہاں کی حرمت زائل ہوگی۔ میں وہ منیڈ ہا بننا نہیں چاہتا۔ دوسرے موقع پر جب ابن زبیر نے آپ سے چپکے چپکے کان میں کچھ کہا تو ابن زبیر کے جانے کے بعد اپنے کچھ خصوصین سے فرمایا۔ جانتے ہو ابن زبیر نے کیا کہا؟ ابن زبیر نے کہا کہ آپ مکہ میں قیام فرمائیے اور باہر نہ جائیے۔ اس کے بعد آپ نے فرمایا۔ خدا کی قسم میں ایک بالشت بھر مکہ کے حدود سے باہر قتل کیا جاؤں، مجھے زیادہ پسند ہے اس سے کہ ایک بالشت بھر مکہ کے حدود کے اندر مارا جاؤں۔ اور قسم خدا کی اگر میں کسی جانور کے سوراخ میں جا کر رہوں تب بھی یہ لوگ مجھ کو وہاں سے باہر لے آئیں گے، یہاں تک کہ جیسا چاہتے ہیں میرے ساتھ سلوک کریں۔ خدا کی قسم مجھ پر یہ لوگ تعدی کریں گے جیسے یہود نے روزِ شنبہ کے بارے میں ظلم و تعدی سے کام لیا۔

ان حالات میں ظاہری اسباب کی بنا پر آپ کے لیے کوفہ کی طرف تشریف لے جانا ناگزیر

لے الاخبار الطوال ۲۲۳ ص ۲۱ طبری ج ۶ ص ۲۱

تھا اور آپ کے لیے اہل کوفہ کی درخواست کو مسترد کرنا مناسب نہ تھا۔ پھر بھی آپ نے محبت ظاہر اسباب احتیاطی تدبیر یہ اختیار فرمائی کہ اپنے چچا زاد بھائی مسلم بن عقیل کو جو مدینہ سے آپ کے ساتھ آئے تھے اپنا نمائندہ بنا کر حالات کا مشاہدہ کرنے کے لیے کوفہ جانے پر مامور فرمایا۔ اور اس کے لیے آپ نے ایک خط اہل کوفہ کے نام لکھ کر بانی بن بانی اور سعید بن عبداللہ کے سپرد کیا جو اہل کوفہ کے آخری قاصد تھے اور انھیں حکم دیا کہ وہ جنابِ مسلم کے آگے روانہ ہوں۔

اس خط کا مطلب یہ تھا کہ اتنی اور سعید تمھارے خطوط لے کر پہنچے اور یہ دونوں شخص تمھارے سب سے آخری قاصد ہیں جو میرے پاس آئے ہیں۔ جو کچھ تم نے لکھا ہے میں نے غور سے پڑھا اور سمجھا۔ تم میں سے اکثر کا قتل یہ ہے کہ ہمارے سر پر کوئی امام نہیں۔ آپ آئیے۔ شاید خدا ہم کو آپ کی بدولت حق پر مجتمع کر دے۔ اچھا تو میں تمھاری جانب اپنے بھائی، چچا کے بیٹے اور مخصوص معتد کو روانہ کرتا ہوں اور انھیں حکم دیتا ہوں کہ وہ مجھ کو تمھارے حالات کے متعلق اطلاع دیں۔ اگر انھوں نے اطلاع دی کہ تمھاری جماعت اور اہل محل وعدہ اس امر پر جسے تم نے اپنے خطوط میں ظاہر کیا ہے متفق ہیں تو میں عنقریب تمھاری طرف آتا ہوں اور واضح رہے کہ امام کے معنی نہیں سوا اس کے جو کتاب الہی پر عامل عدالت کا پابند، حق کا متبع اور اپنی ذات کو حسد کی مرضی پر وقت کیے ہوئے ہو۔ والسلام۔

اس خط کی عبارت سے ظاہر ہے کہ مسلم بن عقیل کو جنگ پر مامور نہیں کیا گیا تھا اور نہ وہ کوفہ کی تسخیر کی غرض سے بھیجے گئے تھے بلکہ وہ صرف ایک نمائندہ کی حیثیت رکھتے تھے کہ کوفہ کی رائے عامہ اور وہاں کے لوگوں کے حالات و خیالات کا حضرت امام حسینؑ کے متعلق اندازہ کر کے آپ کو اس کی اطلاع دیں۔ جنابِ مسلم، قیس بن مسرہ صیداوی اور عبد الرحمن بن عبداللہ بن کدن الریحی اہل کوفہ کے نام بردوں کے ساتھ حکم امام کی تعمیل میں کہ سے روانہ

لے الاخبار الطوال ۱۳۲ ص ۲۱ طبری ج ۶ ص ۱۹۸ - ۱۹۷ ص ۲۱ طبری ج ۶ ص ۲۱

تو ایک کے روح رواں اور اس جماعت میں سب سے زیادہ صاحبِ دجاہت اور ذی اثر تھے۔ مجبوراً مسلم نے مختار بن ابی عبیدہ ثقفی کے گھر میں قیام کیا۔

کوفہ میں یہ خبر تیزی کے ساتھ پھیل گئی اور لوگ بوق در بوق آپ کے پاس ملاقات کے لیے پہنچنے لگے۔ جب کافی جمع ہو گیا تو مسلم نے امام حسینؑ کا خدا جو اس جماعت کے نام تھا پڑھ کر سنایا جس کو سنکر حاضرین میں کافی جوش کے آثار نمودار ہوئے۔ عائش بن ابی شیبہ شاکری نے کھڑے ہو کر حمد و ثنائے الہی کے بعد اپنے ذاتی خیال کو ظاہر کرتے ہوئے کہا: ”مجھ کو عام لوگوں کے متعلق کسی اظہار رائے کا حق نہیں ہے اور نہ مجھے یہ معلوم ہے کہ ان کے دلوں میں کیا ہے اور میں ان کی طرف سے وکالت کر کے آپ کو دھوکے میں بہستا نہیں کرنا چاہتا مگر میں وہ ظاہر کرتا ہوں جسے میں نے اپنے دل میں ٹھان لیا ہے۔ خدا کی قسم جس دلت بھی آپ دعوت دیں گے لبیک کہتا ہوں حاضر ہوں گا اور آپ کے ہمراہ دشمنوں سے جنگ کریں گا اور اس وقت تک شمشیر زنی کر دوں گا کہ اس زندگی کو ختم کر کے اپنے خدا سے ملاقات کر دوں اور میرا مقصد اس سے سوار ضائع ہونا نہ ہوگا۔“

یہ تقریر ختم ہونا تھی کہ حبیب بن مظاہر کھڑے ہوئے اور کہنے لگے: ”مرحبا ہذاک اللہ تعالیٰ ختم لفظوں میں تم نے حقیقتِ حال کو واضح کیا ہے۔“ پھر سلم کی طرف خطاب کر کے کہا: ”خدا کی قسم میرا بھی ذاتی حیثیت سے یہی خیال ہے جس کو عائش بن ابی شیبہ نے اپنے لفظوں میں ظاہر کیا۔ اسی سے ملتی جلتی لفظوں میں سعید بن عبداللہ حنفی نے تائید کی جس کے بعد مجمع متفرق ہوا۔ خطہ کے مضمون کی بناء پر اس کا رائے ذاتی کا مقصد ظاہر ہے۔ یعنی یہ

الاخبار الطوال ۲۳۲ ج ۶ طبری ۱۹۵۵ء ج ۵۵۵، ارشاد ۲۱۱۔ اس گھر کے نشانات غالباً چوتھی

سہری ملک باقی تھے چنانچہ ابوحنیفہ دینوری نے لکھا ہے کہ یہ گھر ”دار مسیب“ کے نام سے مشہور ہے (طبری ج ۶) ۱۹۵۵ء ج ۲۳۲، طبری نے لکھا ہے ”دار مسلم بن مسیب“ کے نام سے مشہور ہے (طبری ج ۶) ۱۹۵۵ء ج ۲۳۲، طبری نے لکھا ہے ”دار مسلم بن مسیب“ درج ہے (طبری ج ۵) ۱۹۵۵ء ج ۶

ہوئے اور پہلے مدینہ رسول گئے۔ وہاں مسجدِ نبویہ میں نماز پڑھی۔ پھر عزیز و اقارب کے رخصت ہوئے اور قبیلہ ثقیف میں سے دو عربوں کو جو راستے سے واقف تھے اپنے ساتھ لے کر کوفہ کی طرف روانہ ہوئے۔ عجیب اتفاق ہے کہ دونوں راستے کے ماہر ہوتے ہوئے جب آپ کو لے کر چلے تو ایک دم راستا بھول گئے، نتیجہ یہ ہوا کہ ریگستان میں پڑ گئے۔ پائیں کا غلبہ ہوا اور اسی عالم میں ایک ایسے مقام پر پہنچ کر جہاں سے دور مسافروں کے چلنے کی شرک نظر آ رہی تھی وہ دونوں بالکل بے حال ہو گئے۔ انھوں نے ہاتھ سے اشارہ کر کے شرک کا پتہ دیا اور پھر ان میں سے ایک نے دونوں کو گرا کر ہلاک ہو گئے۔ جناب مسلم اور ان کے ساتھیوں کی حالت بھی بہت تباہ ہو چکی تھی۔ مگر یہ ان کی غیر معمولی قوتِ برداشت تھی کہ انھوں نے کسی بھی طرح اپنے کو شاہراہ تک پہنچا دیا اور طبعی خجبت (وادی) کے ایک چشمہ پر جس کا نام حنیق تھا قیام کر کے وہاں سے امام حسینؑ کی خدمت میں خط بھیجا جس میں آغاز سفر کے اس حادثہ پر اپنے غیر معمولی تاثرات کا اظہار کرتے ہوئے لکھا تھا کہ میرا دل کوفہ کے سفر کے لیے کسی طرح آمادہ نہیں ہے مگر دوبارہ امام کے تاکید کی حکم نے مجبور کر دیا اور وہ کوفہ کی طرف روانہ ہوئے۔ کوفہ پہنچ کر حکمِ امام کے مطابق جناب مسلم نے امن پسندی سے کام لیا۔ حاکم دارالامارہ میں ہو کر تھا مگر مستم نے اس سے کوئی تعرض نہ کیا۔ اگر کوئی دوسرا شخص ہوتا جسے شورشِ انگیزی منظور ہوتو اس کا پہلا کام یہ ہوتا کہ دارالامارہ پر قبضہ کرے مگر مسلم نے اپنے عمل سے ظاہر کر دیا کہ وہ ہیں تمھاری سلطنت سے مطلب ہیں، تمھاری حکومت سے کوئی غرض نہیں۔ یہیں تو صورتِ طالبانِ ہدایت کی تلاش اور ان کی مذہبی و اخلاقی اصلاح مد نظر ہے۔

مسلم کے ورود کوفہ کے متعلق حالات سے اندازہ ہوتا ہے کہ سلیمان بن مردخراسانی اس وقت کوفہ میں موجود نہ تھے ورنہ مسلم ان ہی کے مکان پر قیام کرتے اس لیے کہ وہ ان

۱۹۵۵ء ج ۶ طبری ۱۹۵۵ء ج ۲۳۲، طبری نے لکھا ہے ”دار مسلم بن مسیب“ کے نام سے مشہور ہے (طبری ج ۶) ۱۹۵۵ء ج ۲۳۲، طبری نے لکھا ہے ”دار مسلم بن مسیب“ درج ہے (طبری ج ۵) ۱۹۵۵ء ج ۶

اس کے بعد تھوڑے سے چھپے چھپائے افراد باقی ہو سکتے ہیں۔ ورنہ جتنے تھے وہ وہی افراد تھے جو حضرت علیؓ بن ابی طالبؓ کو چوتھا خلیفہ تسلیم کر کے محض ساتھ ہونے کی وجہ سے لغوی معنی کے اعتبار سے شیعہ کہلاتے تھے اور وہ بھی اب زیادہ تعداد میں باقی نہیں تھے۔ اس صورت میں یہ ماننا ناگزیر ہے کہ مذکورہ بالا سطحی اور عارضی اسباب سے جو رائے عامہ پھوٹا ہوئی ہو اس میں کوئی دزن نہیں ہو سکتا۔ بے شک جب اس تحریک کے ابتدائی محرکین کو رائے عامہ کی نوعیت سمجھنے میں غلطی ہوئی حالانکہ وہ یہیں کے رہے ہیں پروردہ اور تجربہ یافتہ تھے تو جناب سلم کو جو کہ یہاں پر دیسی کی حیثیت رکھتے تھے، دھوکا ہونا قابل تعجب نہیں ہے۔

مسلم کی تحریک کو چلانے والے ان کی صدا پر سب سے پہلے لبیک کہنے والے اور سب سے پہلے جلسہ میں جان بازی کا اقرار کرنے والے اور رائے عامہ کو ہوا کر کے مسلم کی نصرت و حمایت پر آمادہ کرنے والے ان میں سے اکثر بے شک سچے، خالص اور مخلص ہمدرد اور دوست تھے اور ان کا کام ہی تھا کہ وہ شہر کی فضا کو مسلم کے موافق بنا دیں جس میں ان کو بظاہر خاطر خواہ کامیابی ہوئی لیکن آئندہ کے انعکات کوئی دوسری صورت پیدا نہ کریں گے۔ اسکی ذمہ داری کسی پر عائد نہیں ہو سکتی۔ بے شک ان قلیل التعداد خالص دوستوں نے اپنے اقرار اور عہد جان بازی پر بہترین طریقہ سے عمل کیا اور جو کہا تھا اسے کر دکھایا، جس کے مشاہدہ کے لیے مستقبل کا انتظار کرنا چاہیے۔

جناب مسلم بن عقیل کو حالات خوشگوار اور مطابق قول و قرار نظر آئے۔ اس لیے امام حسینؓ کو خط لکھ دیا کہ جلد تشریف لائیے۔ حالات سازگار ہیں اور اہل کوفہ اپنے قول و قرار پر قائم ہیں۔ مقامی حکومت کا طرز عمل ان کی نسبت روادار نہ تھا۔ کوفہ کے حاکم نعمان بن بشیر نے منبر پر جا کر ایک تقریر کی جس کا مضمون یہ تھا کہ اے بندگانِ خدا فتنہ و فساد

عہد و پیمان اس غرض سے نہ تھا کہ مسلم کوئی جا رہا نہ اقدام کرنا چاہتے تھے۔ اور اس کے متعلق یہ لوگ نصرت اور مدد کا وعدہ کر رہے تھے اور نہ موجودہ صورت حال کی بنا پر یہ خیال کسی دماغ میں جگہ پاسکتا تھا کہ چند ہی روز میں تنہا مسلم کے مقابلہ میں فوج کشی ہوگی اور اس کے لیے اس جماعت کو تیار رہنا چاہیے۔ بلکہ یہ عہد و پیمان صرف امام حسینؓ کی تشریف آوری کی پیش ہند اور اس موقع کے لیے ان لوگوں کے عزائم و نیت کے اندازہ کے طور پر تھا۔

مسلم بن عقیل کے ورود کی خبر کوفہ میں عام طور پر مشہور ہو چکی تھی اور اس فضا کے لحاظ سے جو امام حسینؓ کو دعوت دینے کی تحریک کے سلسلہ میں ابتدائی سے کوفہ میں پیدا ہو گئی تھی اور جس کے اسباب و وضاحت کے ساتھ درج کیے جا چکے ہیں، ہر شخص نے اس خبر کا مسرت کے ساتھ استقبال کیا۔

یزید کی خلافت سے سبب اس کی سیاہ کاریوں کے بیزاری ایک طرف، حضرت حسینؓ بن علیؓ کی ہمدردی نہ صرف خاندانی وجاہت کے باعث بلکہ اپنے اخلاق و کمالات کے لحاظ سے دوسری جانب، وہ لوگ کہ جو مسلم بن عقیل کی تحریک کے مبلغ و داعی تھے ان کی ذاتی وجاہت اور تعلقات تیسری طرف اور کل جدید لہذا کے طبعی قانون کے مطابق ہترازہ تحریک میں جو لڑتے ہوئے ہیں وہ چوتھی جانب ان تمام اسباب کی بنا پر حضرت مسلم کے ہاتھ پر ایک ہفتہ کے اندر بارہ یا اٹھارہ ہزار کوفیوں نے بیعت کی لیکن کیا یہ سب دوستانہ علیؓ تھے؟ کیا کوفہ میں زیاد و آل زیاد کی بیس سال حکومت کے بعد جس میں کھینچی ہوئی تلواہیں اور جلا دلوں کے ہاتھ برابر اپنی سفاکی دکھاتے رہے ہوں اور دست و پا، سرو زبان کے قطع و برید کا سلسلہ برابر جاری رہا ہو، کوفہ میں اتنی تعداد میں علیؓ کے دوست موجود ہو سکتے تھے؟ ہرگز نہیں۔ سچے شیعہ تو کوفہ میں پہلے ہی کم تھے۔ اور جو تھے بھی وہ معاویہ کے قتل و غارت کے بعد تقریباً نیت و نابود ہو چکے تھے۔

اور افتراق سے پرہیز کرو۔ اس سے خواہ مخواہ جانیں جائیں گی، خون نہیں گے اور مالی تباہیاں ہوں گی جہاں تک میرا تعلق ہے میں جب تک کوئی بجا رعانہ اقدام میرے خلاف نہ ہو اس وقت تک کوئی اقدام نہیں کروں گا۔ کوذ میں یہ خبر گرم تھی کہ اب بہت جلد ہی حسین بن علی تشریف لانے والے ہیں اور اس وجہ سے ہر طرف ایک خاص چہل پہل نظر آتی تھی اور حلقہ حلقہ جماعت در جماعت لوگ بیٹھ کر اس پر اظہارِ خیالات کرتے تھے اور بے چینی کے ساتھ دیدہ براہ تھے مگر کوذ کے اندر ایک ایسی جماعت موجود تھی جو ان تمام منصوبوں کو خاک سیاہ بنا دینے پر تئی ہوئی تھی اور یہی حکومت کے خیر خواہ وہ لوگ تھے جنہیں اندیشہ ہوا ہوگا کہ حسین بن علی کے اقتدار کے بعد انھیں سوال خلق پر بے جا تصرفات کا موقع باقی نہ رہے گا۔ چنانچہ ان میں سے ایک شخص بنی امیہ کے حلیف عبداللہ بن مسلم حضرمی نے تو نعمان بن بشیر کی مذکورہ بالا روداد اور اندازِ تقریر کے بعد ہی کھڑے ہو کر کہہ دیا کہ یہ آپ کا طریق کار صحیح نہیں ہے اور آپ کمزوری دکھا رہے ہیں جس پر نعمان نے کہا کہ میں اللہ کی اطاعت کے لیے کمزور ثابت ہوں یہ بہتر ہے اس سے کہ معصیتِ الہی کر کے زور اور ثبات ہوں۔ یہ جواب نعمان کے ضمیر کی صاف ترجمانی کر رہا تھا جس کے بعد فسادِ اشخاص کو کچھ کہنے کا موقع نہ تھا۔ اس لیے یہاں سے جا کر فوراً عبداللہ بن مسلم نے یزید کے نام خط لکھا کہ مسلم بن عقیل کو ذ آئے ہیں اور ان کے طرفداروں نے ان کے ہاتھ پر حسین کی بیعت کر لی ہے۔ اگر آپ کو کوذ اپنے ہاتھ میں رکھنا ہے تو یہاں کوئی مضبوط آدمی بھیجے جو آپ کے فرمان کے مطابق عمل کر سکے۔ اس لیے کہ نعمان بن بشیر کمزور شخص ہیں یا وہ جان بوجھ کر کمزوری دکھا رہے ہیں۔

عمارہ بن عقبہ اور عمرو بن سعد نے بھی ایسے ہی مضمون کے خطوط روانہ کیے۔ ان خطوط کے پہنچنے پر یزید نے سرخون بن منصور رومی سے مشورہ لیا۔ یہ شخص عیسائی تھا جو معاویہ کے

۱۹۹ ج ۶ طبری

۱۹۹ ج ۶ طبری

۱۹۹ ج ۶ طبری کے خط لکھنے کی نسبت مسلم بن سعید حضرمی اور عمارہ بن عقبہ کی طرف دی ہے اور کہا ہے کہ یہ دونوں یزید بن معاویہ کے جاسوس تھے (الاخبار الطوال ۲۳۳ ۱۹۹ ج ۶ طبری - ارشاد ۲۱۱ - ۲۱۲)

زمانہ سے محکمہ خراج میں کاتب تھا۔ سرخون نے عبید اللہ بن زیاد کا نام لیا۔ یزید اس وقت تک ابن زیاد سے خفا تھا کیونکہ اس کا خیال تھا کہ اسی کی وجہ سے زیاد نے میری دیوہدی سے اختلاف کیا تھا اور یہ کہ شاید معاویہ کے بعد بجائے میرے یہ خود خلافت کا امیدوار تھا اس لیے اس کا اب تک یہ ارادہ تھا کہ وہ بصرہ کی حکومت سے بچے۔ ابن زیاد کو معزول کر دے گا۔ چنانچہ ابن زیاد کا نام سننے ہی یزید نے انکار کیا اور کہا، انہیں وہ ٹھیک نہیں ہے کسی اور کا نام لو۔ سرخون نے کہا۔ یہ بتائیے کہ اگر معاویہ اس وقت زندہ ہوتے اور وہ اس وقت آپ کو یہی رائے دیتے تو آپ قبول کرتے؟ یزید نے کہا، بے شک ان کے کہنے کو ضرور قبول کرتا۔ یہ سن کر سرخون نے ایک تحریر لکھی اور کہا کہ یہ معاویہ کا فرمان ہے جو میں ابن زیاد کو کوذ کا حاکم مقرر کیا ہے۔ وہ اسے بھیجے نہ پائے کہ انتقال ہو گیا۔ اب آپ بصرہ اور کوذ دونوں جگہ کی حکومت عبید اللہ بن زیاد کے لئے الوزراء والکتاب مقرر کیا۔ چونکہ اس زمانہ میں کوذ دوسرا دمشق دونوں مرکزوں میں مالیات کے متعلق دو دفتر تھے، ایک رعایا کی مردم شماری کا اور ان کے وظائف و انعامات کا، یہاں کام عربی میں ہوتا تھا اور دوسرا آمدنی و خرچ کے حسابات کا۔ یہاں کوذ بصرہ میں اب تک فارسی زبان میں ہوتا تھا اور شام میں یہ رومی زبان میں لکھا جاتا تھا اس لیے عراق میں یہ دفتر مجوسیوں اور شام میں عیسائیوں کے ہاتھ میں تھا۔ چنانچہ اس دفتر کا اہم اعلیٰ دمشق میں سرخون تھا جو معاویہ کے وقت سے عبد الملک بن مروان کے عہد تک برابر اس شعبہ کا ذمہ دار رہا اور اس عہدے میں کہ یہ کام بغیر ہمارے ہو ہی نہیں سکتا ایسا محسوس ہونے لگا کہ وہ خلیفہ تک کو خاطر میں نہیں لاتا۔ اسی وجہ سے عبد الملک کے زمانہ میں عراق اور شام کے ان دونوں دفتروں کو بھی عربی میں منتقل کیا گیا چنانچہ شام میں حجاج بن یوسف نے عراق کے دفتروں سے مجوسیوں کو نکال کر ان کو عربی کی طرف منتقل کیا اور تقریباً اسی زمانہ میں عبد الملک کے حکم سے دمشق کے دفتر کی زبان عربی بنائی گئی اور سرخون کو عہدہ سے برطرف کر دیا گیا (الوزراء والکتاب ۲۴۰) ۱۹۹ ج ۶ طبری پہلے زیاد کے مرنے کے بعد شام میں عبید اللہ بن زیاد کو معاویہ نے خراسان کا حاکم قرار دیا۔ اس وقت اس کی عمر ۲۵ برس کی تھی (طبری ج ۶ ص ۲۵۵) پھر ۵۵ میں اسے بصرہ کا حاکم قرار دیا (ص ۱۲۵) ۱۹۹ ج ۶ طبری

بہر حال اس خط کو کوفہ کی حکومت کے پردانہ کے ساتھ مسلم بن عمرو باہلی کے ہاتھ ابن زیاد کے پاس روانہ کیا جس کو دیکھتے ہی اس نے بصرہ میں اپنے بھائی عثمان بن زیاد کو قائم مقام بنا کر خود کوفہ جانے کی تیاری کر دی اور مسجد جامع میں ایک تہدید آمیز تقریر کرنے کے بعد جس میں اعلان کیا تھا کہ اگر تم میں سے کسی نے ذرا بھی مخالفت کی تو میں اسی کو نہیں بلکہ اس کے دشمن کو بھی قتل کر ادول گا اور اس پاس کے آدمیوں اور خطاکار کے ساتھ بے خطا کو بھی سزا دینے میں کمی نہ کروں گا۔ دوسرے دن روانہ ہو گیا۔ وہ کوئی اور نہیں زیاد بن ابیہ کا بیٹا اور معاویہ کا ان کے اعداء کے مطابق بھتیجا تھا اور یہ پورا خاندان ہی وہ تھا جس پر حید و فریب کا خاتمہ تھا۔ چنانچہ سب سے پہلی بات ابن زیاد نے یہ کہ اس نے اپنی نقل و حرکت کو بالکل صیغہ راز میں رکھا تاکہ اس کا ورود کوفہ میں اچانک حیثیت سے ہو اور پھر جب کوفہ نزدیک رہ گیا تو اس نے اپنی وضع میں تغیر پیدا کر کے ایک سیاہ عمامہ سر پر باندھا اور چہرہ پر اسی طریق سے جو عرب قوم کے بہادر دن کا جنگ وغیرہ کے موقعوں پر دستور تھا ایک ڈھانٹا باندھ لیا جس کی بنا پر شناخت ناممکن ہو گئی۔ ایک مرتبہ شہر پناہ کوفہ کے اندر یہ نقشہ نظر آیا کہ آگے آگے عربی گھوڑے پر سوار ایک ریس قوم پورے وقار و ملکنت کے ساتھ سیاہ عمامہ سر پر باندھے جو اشراف عرب کا امتیازی نشان تھا اور اس کے پیچھے ایک شاندار قافلہ زین و ہجام، ساز و سامان سے آراستہ آ رہا ہے۔ اس حشم و خدم کو دیکھ کر ان توقعات کی بنا پر جو پہلے سے قائم تھے وہی ہونا چاہیے تھا جو ہوا۔ یعنی ہر شخص ہی سمجھا کہ حضرت حسین بن علیؑ تشریف لائے ہیں اور اس قائم شدہ اثر کی بنا پر یہ متوقع جدید انقلاب سے نفع دنیوی حاصل کرنے کی تمنا میں جس جماعت کی طرف سے عبید اللہ کا گزرتا رہتا وہ بہ نظر تعظیم کھڑے ہو کر آداب بجا لاتی اور خوش آمدید کے معنی میں یہ الفاظ زبان پر جاری کرتی۔ مرحبا بک یا بن رسول اللہ قد مت خیر مقدم۔ ابن زیاد

یہ قیدی بن مسلم کی شخصیت تاریخ میں مشہور ہے۔ یہ مسلم بن عمرو اسی کا باپ تھا (الانخبار الطوال ص ۳۳)

۱۔ الاخبار الطوال ص ۲۳ ج ۶ ص ۲۱۰ - ارشاد ص ۲۱۲ - ۲۱۳

یہ قرار دے دیجیے۔

یزید نے معاویہ کی اس تحریر کے مطابق ابن زیاد کے نام خط لکھا کہ مجھے میرے شیعوں نے کوفہ سے خطوط لکھے ہیں کہ وہاں سپر عقل نے اگر شکر جمع کرنا شروع کر دیا ہے تاکہ مسلمانوں میں نفرت اور فساد پیدا ہو۔ تم اس خط کے پہنچنے کے ساتھ ہی ادھر روانہ ہو اور مسلم کو قبضہ میں لا کر قید کرو، قتل کرو یا نکال دو۔ والسلام

قدیم مودعہ ہشجاری نے اس خط کا مضمون حسب ذیل لکھا ہے جس کے پس منظر میں یزید کی ابن زیاد سے ناراضگی کو ملحوظ رکھتے ہوئے اس میں تہدیدی انداز زیادہ نمایاں ہے۔

”معلوم ہونا چاہیے کہ جس کی ایک وقت تعریفیں ہوتی ہیں وہی دوسرے وقت سب دشمن سے یاد کیا جاتا ہے اور جسے سب شتم سے یاد کیا جاتا ہے وہی ایک دم محلِ تعریف بن جاتا ہے۔ اس وقت ایک بڑا منصب تمہارے سپرد کیا جا رہا ہے جس سے بڑھ کر تمہارے لیے کوئی اعزاز نہیں ہو سکتا اور اتفاق سے حسینؑ کی ہم تمہارے ہی دور اور تمہارے ہی فخر و مملکت کے نصیب میں آئی ہے اور تمام محال حکومت میں تم ہی وہ ہو جو اس محل آرائش میں پڑے ہو۔ اب یا تو تمہاری شرافت پایہ ثبوت تک پہنچ جائے گی اور یا جیسے کبھی تھے ویسے ہی غلام کے غلام قرار پا جاؤ گے۔ والسلام“

اس کے آخری فقرہ میں تلخجہ وہی زیاد کے جہول النسب ہونے اور پھر معاویہ کی نظر عنایت سے فرزند ابوسفیان قرار دیے جانے کی طرف ہے۔ اس خط کے مضمون سے یہ بھی ظاہر ہے کہ وہ صرف مسلم ہی کے بارے میں ابن زیاد کو سرگرمی کی تحریک نہیں کر رہا ہے بلکہ سخت و درشت اور غیرت انگیز الفاظ میں خود حضرت امام حسینؑ کے معاملہ میں ابن زیاد کو مضبوط اقدامات کی تحریک کر رہا ہے۔ جس میں ذرا بھی کوتاہی اس کے سامنے اس کے تمام مستقبل کے تاریک بننے کی دھمکیوں کا مرکز بنا دی گئی ہے۔

۱۔ ارشاد ص ۲۱۲ - طبری ج ۶ ص ۲۱۰ - ۲۱۱ - ۲۱۲ - ۲۱۳

ابن زیاد نے مسجد جامع میں ایک تہمدی تقریر کے ساتھ اپنی حکومت کا اعلان کرنے کے بعد قصر میں جا کر قیام کیا اور نعمان بن بشیرؓ فوراً قصر کا تحلیہ کر کے کوفہ سے اپنے وطن شام کی طرف روانگی اختیار کی۔ ابن زیاد نے اس کے بعد تمام محلات کوفہ کے ذمہ دار اشخاص کو جن سے عزافت کا منصب تعلق رکھتا تھا بلا کر یہ فرمان جاری کیا کہ جلد سے جلد ہر محلہ کی مردم شماری اور ہو لوگ نو وارد ہیں ان کی فہرست اور جن لوگوں سے حکومت شام کو خطرہ ہے ان کے نام ادارہ حکومت محلیہ میں پیش کر دیے جائیں اور اگر وہ کسی وجہ سے ان فہرستوں کے تفصیل وار ترتیب دینے سے معذور ہوں تو ضمانت داخل کریں، ان کے محلہ میں کوئی تنفیس بھی حاکم شام کی مخالفت پر آمادہ نہ ہوگا اور اس کے خلاف ظاہر ہو تو اس مختار محلہ کو فوراً اسی کے گھر کے دروازہ پر سولی دی جائے گی اور اس کے خاندان ہمیشہ کے لیے اس منصب کو علیحدہ کر لیا جائیگا۔ یہ مضبوط تدبیر ایسی نہ تھی جس کی کامیابی شبہ ہو۔ کوفہ کا چپہ چپہ جو ایسے و مخبرین کی کثرت سے غیر محفوظ نظر آئے لگا۔ اب ہر شخص خاد اپنے محلہ میں ایک گھر سے دوسرے گھر پر جاتے ڈرتا تھا اور اس طرح دس پانچ آدمیوں کا ہی ایک جگہ جمع ہو کر کسی امر پر گفتگو کرنا اور کوئی قرارداد استوار کرنا ناممکن ہو گیا۔

یہ پہلا موقع وہ ہو سکتا تھا کہ جب مس بن عقیل کو بحال کا اندیشہ اور مقصد کی پامالی کا احساس ہو جاتا۔ اب آپ کا صرف ایک فرض رہ گیا تھا کہ آپ حفاظت خود اختیاری کے فریضہ کے ماتحت جہاں تک ممکن ہو اپنے تحفظ کے لیے احتیاطی تدابیر عمل میں لائیں۔ اس کے لیے آپ کو مختار بن ابی عبیدہ کا مکان جس میں آپ اب تک مقیم تھے غیر محفوظ معلوم ہوا۔ اس لیے ۲۳۳ھ الاخبار الطوال ۲۳۳ھ ملک عرب میں یہ رلیقہ اب تک رائج ہے کہ بڑے شہر میں ہر محلہ میں ایک مختار محلہ ہوتا ہے جو اس محلہ کی مردم شماری دار و صادر، زائیدہ و مردہ، شادی شدہ و غیر شادی شدہ وغیرہ امور کی تشریح کا مقامی حکومت کی طرف سے ذمہ دار ہوتا ہے۔ اسی منصب کے اہل نامہ میں عزافت کہتے تھے۔ ۲۳۳ھ طبری ج ۶ ص ۲۱۰ - ارشاد ملکا۔

کسی کو کچھ جواب نہ دیتا بلکہ آوازوں کو سنتا، چہروں کو بغور دیکھتا، شکل و شمائل کو پہچانتا چلا جا رہا تھا۔ یہاں تک کہ مجمع زیادہ ہو گیا اور لوگ اشتیاق سے گھروں سے نکل آئے اور ہر شخص فرزند رسولؐ سمجھ کر آگے بڑھنے لگا اور نوبت یہ پہنچی کہ راہ چلنے میں رکاوٹ پیدا ہونے لگی۔ اس وقت مسلم بن عمرو باہلی نے جو ابن زیاد کے ساتھ تھا۔ پکار کر کہا۔ "راستہ چھوڑ دو۔ یہ امیر عبد اللہ بن زیاد ہیں"۔ نہ معلوم ان الفاظ میں کونسا اثر تھا کہ بڑھتے ہوئے قدم اور اٹھتے ہوئے ہاتھ اور سرست آمیز ترانے سب موقوف ہو گئے۔ ایک سناٹا تھا جو چھا گیا اور سارا مجمع تتر بتر ہو گیا۔ یہاں تک کہ جب ابن زیاد دار الامارہ میں پہنچا تو دس آدمیوں سے زیادہ اس کے ساتھ نہ تھے۔

اس موقع پر اہل کوفہ کے فطری رجحانات پر غور کرنے کے بعد ان کے باطنی اضطراب کا اندازہ کرنا چنداں دشوار نہیں۔ اس لیے کہ حالات کا غیر متوقع صورت سے ظہور پذیر ہونا بجائے خود سنسنی پیدا کر دیتا ہے ہر جانیکہ صورت حال یہ ہو کہ ان میں سے ہر ایک نے اپنے خلاف خود جاسوسی کے کام کو انجام دیا یعنی اپنے باطنی خیالات اور حسین بن علیؑ کے ساتھ خلوص عقیدت کی خود ابن زیاد کے سامنے بوقت ورود ترجمانی کر دی اور ابن زیاد نے ایک ایک چہرہ اور آواز کو پہچان لیا اور پھر ابن زیاد وہی تھا جس کی اور جس کے باپ کی تلوار کے نیچے بیس برس تک اس تمام خلقت کی گردنیں اس طرح خم رہی ہیں کہ جس کو چاہا گرفتار کیا، سولی پر لٹکایا، اجلا د کے ہاتھ سے سر کو قلم کر دیا اور ایسے ہیبت ناک مناظر ان ہی ہاتھوں سے آنکھوں کے سامنے آچکے ہیں جن کو سوچ کر اب تک رونگٹے کھڑے ہو جاتے اور دل ہل جاتے ہوں گے۔ اور اب وہی صورتیں اپنے اور اپنی اولاد اور اعزہ و اقارب کے لیے پیش نظر ہیں۔ کیا یہ وجہ ایسے نہ تھے جن کی بناء پر دل و دماغ معطل طاقتیں مضحکہ اور ہمتیں پست ہو جائیں اور ان پر عظیم خوف دہراس کا غلبہ ہو جاتا خصوصاً جبکہ زیادہ تر تعداد عوام کی تھی جو واقعات و حالات کو سمجھے بغیر ہر نئی آواز پر لٹیک کہنے کے شوق میں شریک ہو گئے تھے۔

طرز عمل اختیار کرنا لازم ہے چنانچہ مسلم بن عوسجہ اسدی نے حضرت مسلم کی طرف سے اب لوگوں سے حفاظت و نصرت کا وعدہ لینا شروع کیا اور ابو ثامر صائمی فراہمی سرمایہ اور جمع آوری اسلحہ کے ذمہ دار ہونے لگے۔

ابن زیاد کو جناب مسلم کی جائے قیام کا پتہ لگانے کی بڑی فکر تھی۔ اس نے مسلم کی سرانجام دہی کے لیے اپنے شامی غلام معقل کو تین ہزار درہم دے کر مقرر کیا کہ وہ خفیہ طریقہ پر کسی نہ کسی طرح مسلم کا پتہ چلائے۔ معقل اس فکر میں مسجد جامع میں آیا۔ اتفاق سے اس وقت مسلم بن عوسجہ ایک رکن مسجد کے پاس نماز میں مصروف تھے۔ وہ دیر تک انکو دیکھتا رہا اور اس نے اپنے دل میں کہا (جسے خود اس نے بعد میں بیان کیا) کہ یہ شیعہ لوگ نمازیں بکثرت پڑھتے ہیں اس لیے ہوں نہ ہوں یہ انہیں میں سے ہوں گے لہذا وہ انتظار میں بیٹھا رہا۔ جب مسلم نماز سے فارغ ہوئے تو وہ ان کے پاس آکر بیٹھا اور کہا کہ ”میں غلام کا رہنے والا ذوالکلاع کا غلام خدا کے فضل سے اہل بیت رسول کا دوست ہوں۔ مجھے معلوم ہوا ہے کہ اس خاندان میں سے کوئی بزرگ اہل کلاع کو ذمہ میں آئے ہوئے ہیں اور لوگوں سے رسول خدا کے نواسے کی بیعت لے رہے ہیں اور یہ تین ہزار درہم میرے پاس ہیں۔ تو آیا آپ مجھے ان کا پتہ بتا سکتے ہیں کہ یہ رقم میں ان کی خدمت میں حاضر کر دوں جسے وہ اپنی ہم میں صرف کریں۔“

مسلم نے کہا کہ اگر مسجد میں دوسرے لوگ بھی ہیں تم میرے ہی پاس اس کے دریافت کرنے کو کیوں آئے ہو؟ اس نے کہا کہ سبب یہ ہے کہ میں نے آپ میں نیکی داری اور پیہر بگاری کا انکار دیکھے تو یقین ہوا کہ آپ ضرور دوستانہ اہل بیت رسول میں سے ہیں۔ جناب مسلم اس کے فریب میں آگئے اور کہا تم نے خوب پہچانا۔ میں تمہارے ہی بھائیوں میں سے ہوں۔ میرا نام مسلم بن عوسجہ ہے۔ مجھے تمہاری ملاقات سے بہت خوش ہوئی اور اس

کہ آپ کا قیام وہاں مشہور ہو چکا تھا اور پھر اگر کوئی دقت آتا تو وہاں آپ کی حمایت کرنے والا بھی کوئی نہ ہوتا۔ مختار بن ابی عبیدہ شریف قوم سہمی لیکن صرف ایک زمیندار کی حیثیت رکھتے تھے وہ کسی بڑے قبیلہ کے سردار نہ تھے اس کے علاوہ اس خاص موقع پر وہ کو ذمہ میں موجود بھی نہ تھے۔ لہذا مسلم نے اپنے لیے اس سے بہتر کوئی صورت نہ دیکھی کہ آپ تاریکی شب میں آتی بن عودہ کے گھر میں منتقل ہو جائیں۔ یہ قبیلہ مراد و مدرج کے سردار تھے اور جب نکلے تھے تو بارہ ہزار آہن پوش سوار ان کے ہم کاب ہوتے تھے۔

مسلم نے آتی کے گھر میں پناہ لے کر ظاہری اسباب کی بنا پر اپنے کو بارہ ہزار شمشیر زن بہادروں کے حلقہ میں پہنچا دیا جو بظاہر آپ کی حفاظت کا فرض بہترین طریقہ براد کر سکتے تھے۔ مآنی نے مسلم کو خفیہ طور پر اپنے یہاں رکھا اور سوا مخصوص افراد کے جو محل اعتماد تھے کسی کو اس نماز کی اطلاع نہ دی۔ اب ان قلیل التعداد دوستانہ اہل بیت کو جو اس تحریک کے داعی تھے۔ فضا کی ناسازگاری کا پورا پورا احساس ہو گیا تھا مگر وہ مستقل مزاجی کے ساتھ صورت حال کے مقابلہ پر آمادہ ہو گئے اور اب لازمی طور پر نقطہ نظر میں تبدیلی ہو گئی۔ اس کے پہلے امام حسینؑ کے خط کے مطابق مسلم کی حیثیت صرف ایک پُر امن نمائندہ کی تھی جس کا مقصد فقط کوفہ کے لوگوں سے امام حسینؑ کے لیے عہد و فاداری کا استوار کرنا تھا۔ چنانچہ اس کے پہلے ہرگز یہ پتہ نہیں چلتا کہ کوئی اسلحہ کی فراہمی کی کوشش ہو رہی ہو یا جنگ کی تیاری ہو مگر اب نوعیت یہ ہے کہ یہ یقینی ہے کہ عنقریب مسلم کے خلاف حکومت کی طرف سے حیرانہ اقدام ہوگا اور اب اس جماعت کو جو مسلم کے بلائے کی ذمہ دار ہے اس کے مقابلہ کے لیے تیار ہونا چاہیے۔ اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے اب یہ جو کچھ ہو رہا ہے وہ ال ہدایت نامہ کے حدود سے آگے جو مسلم کو امام حسینؑ کی جانب سے دیا گیا تھا۔ یہ اب ایک ہنگامی صورت حال ہے جس کے لیے مسلم اور جماعت کوفہ کو بہر حال مناسب

۱۹۵۵ء ۲۴۵ طبری ج ۵ ص ۱۹۵ و ۲۰۲ - ارشاد ص ۲۱۳

طبری ج ۵ ص ۲۰۵ - ارشاد ص ۲۱۵ - الاخبار الطوال ص ۲۳۶

ارید حیوۃ ویرید قتل عذیرک من خلیک من مراد
یعنی میں تو اس کی زندگی چاہتا ہوں اور وہ میری جان لینے کا درپے ہے۔
خدا ہی سمجھے اس قبیلہ مراد والے تمہارے دوست سے۔“

اس سے کہانی سمجھ گئے کہ بظاہر راز افشا ہو چکا ہے مگر انہوں نے کہا: ”کیوں امیر کیا
معاشرہ ہے؟“ اس نے بڑے غصے سے کہا کہ ”ارے کتنے غضب کی بات ہے کہ تم نے اپنے
گھر کو خلیفہ وقت اور تمام مسلمانوں کے خلاف سازشوں کا اڈہ بنایا ہے۔ تم نے مسلم بن عقیل
کو ہلا کر اپنے گھر میں رکھا ہے۔ ان کے لیے اسلحہ جمع کر رہے ہو۔ اپنے گرد و پیش کے گھروں میں
ان کی مدد کیلئے آدمی جمع کر رہے ہو اور سمجھتے ہو کہ یہ باتیں سب مجھ سے چھپی رہیں گی۔“
کہانی نے پہلے ان باتوں کی صحت سے انکار کیا مگر جب اس نے معتقل کو ہلا کر سامنے کھڑا کر دیا۔
اور کہانی کو معلوم ہوا کہ شخص جاسوس ہے تو اب ان کے پاس کوئی جواب نہ تھا اور تھوڑی
دیر کے لیے وہ مدہوش سے ہو گئے پھر انہوں نے اپنے ہوش و حواس کو جمع کر کے کہا۔ اب مجھ
سے اصل حقیقت سنئے۔ باور کیجئے۔ بخدا ایک غلطی غلط نہ کہوں گا۔ واقعہ یہ ہے
کہ میں نے مسلم کو نہ خود بلایا اور نہ مجھے ان کی تحریک کے متعلق کوئی علم تھا مگر وہ خود میرے پاس
آگئے اور میرے مکان پر قیام کے خواہش مند ہوئے۔ اب مجھے شرم دامگیر ہوئی اور انکار نہ
بن پڑا۔ اس طرح میں نے انہیں مہمان کر لیا اور پناہ دے دی۔ تاہم میں آپسے یہ عہد کرتا ہوں
میں آپ کے خلاف کوئی جارحانہ اقدام نہیں کروں گا اور ابھی آکر اپنے کو آپ کے حوالہ کر دوں گا۔
مگر اتنی اجازت دے دیجئے کہ میں جا کر مستمسک ہے کہہ دوں کہ میرے گھر سے نکل کر جہاں چاہیں
چلے جائیں تاکہ ان کے پناہ دینے کی ذمہ داری سے سبکدوش ہو جاؤں۔ پھر مجھے ان سے
کوئی مطلب نہ رہے گا۔

ابن زیاد نے کہا: ”نہیں جب تک انہیں خود میرے پاس حاضر نہ کرو تم نہیں جاسکتے۔“
کہانی نے کہا یہ تو نہیں ہو سکتا کہ میں اپنے مہمان کو ہلا کر اپنے گھر میں قتل کر دوں۔“

بات سے اور زیادہ متسرت حال ہوئی کہ تم اپنی خواہش میں کامیاب ہو چکے اور تمہارے ذریعہ
سے اہل بیت رسول کو کچھ تقویت پہنچے گی۔ بے شک اندیشہ ہوتا ہے کہ کہیں ظالم ابن زیاد
کو بھی اس کی اطلاع نہ ہو جائے لہذا تم مجھ سے عہد کرو کہ کسی سے اس کا اظہار نہ کرو گے۔

چنانچہ کافی اطمینان اور عہد و پیمان اور راز داری کے وعدوں کے ساتھ مسلم بن عوسجہ
نے اقرار کیا کہ میں کئی نہیں جناب مسلم بن عقیل کی خدمت میں۔ یہ چلوں گا معتقل دوسرے دن
جناب مسلم بن عوسجہ کے مکان پر آیا اور وہ اسے حضرت مسلم بن عقیل کے پاس لے گئے۔
اس نے آپ کی بیعت کی اور تین ہزار دہم جو لایا تھا آپ کی خدمت میں پیش کیے۔
اس کے بعد معتقل کی یہ صورت تھی کہ وہ دن بھر جناب مسلم کے پاس رہتا اور تمام حالات
معلوم کرتا تھا اور رات کو ہر بات کی اطلاع ابن زیاد کو پہنچا دیتا تھا۔

کہانی کے ابن زیاد سے بہت قدیم تعلقات تھے مگر صرف اس اندیشہ پر کہ کہیں
ابن زیاد کو مسلم کے میرے یہاں قیام کی کچھ جھنجھٹ لگتی ہو وہ آجکل ابن زیاد کی ملاقات
کو جانے سے پرہیز کرتے تھے اور بیماری کے عذر کے ساتھ خانہ نشین ہو گئے تھے۔
ابن زیاد کو یہ نگرہ ہوئی کہ کسی طرح کہانی کو بلانا چاہیے۔ چنانچہ اس نے کہانی بن عروہ کے پاس
ملاقات کا پیغام بھیجا۔ کہانی کو اس وقت کسی دقیق خطرہ کا احساس نہیں ہوا اور اسی کا نتیجہ
ہے کہ ابن زیاد کے دعوتی پیغام پر انہوں نے اپنے بارہ ہزار جوانوں میں سے کسی ایک کو
بھی واقعہ سے اطلاع دینے کی ضرورت محسوس نہیں کی بلکہ خود تنہا ابن زیاد کے پاس
چلے گئے۔ وہاں پہنچے تو پہلے ہی سے ابن زیاد کا رنگ بدلا ہوا پایا۔ پہلے تو صورت دیکھتے
ہی اس نے عرب کی ایک مثل زبان پر جاری کی کہ رانتك بحاشی رحبلاہ جس کا
مطلب یہ ہوا کہ کہانی اپنے پیروں سے موت کی طرف آ رہے ہیں۔ پھر اس نے شریح قاضی
کی طرف رخ کر کے یہ شعر پڑھا ہے

غیر بنی ہاشم کا یہ تقاضا نہ تھا۔ انہوں نے یہ طے کر لیا کہ ہانی نہیں تو پھر میں بھی نہیں۔ طبری نے صاف طور پر تصریح کی ہے کہ مسلم کا جنگ کے لیے نکلنا اپنے ساتھیوں کی اطلاع کے بغیر تھا اور کوئی قرار داد اس دن کے متعلق نہ ہوئی تھی۔ وہ ایک مرتبہ اس وقت کھڑے ہو گئے جب کہ ان کو معلوم ہوا کہ ہانی بن عروہ مرادی زرد کو بکے بعد قید کیے گئے ہیں۔

دینوری کا بیان ہے کہ جناب ہانی قتل کر دیے گئے اور ان کی شہادت کا حال سن کر جناب مسلم باہر نکلے۔ ابن زیاد نے مسجد میں آکر پیر ایک تہدید ی تقریر کی۔ ابھی وہ منبر سے اترا تھا کہ لوگ دوڑتے ہوئے "باب التمارین" سے مسجد میں داخل ہوئے یہ کہتے ہوئے کہ ابن عقیل آگئے۔ ابن زیاد گھبرا کر منبر سے اُترا اور تیزی کے ساتھ قصر کے اندر جا کر دروازے قصر کے بند کر لیے۔

واقعات کی ناگہانی حیثیت کو دیکھتے ہوئے اب یہ توقع تو کی ہی نہیں جاسکتی تھی کہ وہ ۱۸ ہزار بیعت کرنے والے سب مسلم کے گرد جمع ہو جائیں گے اور جنگ میں ان کے ساتھ شرکت کریں گے اور پھر جب کہ کوفہ کے محلے بھی ایک دوسرے سے متصل نہیں تھے بلکہ کافی فاصلہ رکھتے تھے۔ ہاں یہ محملہ کہ جس میں مسلم کا قیام تھا۔ کافی وسعت رکھتا تھا اور اسی کے اطراف میں مسلم کے گردا گرد چار ہزار آدمی موجود تھے اور مسلم کی طرف سے جو بھی "یا منصور اِمت" کا نعرہ بلند کیا گیا جو ان کا شعار یعنی امتیازی نعرہ جنگ تھا تو شرما شرمی وہ چار ہزار آدمی جمع ہو گئے لیکن ظاہر ہے کہ اس محدود وقت میں جبکہ جنگ کے پہلے سے کچھ آثار نہ تھے وہ شاہی منظم فوج سے کہاں تک مقابلہ کے لیے تیاری کر سکے ہوں گے خصوصاً جبکہ ان چار ہزار میں بھی اکثر ایسے ہی عوام تھے جو تاج پر غور کیے بغیر وقتی اقدامات پر آمادہ ہو جاتے ہیں اور جن کا حقیقی شیعہ آل رسول ہونا ہرگز ثابت نہیں۔

بہر حال جناب مسلم نے اس مختصر لشکر کو ترتیب دیا اور پیش قدمی شروع کی مگر جناب مسلم

بات اتنی بڑھی کہ ابن زیاد نے کہا "تم کو انہیں لانا ہوگا" نہیں تو میں تمہارا قتل کر دینا ہانی نے کہا "ایسا ہوا تو آپ کے مکان کے گرد بجلیاں کوندتی ہونگی؟" ان کا خیال تھا کہ ان کا قبیلہ ان کی مدد کرے گا۔ یہ سننا تھا کہ ابن زیاد کو زیادہ غصہ آیا اور کہا "اچھا! تم بجلیوں سے مجھے ڈراتے ہو۔ لاؤ۔ اسے میرے قریب لاؤ۔" سپاہی دوڑ پڑے۔ ہانی کو غلام ابن زیاد کے قریب لائے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ بڑھے لیکن بات کے پچے ہانی کا سر و چہرہ چھڑی کی ضرب سے خون میں رنگین ہو گیا۔ ہانی بالکل نہبتے تھے۔ انہوں نے ایک سپاہی کی تلوار پر جو ان کے پاس کھڑا تھا ہاتھ ڈالا کہ اس سے چھین لیں۔ ابن زیاد نے کہا "اچھا! اب تو تم خارجی قرار پا گئے۔ تمہارا خون ہمارے لیے حلال ہے۔" جلاد بے ددی سے انہیں کھینچ کر لے گئے اور قید خانے میں ڈال دیا۔

بنی زبیدہ کا سردار عمرو بن الحجاج، ہانی بن عروہ کا بڑا نسبتی تھا۔

اسے اطلاع ہوئی کہ ہانی قتل کر ڈالے گئے تو وہ مذبح کے بھت سے زرد پوش سوار لے کر دارالامارہ پر پڑھ دوڑا اور تلواروں کی جھنکار گھوڑوں کی ٹاپوں کی آواز سننے لگتی کے دل میں رہائی کے توقعات پیدا کر دیے لیکن افسوس کہ شریح قاضی کی فہمائش اور اس کے کہنے سے کہ ہانی قتل نہیں ہوئے ہیں بلکہ بعض مصالح سے ایک محدود زمانہ تک نظر بند کر دیے گئے ہیں۔ وہ سب مطمئن ہو کر واپس گئے۔

حضرت مسلم کے لیے یہ موقع بہت سخت تھا۔ ان کا پناہ دینے والا۔ دُعا دار اور مستقل مزاج بہادر ہانی بن عروہ ان کی وجہ سے زرد کو بک کی توہین آمیز تکلیف برداشت کر کے دشمن کے قید خانہ میں تھا اور مسلم کے گرد گھریں خاندان مراد کی عورتیں نالہ و شہیون کر رہی تھیں۔ کیا اب بھی مسلم بن عقیل چھپے بیٹھے رہتے یا اس وجہ سے کہ یہاں ان کا قیام معلوم ہو گیا ہے کسی دوسرے قابل اعتماد شخص کے یہاں جا کر مخفی ہو جاتے؟ ہرگز نہیں

۱۔ طبری ج ۱ ص ۲۱۸ - ارشاد ص ۲۱۸ - ۲۱۹ - ۲۲۰ - ۲۲۱ - ۲۲۲ - ۲۲۳ - ۲۲۴ - ۲۲۵ - ۲۲۶ - ۲۲۷ - ۲۲۸ - ۲۲۹ - ۲۳۰ - ۲۳۱ - ۲۳۲ - ۲۳۳ - ۲۳۴ - ۲۳۵ - ۲۳۶ - ۲۳۷ - ۲۳۸ - ۲۳۹ - ۲۴۰ - ۲۴۱ - ۲۴۲ - ۲۴۳ - ۲۴۴ - ۲۴۵ - ۲۴۶ - ۲۴۷ - ۲۴۸ - ۲۴۹ - ۲۵۰ - ۲۵۱ - ۲۵۲ - ۲۵۳ - ۲۵۴ - ۲۵۵ - ۲۵۶ - ۲۵۷ - ۲۵۸ - ۲۵۹ - ۲۶۰ - ۲۶۱ - ۲۶۲ - ۲۶۳ - ۲۶۴ - ۲۶۵ - ۲۶۶ - ۲۶۷ - ۲۶۸ - ۲۶۹ - ۲۷۰ - ۲۷۱ - ۲۷۲ - ۲۷۳ - ۲۷۴ - ۲۷۵ - ۲۷۶ - ۲۷۷ - ۲۷۸ - ۲۷۹ - ۲۸۰ - ۲۸۱ - ۲۸۲ - ۲۸۳ - ۲۸۴ - ۲۸۵ - ۲۸۶ - ۲۸۷ - ۲۸۸ - ۲۸۹ - ۲۹۰ - ۲۹۱ - ۲۹۲ - ۲۹۳ - ۲۹۴ - ۲۹۵ - ۲۹۶ - ۲۹۷ - ۲۹۸ - ۲۹۹ - ۳۰۰ - ۳۰۱ - ۳۰۲ - ۳۰۳ - ۳۰۴ - ۳۰۵ - ۳۰۶ - ۳۰۷ - ۳۰۸ - ۳۰۹ - ۳۱۰ - ۳۱۱ - ۳۱۲ - ۳۱۳ - ۳۱۴ - ۳۱۵ - ۳۱۶ - ۳۱۷ - ۳۱۸ - ۳۱۹ - ۳۲۰ - ۳۲۱ - ۳۲۲ - ۳۲۳ - ۳۲۴ - ۳۲۵ - ۳۲۶ - ۳۲۷ - ۳۲۸ - ۳۲۹ - ۳۳۰ - ۳۳۱ - ۳۳۲ - ۳۳۳ - ۳۳۴ - ۳۳۵ - ۳۳۶ - ۳۳۷ - ۳۳۸ - ۳۳۹ - ۳۴۰ - ۳۴۱ - ۳۴۲ - ۳۴۳ - ۳۴۴ - ۳۴۵ - ۳۴۶ - ۳۴۷ - ۳۴۸ - ۳۴۹ - ۳۵۰ - ۳۵۱ - ۳۵۲ - ۳۵۳ - ۳۵۴ - ۳۵۵ - ۳۵۶ - ۳۵۷ - ۳۵۸ - ۳۵۹ - ۳۶۰ - ۳۶۱ - ۳۶۲ - ۳۶۳ - ۳۶۴ - ۳۶۵ - ۳۶۶ - ۳۶۷ - ۳۶۸ - ۳۶۹ - ۳۷۰ - ۳۷۱ - ۳۷۲ - ۳۷۳ - ۳۷۴ - ۳۷۵ - ۳۷۶ - ۳۷۷ - ۳۷۸ - ۳۷۹ - ۳۸۰ - ۳۸۱ - ۳۸۲ - ۳۸۳ - ۳۸۴ - ۳۸۵ - ۳۸۶ - ۳۸۷ - ۳۸۸ - ۳۸۹ - ۳۹۰ - ۳۹۱ - ۳۹۲ - ۳۹۳ - ۳۹۴ - ۳۹۵ - ۳۹۶ - ۳۹۷ - ۳۹۸ - ۳۹۹ - ۴۰۰ - ۴۰۱ - ۴۰۲ - ۴۰۳ - ۴۰۴ - ۴۰۵ - ۴۰۶ - ۴۰۷ - ۴۰۸ - ۴۰۹ - ۴۱۰ - ۴۱۱ - ۴۱۲ - ۴۱۳ - ۴۱۴ - ۴۱۵ - ۴۱۶ - ۴۱۷ - ۴۱۸ - ۴۱۹ - ۴۲۰ - ۴۲۱ - ۴۲۲ - ۴۲۳ - ۴۲۴ - ۴۲۵ - ۴۲۶ - ۴۲۷ - ۴۲۸ - ۴۲۹ - ۴۳۰ - ۴۳۱ - ۴۳۲ - ۴۳۳ - ۴۳۴ - ۴۳۵ - ۴۳۶ - ۴۳۷ - ۴۳۸ - ۴۳۹ - ۴۴۰ - ۴۴۱ - ۴۴۲ - ۴۴۳ - ۴۴۴ - ۴۴۵ - ۴۴۶ - ۴۴۷ - ۴۴۸ - ۴۴۹ - ۴۵۰ - ۴۵۱ - ۴۵۲ - ۴۵۳ - ۴۵۴ - ۴۵۵ - ۴۵۶ - ۴۵۷ - ۴۵۸ - ۴۵۹ - ۴۶۰ - ۴۶۱ - ۴۶۲ - ۴۶۳ - ۴۶۴ - ۴۶۵ - ۴۶۶ - ۴۶۷ - ۴۶۸ - ۴۶۹ - ۴۷۰ - ۴۷۱ - ۴۷۲ - ۴۷۳ - ۴۷۴ - ۴۷۵ - ۴۷۶ - ۴۷۷ - ۴۷۸ - ۴۷۹ - ۴۸۰ - ۴۸۱ - ۴۸۲ - ۴۸۳ - ۴۸۴ - ۴۸۵ - ۴۸۶ - ۴۸۷ - ۴۸۸ - ۴۸۹ - ۴۹۰ - ۴۹۱ - ۴۹۲ - ۴۹۳ - ۴۹۴ - ۴۹۵ - ۴۹۶ - ۴۹۷ - ۴۹۸ - ۴۹۹ - ۵۰۰ - ۵۰۱ - ۵۰۲ - ۵۰۳ - ۵۰۴ - ۵۰۵ - ۵۰۶ - ۵۰۷ - ۵۰۸ - ۵۰۹ - ۵۱۰ - ۵۱۱ - ۵۱۲ - ۵۱۳ - ۵۱۴ - ۵۱۵ - ۵۱۶ - ۵۱۷ - ۵۱۸ - ۵۱۹ - ۵۲۰ - ۵۲۱ - ۵۲۲ - ۵۲۳ - ۵۲۴ - ۵۲۵ - ۵۲۶ - ۵۲۷ - ۵۲۸ - ۵۲۹ - ۵۳۰ - ۵۳۱ - ۵۳۲ - ۵۳۳ - ۵۳۴ - ۵۳۵ - ۵۳۶ - ۵۳۷ - ۵۳۸ - ۵۳۹ - ۵۴۰ - ۵۴۱ - ۵۴۲ - ۵۴۳ - ۵۴۴ - ۵۴۵ - ۵۴۶ - ۵۴۷ - ۵۴۸ - ۵۴۹ - ۵۵۰ - ۵۵۱ - ۵۵۲ - ۵۵۳ - ۵۵۴ - ۵۵۵ - ۵۵۶ - ۵۵۷ - ۵۵۸ - ۵۵۹ - ۵۶۰ - ۵۶۱ - ۵۶۲ - ۵۶۳ - ۵۶۴ - ۵۶۵ - ۵۶۶ - ۵۶۷ - ۵۶۸ - ۵۶۹ - ۵۷۰ - ۵۷۱ - ۵۷۲ - ۵۷۳ - ۵۷۴ - ۵۷۵ - ۵۷۶ - ۵۷۷ - ۵۷۸ - ۵۷۹ - ۵۸۰ - ۵۸۱ - ۵۸۲ - ۵۸۳ - ۵۸۴ - ۵۸۵ - ۵۸۶ - ۵۸۷ - ۵۸۸ - ۵۸۹ - ۵۹۰ - ۵۹۱ - ۵۹۲ - ۵۹۳ - ۵۹۴ - ۵۹۵ - ۵۹۶ - ۵۹۷ - ۵۹۸ - ۵۹۹ - ۶۰۰ - ۶۰۱ - ۶۰۲ - ۶۰۳ - ۶۰۴ - ۶۰۵ - ۶۰۶ - ۶۰۷ - ۶۰۸ - ۶۰۹ - ۶۱۰ - ۶۱۱ - ۶۱۲ - ۶۱۳ - ۶۱۴ - ۶۱۵ - ۶۱۶ - ۶۱۷ - ۶۱۸ - ۶۱۹ - ۶۲۰ - ۶۲۱ - ۶۲۲ - ۶۲۳ - ۶۲۴ - ۶۲۵ - ۶۲۶ - ۶۲۷ - ۶۲۸ - ۶۲۹ - ۶۳۰ - ۶۳۱ - ۶۳۲ - ۶۳۳ - ۶۳۴ - ۶۳۵ - ۶۳۶ - ۶۳۷ - ۶۳۸ - ۶۳۹ - ۶۴۰ - ۶۴۱ - ۶۴۲ - ۶۴۳ - ۶۴۴ - ۶۴۵ - ۶۴۶ - ۶۴۷ - ۶۴۸ - ۶۴۹ - ۶۵۰ - ۶۵۱ - ۶۵۲ - ۶۵۳ - ۶۵۴ - ۶۵۵ - ۶۵۶ - ۶۵۷ - ۶۵۸ - ۶۵۹ - ۶۶۰ - ۶۶۱ - ۶۶۲ - ۶۶۳ - ۶۶۴ - ۶۶۵ - ۶۶۶ - ۶۶۷ - ۶۶۸ - ۶۶۹ - ۶۷۰ - ۶۷۱ - ۶۷۲ - ۶۷۳ - ۶۷۴ - ۶۷۵ - ۶۷۶ - ۶۷۷ - ۶۷۸ - ۶۷۹ - ۶۸۰ - ۶۸۱ - ۶۸۲ - ۶۸۳ - ۶۸۴ - ۶۸۵ - ۶۸۶ - ۶۸۷ - ۶۸۸ - ۶۸۹ - ۶۹۰ - ۶۹۱ - ۶۹۲ - ۶۹۳ - ۶۹۴ - ۶۹۵ - ۶۹۶ - ۶۹۷ - ۶۹۸ - ۶۹۹ - ۷۰۰ - ۷۰۱ - ۷۰۲ - ۷۰۳ - ۷۰۴ - ۷۰۵ - ۷۰۶ - ۷۰۷ - ۷۰۸ - ۷۰۹ - ۷۱۰ - ۷۱۱ - ۷۱۲ - ۷۱۳ - ۷۱۴ - ۷۱۵ - ۷۱۶ - ۷۱۷ - ۷۱۸ - ۷۱۹ - ۷۲۰ - ۷۲۱ - ۷۲۲ - ۷۲۳ - ۷۲۴ - ۷۲۵ - ۷۲۶ - ۷۲۷ - ۷۲۸ - ۷۲۹ - ۷۳۰ - ۷۳۱ - ۷۳۲ - ۷۳۳ - ۷۳۴ - ۷۳۵ - ۷۳۶ - ۷۳۷ - ۷۳۸ - ۷۳۹ - ۷۴۰ - ۷۴۱ - ۷۴۲ - ۷۴۳ - ۷۴۴ - ۷۴۵ - ۷۴۶ - ۷۴۷ - ۷۴۸ - ۷۴۹ - ۷۵۰ - ۷۵۱ - ۷۵۲ - ۷۵۳ - ۷۵۴ - ۷۵۵ - ۷۵۶ - ۷۵۷ - ۷۵۸ - ۷۵۹ - ۷۶۰ - ۷۶۱ - ۷۶۲ - ۷۶۳ - ۷۶۴ - ۷۶۵ - ۷۶۶ - ۷۶۷ - ۷۶۸ - ۷۶۹ - ۷۷۰ - ۷۷۱ - ۷۷۲ - ۷۷۳ - ۷۷۴ - ۷۷۵ - ۷۷۶ - ۷۷۷ - ۷۷۸ - ۷۷۹ - ۷۸۰ - ۷۸۱ - ۷۸۲ - ۷۸۳ - ۷۸۴ - ۷۸۵ - ۷۸۶ - ۷۸۷ - ۷۸۸ - ۷۸۹ - ۷۹۰ - ۷۹۱ - ۷۹۲ - ۷۹۳ - ۷۹۴ - ۷۹۵ - ۷۹۶ - ۷۹۷ - ۷۹۸ - ۷۹۹ - ۸۰۰ - ۸۰۱ - ۸۰۲ - ۸۰۳ - ۸۰۴ - ۸۰۵ - ۸۰۶ - ۸۰۷ - ۸۰۸ - ۸۰۹ - ۸۱۰ - ۸۱۱ - ۸۱۲ - ۸۱۳ - ۸۱۴ - ۸۱۵ - ۸۱۶ - ۸۱۷ - ۸۱۸ - ۸۱۹ - ۸۲۰ - ۸۲۱ - ۸۲۲ - ۸۲۳ - ۸۲۴ - ۸۲۵ - ۸۲۶ - ۸۲۷ - ۸۲۸ - ۸۲۹ - ۸۳۰ - ۸۳۱ - ۸۳۲ - ۸۳۳ - ۸۳۴ - ۸۳۵ - ۸۳۶ - ۸۳۷ - ۸۳۸ - ۸۳۹ - ۸۴۰ - ۸۴۱ - ۸۴۲ - ۸۴۳ - ۸۴۴ - ۸۴۵ - ۸۴۶ - ۸۴۷ - ۸۴۸ - ۸۴۹ - ۸۵۰ - ۸۵۱ - ۸۵۲ - ۸۵۳ - ۸۵۴ - ۸۵۵ - ۸۵۶ - ۸۵۷ - ۸۵۸ - ۸۵۹ - ۸۶۰ - ۸۶۱ - ۸۶۲ - ۸۶۳ - ۸۶۴ - ۸۶۵ - ۸۶۶ - ۸۶۷ - ۸۶۸ - ۸۶۹ - ۸۷۰ - ۸۷۱ - ۸۷۲ - ۸۷۳ - ۸۷۴ - ۸۷۵ - ۸۷۶ - ۸۷۷ - ۸۷۸ - ۸۷۹ - ۸۸۰ - ۸۸۱ - ۸۸۲ - ۸۸۳ - ۸۸۴ - ۸۸۵ - ۸۸۶ - ۸۸۷ - ۸۸۸ - ۸۸۹ - ۸۹۰ - ۸۹۱ - ۸۹۲ - ۸۹۳ - ۸۹۴ - ۸۹۵ - ۸۹۶ - ۸۹۷ - ۸۹۸ - ۸۹۹ - ۹۰۰ - ۹۰۱ - ۹۰۲ - ۹۰۳ - ۹۰۴ - ۹۰۵ - ۹۰۶ - ۹۰۷ - ۹۰۸ - ۹۰۹ - ۹۱۰ - ۹۱۱ - ۹۱۲ - ۹۱۳ - ۹۱۴ - ۹۱۵ - ۹۱۶ - ۹۱۷ - ۹۱۸ - ۹۱۹ - ۹۲۰ - ۹۲۱ - ۹۲۲ - ۹۲۳ - ۹۲۴ - ۹۲۵ - ۹۲۶ - ۹۲۷ - ۹۲۸ - ۹۲۹ - ۹۳۰ - ۹۳۱ - ۹۳۲ - ۹۳۳ - ۹۳۴ - ۹۳۵ - ۹۳۶ - ۹۳۷ - ۹۳۸ - ۹۳۹ - ۹۴۰ - ۹۴۱ - ۹۴۲ - ۹۴۳ - ۹۴۴ - ۹۴۵ - ۹۴۶ - ۹۴۷ - ۹۴۸ - ۹۴۹ - ۹۵۰ - ۹۵۱ - ۹۵۲ - ۹۵۳ - ۹۵۴ - ۹۵۵ - ۹۵۶ - ۹۵۷ - ۹۵۸ - ۹۵۹ - ۹۶۰ - ۹۶۱ - ۹۶۲ - ۹۶۳ - ۹۶۴ - ۹۶۵ - ۹۶۶ - ۹۶۷ - ۹۶۸ - ۹۶۹ - ۹۷۰ - ۹۷۱ - ۹۷۲ - ۹۷۳ - ۹۷۴ - ۹۷۵ - ۹۷۶ - ۹۷۷ - ۹۷۸ - ۹۷۹ - ۹۸۰ - ۹۸۱ - ۹۸۲ - ۹۸۳ - ۹۸۴ - ۹۸۵ - ۹۸۶ - ۹۸۷ - ۹۸۸ - ۹۸۹ - ۹۹۰ - ۹۹۱ - ۹۹۲ - ۹۹۳ - ۹۹۴ - ۹۹۵ - ۹۹۶ - ۹۹۷ - ۹۹۸ - ۹۹۹ - ۱۰۰۰

۱۔ طبری ج ۱ ص ۲۱۸ - ارشاد ص ۲۱۸ - ۲۱۹ - ۲۲۰ - ۲۲۱ - ۲۲۲ - ۲۲۳ - ۲۲۴ - ۲۲۵ - ۲۲۶ - ۲۲۷ - ۲۲۸ - ۲۲۹ - ۲۳۰ - ۲۳۱ - ۲۳۲ - ۲۳۳ - ۲۳۴ - ۲۳۵ - ۲۳۶ - ۲۳۷ - ۲۳۸ - ۲۳۹ - ۲۴۰ - ۲۴۱ - ۲۴۲ - ۲۴۳ - ۲۴۴ - ۲۴۵ - ۲۴۶ - ۲۴۷ - ۲۴۸ - ۲۴۹ - ۲۵۰ - ۲۵۱ - ۲۵۲ - ۲۵۳ - ۲۵۴ - ۲۵۵ - ۲۵۶ - ۲۵۷ - ۲۵۸ - ۲۵۹ - ۲۶۰ - ۲۶۱ - ۲۶۲ - ۲۶۳ - ۲۶۴ - ۲۶۵ - ۲۶۶ - ۲۶۷ - ۲۶۸ - ۲۶۹ - ۲۷۰ - ۲۷۱ - ۲۷۲ - ۲۷۳ - ۲۷۴ - ۲۷۵ - ۲۷۶ - ۲۷۷ - ۲۷۸ - ۲۷۹ - ۲۸۰ - ۲۸۱ - ۲۸۲ - ۲۸۳ - ۲۸۴ - ۲۸۵ - ۲۸۶ - ۲۸۷ - ۲۸۸ - ۲۸۹ - ۲۹۰ - ۲۹۱ - ۲۹۲ - ۲۹۳ - ۲۹۴ - ۲۹۵ - ۲۹۶ - ۲۹۷ - ۲۹۸ - ۲۹۹ - ۳۰۰ - ۳۰۱ - ۳۰۲ - ۳۰۳ - ۳۰۴ - ۳۰۵ - ۳۰۶ - ۳۰۷ - ۳۰۸ - ۳۰۹ - ۳۱۰ - ۳۱۱ - ۳۱۲ - ۳۱۳ - ۳۱۴ - ۳۱۵ - ۳۱۶ - ۳۱۷ - ۳۱۸ - ۳۱۹ - ۳۲۰ - ۳۲۱ - ۳۲۲ - ۳۲۳ - ۳۲۴ - ۳۲۵ - ۳۲۶ - ۳۲۷ - ۳۲۸ - ۳۲۹ - ۳۳۰ - ۳۳۱ - ۳۳۲ - ۳۳۳ - ۳۳۴ - ۳۳۵ - ۳۳۶ - ۳۳۷ - ۳۳۸ - ۳۳۹ - ۳۴۰ - ۳۴۱ - ۳۴۲ - ۳۴۳ - ۳۴۴ - ۳۴۵ - ۳۴۶ - ۳۴۷ - ۳۴۸ - ۳۴۹ - ۳۵۰ - ۳۵۱ - ۳۵۲ - ۳۵۳ - ۳۵۴ - ۳۵۵ - ۳۵۶ - ۳۵۷ - ۳۵۸ - ۳۵۹ - ۳۶۰ - ۳۶۱ - ۳۶۲ - ۳۶۳ - ۳۶۴ - ۳۶۵ - ۳۶۶ - ۳۶۷ - ۳۶۸ - ۳۶۹ - ۳۷۰ - ۳۷۱ - ۳۷۲ - ۳۷۳ - ۳۷۴ - ۳۷۵ - ۳۷۶ - ۳۷۷ - ۳۷۸ - ۳۷۹ - ۳۸۰ - ۳۸۱ - ۳۸۲ - ۳۸۳ - ۳۸۴ - ۳۸۵ - ۳۸۶ - ۳۸۷ - ۳۸۸ - ۳۸۹ - ۳۹۰ - ۳۹۱ - ۳۹۲ - ۳۹۳ - ۳۹۴ - ۳۹۵ - ۳۹۶ - ۳۹۷ - ۳۹۸ - ۳۹۹ - ۴۰۰ - ۴۰۱ - ۴۰۲ - ۴۰۳ - ۴۰۴ - ۴۰۵ - ۴۰۶ - ۴۰۷ - ۴۰۸ - ۴۰۹ - ۴۱۰ - ۴۱۱ - ۴۱۲ - ۴۱۳ - ۴۱۴ - ۴۱۵ - ۴۱۶ - ۴۱۷ - ۴۱۸ - ۴۱۹ - ۴۲۰ - ۴۲۱ - ۴۲۲ - ۴۲۳ - ۴۲۴ - ۴۲۵ - ۴۲۶ - ۴۲۷ - ۴۲۸ - ۴۲۹ - ۴۳۰ - ۴۳۱ - ۴۳۲ - ۴۳۳ - ۴۳۴ - ۴۳۵ - ۴۳۶ - ۴۳۷ - ۴۳۸ - ۴۳۹ - ۴۴۰ - ۴۴۱ - ۴۴۲ - ۴۴۳ - ۴۴۴ - ۴۴۵ - ۴۴۶ - ۴۴۷ - ۴۴۸ - ۴۴۹ - ۴۵۰ - ۴۵۱ - ۴۵۲ - ۴۵۳ - ۴۵۴ - ۴۵۵ - ۴۵۶ - ۴۵۷ - ۴۵۸ - ۴۵۹ - ۴۶۰ - ۴۶۱ - ۴۶۲ - ۴۶۳ - ۴۶۴ - ۴۶۵ - ۴۶۶ - ۴۶۷ - ۴۶۸ - ۴۶۹ - ۴۷۰ - ۴۷۱ - ۴۷۲ - ۴۷۳ - ۴۷۴ - ۴۷۵ - ۴۷۶ - ۴۷۷ - ۴۷۸ - ۴۷۹ - ۴۸۰ - ۴۸۱ - ۴۸۲ - ۴۸۳ - ۴۸۴ - ۴۸۵ - ۴۸۶ - ۴۸۷ - ۴۸۸ - ۴۸۹ - ۴۹۰ - ۴۹۱ - ۴۹۲ - ۴۹۳ - ۴۹۴ - ۴۹۵ - ۴۹۶ - ۴۹۷ - ۴۹۸ - ۴۹۹ - ۵۰۰ - ۵۰۱ - ۵۰۲ - ۵۰۳ - ۵۰۴ - ۵۰۵ - ۵۰۶ - ۵۰۷ - ۵۰۸ - ۵۰۹ - ۵۱۰ - ۵۱۱ - ۵۱۲ - ۵۱۳ - ۵۱۴ - ۵۱۵ - ۵۱۶ - ۵۱۷ - ۵۱۸ - ۵۱۹ - ۵۲۰ - ۵۲۱ - ۵۲۲ - ۵۲۳ - ۵۲۴ - ۵۲۵ - ۵۲۶ - ۵۲۷ - ۵۲۸ - ۵۲۹ - ۵۳۰ - ۵۳۱ - ۵۳۲ - ۵۳۳ - ۵۳۴ - ۵۳۵ - ۵۳۶ - ۵۳۷ - ۵۳۸ - ۵۳۹ - ۵۴۰ - ۵۴۱ - ۵۴۲ - ۵۴۳ - ۵۴۴ - ۵۴۵ - ۵۴۶ - ۵۴۷ - ۵۴۸ - ۵۴۹ - ۵۵۰ - ۵۵۱ - ۵۵۲ - ۵۵۳ - ۵۵۴ - ۵۵۵ - ۵۵۶ - ۵۵۷ - ۵۵۸ - ۵۵۹ - ۵۶۰ - ۵۶۱ - ۵۶۲ - ۵۶۳ - ۵۶۴ - ۵۶۵ - ۵۶۶ - ۵۶۷ - ۵۶۸ - ۵۶۹ - ۵۷۰ - ۵۷۱ - ۵۷۲ - ۵۷۳ - ۵۷۴ - ۵۷۵ - ۵۷۶ - ۵۷۷ - ۵۷۸ - ۵۷۹ - ۵۸۰ - ۵۸۱ - ۵۸۲ - ۵۸۳ - ۵۸۴ - ۵۸۵ - ۵۸۶ - ۵۸۷ - ۵۸۸ - ۵۸۹ - ۵۹۰ - ۵۹۱ - ۵۹۲ - ۵۹۳ - ۵۹۴ - ۵۹۵ - ۵۹۶ - ۵۹۷ - ۵۹۸ - ۵۹۹ - ۶۰۰ - ۶۰۱ - ۶۰۲ - ۶۰۳ - ۶۰۴ - ۶۰۵ - ۶۰۶ - ۶۰۷ - ۶۰۸ - ۶۰۹ - ۶۱۰ - ۶۱۱ - ۶۱۲ - ۶۱۳ - ۶۱۴ - ۶۱۵ - ۶۱۶ - ۶۱۷ - ۶۱۸ - ۶۱۹ - ۶۲۰ - ۶۲۱ - ۶۲۲ - ۶۲۳ - ۶۲۴ - ۶۲۵ - ۶۲۶ - ۶۲۷ - ۶۲۸ - ۶۲۹ - ۶۳۰ - ۶۳۱ - ۶۳۲ - ۶۳۳ - ۶۳۴ - ۶۳۵ - ۶۳۶ - ۶۳۷ - ۶۳۸ - ۶۳۹ - ۶۴۰ - ۶۴۱ - ۶۴۲ - ۶۴۳ - ۶۴۴ - ۶۴۵ - ۶۴۶ - ۶۴۷ - ۶۴۸ - ۶۴۹ - ۶۵۰ - ۶۵۱ - ۶۵۲ - ۶۵۳ - ۶۵۴ - ۶۵۵ - ۶۵۶ - ۶۵۷ - ۶۵۸ - ۶۵۹ - ۶۶۰ - ۶۶۱ - ۶۶۲ - ۶۶۳ - ۶۶۴ - ۶۶۵ - ۶۶۶ - ۶۶۷ - ۶۶۸ - ۶۶۹ - ۶۷۰ - ۶۷۱ - ۶۷۲ - ۶۷۳ - ۶۷۴ - ۶۷۵ - ۶۷۶ - ۶۷۷ - ۶۷۸ - ۶۷۹ - ۶۸۰ - ۶۸۱ - ۶۸۲ - ۶۸۳ - ۶۸۴ - ۶۸۵ - ۶۸۶ - ۶۸۷ - ۶۸۸ - ۶۸۹ - ۶۹۰ - ۶۹۱ - ۶۹۲ - ۶۹۳ - ۶۹۴ - ۶۹۵ - ۶۹۶ - ۶۹۷ - ۶۹۸ - ۶۹۹ - ۷۰۰ - ۷۰۱ - ۷۰۲ - ۷۰۳ - ۷۰۴ - ۷۰۵ - ۷۰۶ - ۷۰۷ - ۷۰۸ - ۷۰۹ - ۷۱۰ - ۷۱۱ - ۷۱۲ - ۷۱۳ - ۷۱۴ - ۷۱۵ - ۷۱۶ - ۷۱۷ - ۷۱۸ - ۷۱۹ - ۷۲۰ - ۷۲۱ - ۷۲۲ - ۷۲۳ - ۷۲۴ - ۷۲۵ - ۷۲۶ - ۷۲۷ - ۷۲۸ - ۷۲۹ - ۷۳۰ - ۷۳۱ - ۷۳۲ - ۷۳۳ - ۷۳۴ - ۷۳۵ - ۷۳۶ - ۷۳۷ - ۷۳۸ - ۷۳۹ - ۷۴۰ - ۷۴۱ - ۷۴۲ - ۷۴۳ - ۷۴۴ - ۷۴۵ - ۷۴۶ - ۷۴۷ - ۷۴۸ - ۷۴۹ - ۷۵۰ - ۷۵۱ - ۷۵۲ - ۷۵۳ - ۷۵۴ - ۷۵۵ - ۷۵۶ - ۷۵۷ - ۷۵۸ - ۷۵۹ - ۷۶۰ - ۷۶۱ - ۷۶۲ - ۷۶۳ - ۷۶۴ - ۷۶۵ - ۷۶۶ - ۷۶۷ - ۷۶۸ - ۷۶۹ - ۷۷۰ - ۷۷۱ - ۷۷۲ - ۷۷۳ - ۷۷۴ - ۷۷۵ - ۷۷۶ -

مسلم کے پاس آئیں لیکن محمد بن شعث نے گرفتار کر لیا۔ یہ دونوں جاننا کہ مسلم دہان کی شہادت کے بعد پسر زیاد کے حکم سے قتل کر دے گئے۔ اگر ریح ختم سے مختلف اطراف و جانب کی مدد قطع ہو گئی۔ چنانچہ حبیب بن مہاجر بن عوسجہ اور ابو ثمار صاگری ایسے خاص لوگ ریح جناب مسلم کے پاس پہنچے۔ تار رہ گئے۔ اس کے بعد وہ اشرف قبائل کو جمع کر کے منشر کرنے کا حکم دیا گیا۔ وہ لوگ دارالامارہ کے بالافاز پر پڑھ گئے۔ ورنہ انھوں نے اپنے قبیلہ والوں کو پکار پکار کر ہمدردانہ انداز میں کہا کہ یقین دلایا کہ عنقریب ریحی حکومت تمام کی جانب سے بہت بڑی فوجیں آنے والی ہیں اور اس صورت میں تمہارے جان و مال و اولاد سب تلف ہو جائیں گے۔ دشمن سے فوجیں آنے کی خبر ہر طرف پھیلادی گئی جس کے بعد یہ عالم ہوا کہ عورتیں اپنے گھروں سے نکل نکل کر اپنے باپ بھائی کے پاس آئیں اور کہتی تھیں کہ چلو واپس چلو۔ دوسرے لوگ کافی ہیں باپ یا بھائی اپنے بیٹے یا بھائی کے پاس آنا اور کہتا ہی کر اے کل دشمن سے لشکر آ جائے گا تو پھر تم کیا کر گے۔ چلو لڑائی سے ہاتھ اٹھاؤ اور مجبور کر کے اسے اپنے ساتھ لے جاتا تھا۔

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ شام ہوتے ہوئے صرف تیس آدمی حضرت مسلم کے پاس رہ گئے۔ آپ نے مسجد میں جا کر نماز مغرب پڑھی۔ نماز کے ختم ہونے کے بعد جب آپ باہر نکلے تو رفتہ رفتہ وہ بقیہ تیس بھی چلے گئے۔ اب مسلم تنہا بازاروں میں پھرتے گئے اور کوئی اتنا تک نہ تھا کہ آپ کو راستہ بتا دے۔ آپ تاریکی شب میں یونہی چلے جاتے تھے یہاں تک کہ قبیلہ کندہ میں پہنچ گئے۔ اس قبیلہ کی عورت طوع جو پہلے محمد بن اشعث کی زیر نگرانی اور اس کے آزاد کرنے کے بعد اسید حضرمی کے نکاح میں آئی جس سے ایک لڑکا پید ہوا۔ یہ کہیں گیا ہوا تھا اور طوع گھر کے دروازہ پر کھڑی اس کا انتظار کر رہی تھی۔ جناب مسلم نے اسے دیکھ کر بعد سلام پانی پینے کو مانگا۔ عورت خدا ترس تھی وہ گئی اور پانی لایا۔ جناب مسلم بیٹھ گئے اور پانی پیا۔ وہ برتن رکھنے گھر میں گئی۔ اُنی تو دیکھا کہ یہ پھر بھی بیٹھے ہیں۔ اس نے کہا۔ ”آپ پانی تو

۲۷ طبری ج ۶ صفحہ ۲۱۵ ۲۸ طبری ج ۶ صفحہ ۲۱۵ ۲۹ الاخبار الطوال صفحہ ۲۱۵ ۳۰ الاخبار الطوال صفحہ ۲۱۵

دارالامارہ تک پہنچنے بھی نہ پائے تھے۔ وہ لوگ واپس جانا شروع ہو گئے اور پہنچتے پہنچتے صرف تین سو رہ گئے۔ لیکن ابن زیاد اس خیال سے کہ مسلم کے ساتھ کوئی بڑی جمعیت ہے شہر کے اندر قلعہ بند ہو گیا اور مسلم نے بنی نمر لڑکی ایک جماعت کو لیے ہوئے قصر کا محاصرہ کیا۔ رفتہ رفتہ دوسرے لوگ بھی آئے گئے یہاں تک کہ مسلم کے پاس کافی جمعیت ہو گئی اور ظہر سے شام تک برابر لڑائی ہوتی رہی۔

موجودہ جمعیت کو جو مسلم کے ساتھ محاصرہ میں تھیں یہ بھی مختلف قبائل کے غلو ط جمع پر مشتمل سمجھنا چاہیے اور قبائل کے ریح رواں شیوخ و اشرف قبائل ہوتے ہیں جو حکومت کے ہوا خواہ اور پابند فرمان تھے اور ابن زیاد نے بروقت پیش بندی یہ کی تھی کہ آج صبح سے شیوخ و اشرف کو بلا کر اپنے پاس زیر حراست رکھ لیا تاکہ ان سے حسب مصلحت کام نکالا جاسکے۔ باوجودیکہ ابن زیاد کے پاس محل میں اس وقت کوئی فوج نہیں تھی بلکہ قصہ حکومت میں صرف تیس پولیس کے سپاہی تھے اور میں اسی اس کے مخصوصین اور روسائے قبائل میں سے یا زیادہ سے زیادہ دوسو آدمی موجود تھے۔ اس لیے وہ کوئی مقابلہ نہیں کر سکتا تھا۔ لیکن ایک طرف اس نے یہ کوشش کی کہ قصر کا دروازہ کھینے نہ پائے۔ دوسرے کچھ آدمی ادھر ادھر بھیج کر باہر سے سپاہی اکٹھا کر کے یہ انتظام کیا کہ شہر کی ناکہ بندی کی جائے یعنی چوراہوں اور عام راستوں پر پہرے بیٹھ جائیں کہ کوئی شخص مسلم کی مدد کو نہ آ سکے اور صورت واقعہ کی بنا پر یہ لازمی تھا کہ مسلم کی مدد کو آنے والے مجتمع حیثیت سے کسی لشکر کے ساتھ نہ آئے بلکہ اکاؤ کاجس کو خبر ہوتی جاتی وہ تنہا یا اپنے بھائی بندوں کے ساتھ مسلم کی شرکت کے لیے آتا اور وہ فوراً گرفتار ہو جاتا تھا چنانچہ عبداللہ بن یزید کلبی اپنے گھرانے کے کچھ جوانوں کو ساتھ لیے آ رہے تھے جن کو کثیر بن شہاب نے گرفتار کر لیا اور محمد بنی عمارہ کی طرف سے عمارہ بن صلتب از دی نے ہتھیار جسم پر راستہ کر کے چاٹا تھا کہ

۲۷ طبری ج ۶ صفحہ ۲۱۵ ۲۸ طبری ج ۶ صفحہ ۲۱۵ ۲۹ ارشاد صفحہ ۲۱۵ ۳۰ ارشاد صفحہ ۲۱۵

۳۱ الاخبار الطوال صفحہ ۲۱۵ ۳۲ طبری ج ۶ صفحہ ۲۱۵

بعد حصین بن تمیم کو حکم دیا کہ تمام شہر کی خانہ تلاشی کرے اور ابن عقیل کا پتہ لگائے۔ اور لوگوں کو عمر بن حریت کی ذمہ داری پر چھوڑ کر خواب گاہ میں داخل ہو گیا۔

طوعہ کا رٹ کا بلال صبح ہوتے ہی محمد بن اشعث کے نو عمر لڑکے عبدالرحمن کے پاس گیا اور اسے مسلم کے اپنے گھر میں ہونے کی اطلاع دی اور وہ فوراً اپنے باپ کے پاس جو ابن زیاد کے دربار میں جا چکا تھا، پہنچا اور اس کے ذریعہ سے ابن زیاد کو مطلع کیا۔ ابن زیاد نے محمد بن اشعث کی سرکردگی میں مسلم کی گرفتاری کے لیے فوج روانہ کر دی۔ حضرت مسلم نے جو گھوڑوں کی ٹاپوں کی آواز سنی سمجھ گئے کہ فوج میری گرفتاری کے لیے آئی ہے۔ تلوار لے کر حجرے سے باہر نکلے۔ اتنی دیر میں فوجی گھر کے اندر داخل ہو گئے۔ آپ نے حملہ کیا اور ایسا سخت کہ دشمنوں کو گھر سے باہر نکال دیا۔ وہ دوبارہ ہجوم کر کے اندر گھسے اور آپ نے دوبارہ انھیں باہر کر دیا۔ بیشک اس حملے میں بکر بن حمران امیری کی تلوار سے ان کے اوپر کالہ قطع ہو گیا اور نیچے کے لب پر بھی زخم آگیا اور دودانت شکستہ ہو گئے پھر بھی دشمنوں کو یہ یقین ہو گیا کہ مسلم پریوں فتح پانا مشکل ہے لہذا وہ مکان کی چھت پر چڑھ گئے اور پھر مارنے لگے۔ اس کے علاوہ سینٹھوں کے مٹھے آگ سے جلا کر اوپر سے پھینکنے لگے۔

جناب مسلم نے یہ بزدلانہ طریقہ جنگ دیکھا تو آپ تلوار کھینچے ہوئے مکان سے باہر کوچہ میں آ گئے۔ محمد بن اشعث نے پکار کر کہا کہ آپ کے لیے امان ہے۔ خواہ مخواہ تلوار نہ چلایئے آپ نے جنگ جاری رکھی اور رجز پڑھنے لگے۔ جس کا مضمون یہ تھا کہ ”میں نے قسم کھائی ہے، نہ قتل ہوں گا مگر آزادی کی حالت میں، اگرچہ موت ناگوار چیز ہے مگر بہر حال وہ ایک نہ ایک دن تو ہر شخص کے لیے ضروری ہے۔ مجھے تو یہ اندیشہ ہے کہ کہیں مجھ سے جھوٹ نہ بولا جائے اور دھوکا نہ دیا جائے۔ محمد بن اشعث نے کہا کہ ”میں آپ سے جھوٹ نہیں کہا جلدے گا اور نہ دھوکا دیا جائے گا۔ اطمینان رکھیے“ مسلم جنگ کر کے تھک چکے

لے الاخبار الطوال ص ۲۳۸ سے طبری ج ۲ ص ۲۱۱ - ارشاد ص ۲۲۲

پی چکے۔ اب اپنے گھر جا بیٹھے مسلم خاموش رہے۔ اس نے جب دوبارہ اور سربارہ کہا تو مسلم جواب دیا کہ ”اے کبیر خدا۔ میرا اس شہر میں کوئی گھر نہیں ہے۔ کیا تم مجھے پناہ دے کر ثواب حاصل کر سکتی ہو۔ ممکن ہے کہ اس کے بعد میں کبھی اس کا معاوضہ نہ پاؤں ساتھ کر سکوں“ اس نے حیران ہو کر پوچھا۔ ”آپ میں کون اور واقعہ کیا ہے؟“ فرمایا۔ ”میں مسلم بن عقیل ہوں۔ یہاں لوگوں نے میرے ساتھ غداری کی۔ مجھ سے نصرت کے وعدے کیے اور اب میرا ساتھ چھوڑ دیا۔“ اس نے کہا۔ ”اچھا۔ آپ مسلم ہیں؟“ کہا۔ ”ہاں میں وہی ہوں۔“ یہ سننا تھا کہ وہ آپ اپنے گھر میں لے گئی اور مکان کے ایک مخصوص کمرے میں آپ کیلئے فرش بچھا دیا اور کھانا حانہ کیا مگر آپ نے کھانا نوش نہیں کیا۔ تھوڑی دیر میں اس کا لڑکا آیا اور اس نے مال کو ایک کمرے میں بار بار آتے جاتے دیکھ کر سب دریافت کیا اور اخفا کی کوشش محسوس کر کے زیادہ کد کرنے لگا یہاں تک کہ طور کو واقعہ کا اظہار کرنا پڑا اس تاکید کے ساتھ کہ اس کا کسی سے اظہار نہ کرنا۔ وہ سن کر خاموش ہو گیا اور رات گزرنے کا انتظار کرنے لگا۔

ادھر ابن زیاد نے جب دیکھا کہ خطرہ بظاہر بالکل نہیں رہا تو اپنے آدمیوں کو حکم دیا کہ سائبانوں میں دیکھیں کہیں ابن عقیل ساتھ والے سائبانوں میں چھپے نہ ہوں۔ پورے طور پر اطمینان کر لینے کے بعد ابن زیاد نے عمر بن نافع کو حکم دیا کہ شہر میں اعلان کر دے کہ آج عشاء کی نماز کے لیے ہر شخص کو مسجد میں آنا ضروری ہے۔ کوئی شخص نماز کے وقت اپنے گھر میں نہ رہے ورنہ اس کے جان و مال کی ذمہ داری امیر کے سر نہ ہوگی۔ تھوڑی دیر میں مسجد کے اندر لوگوں کا ہجوم ہو گیا۔ اتنا مت کہی گئی اور پسر زیاد نے اپنے دائیں بائیں محافظ کھڑے کر دیے۔ اس کے بعد نماز پڑھائی۔ نماز کے بعد منبر پر جا کر تقریر کی کہ ابن عقیل نے جو مخالفت کا ہنگامہ اٹھا رکھا ہے تم نے دیکھا۔ جس کے گھر میں ابن عقیل کو پائیں گے اس کے جان و مال کی ذمہ داری ہم پر نہیں اور جو انہیں ہمارے پاس لائے گا اس کو ان کی دیت (خون بہا) دی جائیگی۔ اس کے

کر ابن زیاد کے پاس گیا۔ اس سے تمام جنگ کی کیفیات اور پھر وعدہ امان پر مسلم کو ساتھ لانے کا تذکرہ کیا۔ ابن زیاد نے کہا۔ ”امان دینے والا تم کون تھے؟ ہم نے تمہیں کیا اس لیے بھیجا تھا کہ تم انھیں امان دو؟ ہم نے تو اس لیے بھیجا تھا کہ انھیں ہمارے پاس لے آؤ۔“ ابن اشعث میں اب کہاں جرأت تھی کہ وہ اس کے بعد کچھ کہتا، خاموش ہو رہا۔ اس وقت دارالامارہ کے دروازہ پر بہت سے لوگ اجازت حضوری کے انتظار میں موجود تھے جن میں عمارہ بن عقیقہ، عمرو بن حرث، مسلم بن عمرو بانی اور کثیر بن شہاب مخصوص لوگ تھے اور ایک صراحی ٹھنڈے پانی سے بھری ہوئی دروازے کے قریب رکھی ہوئی تھی جناب مسلم بہت پیاسے تھے۔ انھوں نے کہا۔ ”تھوڑا سا پانی۔“ پلا دو۔“ مسلم بن عمرو نے بڑے سخت الفاظ میں پانی پلانے سے انکار کیا۔ مگر عمرو بن حرث نے اپنے غلام کو حکم دیا کہ وہ مسلم کو پانی پلا دے۔ اس نے گلاس پانی سے بھر کر مسلم کے سامنے پیش کیا مگر جناب مسلم نے جب پانی پینا چاہا تو منہ سے خون بہنے لگا اور پانی کو نگین کی دیار دو مرتبہ ایسا ہی ہوا۔ تیسری دفعہ دو دانت ٹوٹ کر گلاس میں گر پڑے۔ جناب مسلم نے ایس ہو کر گلاس ہاتھ سے دے دیا اور کہا ”معلوم ہوتا ہے پانی میری قسمت سے اٹھ چکا ہے“ نئی دیر میں ابن زیاد کا آدمی آیا اور مسلم کو اندر جانے کے لیے کہا۔ جب آپ ابن زیاد کے پاس پہنچے تو امیر کہہ کر اسے سلام نہیں کیا۔ ابن زیاد نے کہا ”مسلم اب تم بچ نہیں سکتے۔ بھی قتل کیے جاؤ گے۔“ جناب مسلم نے کہا ”میں اس کے لیے تو تیار ہی ہوں مگر مجھے اتنا موقع دیا جائے کہ میں کسی اپنے شناسا سے جو یہاں ہو کچھ وصیت کر لوں۔“ اس نے کہا ”چچا جس سے چاہو وصیت کر دو“ مسلم نے گرد پیش نظر ڈالی تو عمر بن سعد کو پہچانا۔ آپ نے اس سے کہا کہ تم قریش کے خاندان سے ہو۔ مجھے اس وقت تم سے کچھ راز کی باتیں کہنا ہیں، ذرا انھیں سن لو۔“ حکومت وقت کا خوشامدی سننے کے لیے نیا رنہ ہوا جس پر خود ابن زیاد نے کہا ”آخر سن لینے میں تمہارا

تھے اور زخموں سے پور تھے۔ انھوں نے پوچھا ”کیا واقعی مجھے امان ہے؟“ اس نے کہا ہاں آپ امان میں ہیں۔“ جتنے محمد بن اشعث کے ساتھی تھے ان سب نے بھی امان کا وعدہ کیا، سوا ایک عمرو بن عبید اللہ بن عباس سلی کے جس نے کہا میں اس بارے میں کچھ نہیں جانتا اور یہ کہہ کر وہ الگ ہٹ گیا۔ مسلم نے کہا۔ ”دیکھو تم نے مجھے امان دی ہے۔ اس لیے میں تلوار اپنی بنیام میں رکھتا ہوں اور اگر تم امان نہ دیتے تو میں کبھی اپنے کو تمہارے حوالے نہ کرتا۔ اتنی دیر میں ایک مرکب لایا گیا جس پر مسلم کو سوار کیا اور سپاہیوں نے گرد حلقہ کر کے آپ کی تلوار کمر سے نکال لی۔ یہ ہونا تھا کہ مسلم کا دل ٹوٹ گیا اور کہا۔ یہ پہلی غداری ہے محمد بن اشعث نے کہا۔ ”مجھے امید ہے کہ تمہیں کوئی خطرہ پیش نہ آئے گا“ مسلم نے کہا۔ ”اچھا تو میں ایک امید ہی ہے اور امان کا وعدہ تمہارا کیا ہوا؟ انا للہ وانا الیہ راجعون“ یہ کہہ کر رونے لگے۔ عمرو بن عبید اللہ بن عباس سلی جس نے پہلی وعدہ امان سے انکار کیا تھا کہنے لگا۔

”جو ایسی مہم کے لیے کھڑا ہوا ہو جس کے لیے تم کھڑے ہوئے تھے اسے خطرہ دیکھ کر رونا تو نہیں چاہیے“ مسلم نے کہا۔ ”واللہ میں اپنے لیے نہیں روتا۔ میں تو حسینؑ اور ان کے ساتھیوں کے لیے روتا ہوں جو میرے خط کو دیکھ کر کوفہ کی طرف روانہ ہو چکے ہوں گے۔“ پھر آپ محمد بن اشعث کی طرف متوجہ ہوئے۔ کہا۔ ”اے اللہ کے بندے! مجھے یقین ہے کہ تم مجھے امان دلوانے سے قاصر رہو گے۔ اب تم اتنا کرنا کہ ایک قاصد حسینؑ کے پاس بھیج دینا جو میری طرف سے ان سے جا کر کہہ دے کہ میں تو دشمنوں کے ہاتھوں میں گرفتار ہوں اور یقین ہے کہ شام ہونے کے پہلے تک قتل ہو چکوں گا۔ مگر آپ ادھر آنے کا قصد نہ کیجیے اور اہل کوفہ کے قریب میں نہ آئیے۔ ان کے تمام وعدے بالکل غلط اور قول و قرار جھوٹے ہیں۔“ ابن اشعث نے وعدہ کیا کہ میں ضرور قاصد روانہ کر دوں گا۔ اس کے بعد محمد بن اشعث جناب مسلم کو لے کر دارالامارہ کے دروازہ پر پہنچا اور پہلے خود اجازت لے

ابن زیاد نے کہا۔ ابن عقیل! تم یہاں آئے تھے لوگوں میں تفرقہ ڈالنے اور آپس میں فساد کرانے کہ ایک جماعت دوسری جماعت پر حملے کرے اور خانہ جنگی ہو۔" مسلم نے جواب دیا اور وہ جواب جس نے آخر تک حسینی مفاد و امت کی نوعیت کو ظاہر کر دیا۔ آپ نے فرمایا کہ نہیں میں اس لیے نہیں آیا تھا بلکہ اس ملک والوں نے یہ ظاہر کیا کہ تمہارے باپ نے ان کے نیک آدمیوں کو قتل کیا اور ان کے خون بہائے اور ان میں (اسلام کی سادگی کو مٹا کر) وہ افعال و اعمال رائج کیے جو کسریٰ و قیصر کی سنت میں داخل تھے تو ہم آئے۔ اس لیے کہ ان کے اخلاق و عادات کی اصلاح کریں اور ان کو عدالت و انصاف اور تعلیمات قرآن پر عمل پیرا ہونے کی دعوت دیں۔ واقعہ چوں کہ مسلم کا کوئی طرز عمل ان کے اس بیان کے خلاف ظاہر بھی نہیں ہوا تھا۔ لہذا یہ صفائی بغاوت کے الزام سے ان کے بری ہونے کے لیے کافی تھی مگر استبداد کے سامنے دلیل و برہان کام نہیں دیا کرتا۔ ابن زیاد نے حکم دیا کہ انھیں قصر کے بالاخانہ پر لے جایا جائے وہاں ان کی گردن قلم کی جائے اور پھر سر کے ساتھ ہی جسم کو بیچے گرا دیا جائے اور اس کے لیے دہی بکر بن حمران امیری جس کی تلوار سے جناب مسلم کے لب و دہن پر زخم آیا تھا نامزد کیا گیا۔ جناب مسلم انتہائی صبر و سکون سے تکبیر، استغفار اور صلوات کے اوراد کے ساتھ دارالامارہ کے کوٹھے پر تشریف لے گئے اور ان کے سر کو جدا کر کے جسم کو قصر سے نیچے پھینک دیا گیا۔ روزہ شنبہ ۸ رذی الحجہ ۶۰ سنہ ۶۰ جناب مسلم نے جنگ شروع کی اور روز پھر شنبہ ۹ رذی الحجہ کو شہادت پائی۔

اس کے بعد سے شہر میں خوف و دہشت کی عملداری اور رعب و ہیبت کا پورا دور دورہ تھا۔ لوگ گھروں سے نکلتا خطرناک سمجھتے تھے اس لیے ہر طرف متانہ تھا اور ایک کو ایک کی خبر نہ تھی۔

طبری ج ۶ ص ۲۱۲۔ ارشاد ۲۲۵۔ سنہ ۶۰ رذی الحجہ ۶۰ (الاجابار الطوال ص ۲۱۲)

طبری ج ۶ ص ۲۱۳۔ ارشاد ۲۲۶۔ سنہ ۶۰ طبری ج ۶ ص ۲۱۵۔ ارشاد۔ ۶۰ رذی الحجہ ۶۰ شہادت جناب مسلم کی تاریخ شنبہ ۸ رذی الحجہ ۶۰ سنہ ۶۰ رذی الحجہ ۶۰ (الاجابار الطوال ص ۲۱۲) یہ درست نہیں معلوم ہوتی۔

کیا حرج ہے؟ اس پر عمر سعد اٹھا اور مسلم کے ساتھ تھوڑی دور آگے بڑھ کر ایک ایسی جگہ بیٹھ گیا جہاں ابن زیاد کی نظر دونوں پر پڑ رہی ہو۔ جناب مسلم نے کہا۔ "مجھے ایک بات یہ کہنا ہے کہ میں جب سے کوفہ میں آیا ہوں سات سو درہم کا مقررہ صلہ ہو گیا ہوں۔ تم میرے بعد میری تلوار اور زرہ فروخت کر کے یہ قرضہ ادا کر دینا۔ دوسری بات یہ ہے کہ میرے قتل ہونے کے بعد میری لاش ابن زیاد سے مانگ لینا اور اسے دفن کر دینا۔ تیسرے یہ کہ امام حسینؑ کے پاس کسی کو بھیج کر اس کے ذریعہ سے میرے واقعہ کی اطلاع کر دینا تاکہ وہاں چلے جائیں اور اہل کوفہ کے قریب میں مستلزم ہوں۔"

مسلم نے بطور راز یہ باتیں کہی تھیں مگر بعد عمر سعد نے ابن زیاد کے پاس آ کر کہا۔ آپ جانتے ہیں مسلم نے مجھ سے کیا کہا؟ یہ یہ باتیں انھوں نے مجھ سے کی ہیں۔ یہ ایسا خطرناک رویہ تھا جسے ابن زیاد نے بھی برا جانا اور عرب کی یہ مثل زبان پر جاری کی کہ لا یخونک الامیین دلکن قد یوثمن الخاشن۔ "امانتدار آدمی کبھی خیانت نہیں کرتا مگر کبھی کبھی غلطی سے خائن کو امانتدار بنا دیا جاتا ہے۔" اس کے بعد اس نے ہر وصیت کے بارے میں اپنا فیصلہ سنایا۔ کہا۔ "تمہارے مال سے میں مطلب نہیں۔ وہ فروخت ہو کر تمہارا قرضہ ادا کر دیا جائے، اور حسینؑ کے بارے میں یہ ہے کہ اگر وہ ہماری طرف نہ آئے تو میں ان سے کوئی مطلب نہیں ہے مگر لاش، اس کے بارے میں ہم کوئی وعدہ کرنے کے لیے تیار نہیں کیونکہ تم نے ہماری مخالفت کی اور رعایا میں انتشار پیدا کیا لہذا ہم تمہاری لاش کے متعلق کسی احترام کے ذمہ دار نہیں ہیں۔"

اس وصیت اور اس کے جواب کے بعد جو گفتگو جناب مسلم اور ابن زیاد میں ہوئی ہے وہ خاص طور پر دیکھنے کے قابل ہے۔ دیکھنا چاہیے کہ مسلم پر تو بغاوت کا الزام عائد کیا جاتا ہے اس کے بارے میں مسلم کیا جواب دیتے ہیں اور اپنے کوفہ آنے کی نوعیت کیا بتلاتے ہیں۔

الاجابار الطوال ص ۲۱۲۔ ۲۱۳۔ سنہ ۶۰ طبری ج ۶ ص ۲۱۲

انیسواں باب : مکہ سے کر بلا تک

سفر امام حسینؑ . منازل سفر اور کر بلا میں ورود

کوفہ میں انقلابِ مسلم و آلِ نبی کی شہادت ایسب کچھ ہو گیا مگر ظاہر ہے کہ اس سب کی اطلاع بردقت مکہ میں کیونکر پہنچ سکتی تھی۔ حضرت امام حسینؑ کو مسلم کا خط پہنچ چکا تھا کہ یہاں تشریف لائیے۔ سب آپ کی اطاعت کے لیے تیار ہیں۔ یہ خط جنابِ مسلم نے عابس بن ابی شیبہ شاکری کے ہاتھ اپنی شہادت سے ستائیس دن پہلے ۱۲ ذی قعدہ کو لکھا تھا۔ اس خط کے پہنچنے کے بعد آپ کے لیے کوفہ کا سفر اختیار کرنا ضروری ہو گیا تھا۔ پھر بھی عام حالات میں اتنی جلدی کی ضرورت نہیں تھی کہ آپ حج کے دو ایک دن باقی رہنے کے باوجود حج کو ترک فرمادیں۔ اور مکہ سے نکل کھڑے ہوں۔ یہ غیر متبع صورت یقینی طور پر نہایت اہم ہنگامی اسباب کا پتہ دیتی ہے۔

آپ کی افتادِ طبیعت اور ذوقِ عبادت کا لازمی تقاضا بھی یہ تھا کہ آپ اس سال کے حج کو جو آپ کی زندگی میں آخری تھا مکمل فرما کر روانگی کا ارادہ کرتے لیکن ایک دم ہوا یہ کہ حج کی تکلیف میں دو دن باقی تھے کہ آپ نے حج کو عمرہ سے بدل کر معظمہ سے روانگی اختیار فرمائی۔ اس کے اسباب عام طور پر لوگوں کے سامنے کچھ نہ تھے کیونکہ حرمِ الہی کے اندر کوئی فوج و لشکر نہ تھا جسے سب دیکھتے مگر حاجیوں کے لباس میں فوج کے سپاہی آئے ہوئے تھے اور انھیں یہ ہدایت تھی کہ حسینؑ جس حال میں بھی ہوں ان کو گرفتار کر لو۔ یہ راز اس وقت کھلا جب آپ مکہ سے باہر

۱۰ طبری ج ۶ ص ۲۱۳ ۱۱ ارشاد صفحہ ۲۲

انتہا یہ تھی کہ وہی آلِ نبی بن عروہ جن کے ہمراہ رکاب ۱۲ ہزار مسلح سوار ہوتے تھے اور جن کے قتل کر دیے جانے کی غلط خبر پر دارالامارہ کھینچی ہوئی تلواروں کے حلقہ میں آگیا تھا رسیوں میں جکڑ کر بازار میں لائے جا رہے تھے اور وہاں آواز دے رہے تھے کہ کہاں ہیں میرے قبیلہ بنی مذحج کے بہادر! ہائے افسوس کہ اس وقت بنی مذحج مجھے نظر نہیں آتے! لیکن افسوس کوئی متنفس بھی ان کی طرف رخ کرتا نظر نہ آتا تھا۔

یہاں تک کہ ابن زیاد کے ترکی غلام نے اپنی تلوار سے ان کے سروں میں جھلائی کر دی۔ یہاں تک کہ ابن زیاد کے ترکہ غلام نے اپنی تلوار سے ان کے سروں میں جھلائی کر دی۔ ابن زیاد نے مسلم و آلِ نبی کے سر ہائے بریدہ آلِ نبی بن ابی جہم ہمدانی اور زبیر بن ابی جہم کے ہاتھ واقعہ کی مختصر روداد کے ساتھ روانہ کیے اور ان دونوں نے تفصیلات جا کر زبانی بھی بیان کیے۔ یزید نے جو اب اس کا زمانہ پر بڑی شاباشی دی اور لکھا کہ تم نے وہی کیا جس کی ہمیں تم سے امید تھی۔ اب خود حسینؑ بن علیؑ کے بارے میں تمہاری کارگزاری دیکھنا ہے۔

— — — — —

پھر بھی آپ کے لیے اپنے عمل کو امکانی تحفظات کے حدود سے آگے بڑھنے دینا روا نہیں تھا۔ آپ کے لیے مکہ سے فوراً علیحدگی اختیار کرنا ان خطرات کی بنا پر جو اس وقت یہاں پیدا ہو گئے تھے لازمی قرار پا چکا تھا۔ اس کے بعد آپ کہاں جاتے؟ عقلاً اسی جگہ کہ جہاں کے لوگ انتہائی اصرار کے ساتھ آپ کو بلا رہے تھے۔

اس صورت میں کئی شخص کا یہ پہلو آپ کے سامنے لانا کہ اس میں جان کا خطرہ ہے تحصیل حاصل اور فضول تھا۔

جان کا خطرہ تو تھا ہی مگر اس خطرہ کے ہوتے ہوئے کسی ایسی طرف جانا قرین مصلحت ہو سکتا تھا جہاں کا جانا "ناخواندہ مہمان" کی حیثیت رکھتا ہو یا ایسی جگہ جہاں کے لوگ الحاح و زاری کے ساتھ دعوت دے رہے تھے۔

خطرہ کے معنی کیا ہو سکتے تھے؟ یہی کہ جان جائے گی، مگر جان جانا تو ناگزیر تھی، پھر یہ جان ایک انسانی اور مذہبی فرض کی ادائیگی کے سلسلہ میں کیوں نہ جائے جس کا نام ہے وعدہ وفا۔ طالبان ہدایت پر اتمام حجت اور خلقِ خدا کی فریادری۔ اسی لیے جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے حضرت امام حسین نے ان لوگوں کے خیال کی کبھی رد نہیں کی جو اہل کوفہ پر بے اعتمادی کا اظہار کرتے تھے اور یہ نہیں کہا کہ مجھے ان سے امید ہے کہ وہ اب کی اپنی بات پر قائم رہیں گے مگر اسی کے ساتھ آپ نے ہمیشہ اپنی روانگی کو ان کی طرف ضروری بتلایا جیسا کہ فرزدق سے گفتگو میں جس کا تذکرہ ابھی آئیگا آپ نے فرمایا۔ خانہ کعبہ میں گرفتاری کا جو خطرہ تھا اس کا ایک حد تک یقینی قرینہ سامنے آگیا۔ اس وقت جب آپ کی مکہ سے روانگی کے موقع پر حاکم مکہ عمرو بن سعید بن العاص کی طرف سے ایک فوجی دستہ نے یحییٰ بن سعید کی قیادت میں بیرون شہر کر آپ سے مزاحمت کی اور آپ کو واپس لے جانا چاہا حضرت نے واپس جانے سے انکار کیا اور نتیجہ یہ ہوا کہ طرفین میں تھوڑی دیر آدینرش بھی ہوئی مگر امام حسین کے ساتھ والے پوری بہادری کے ساتھ مقابل جماعت کی مزاحمت کو

آچکے تھے اور فرزدق شاعر نے آپ سے راستے میں ملاقات کی اور پوچھا کہ فرزندِ رسول اتنی جلدی کس لیے کہ حج بھی نہ ہو سکا؟ امام نے جواب دیا کہ اگر میں اتنی جلدی نہ کرتا تو وہیں گرفتار کر لیا گیا ہوتا۔ بس یہ چیز وہ تھی جس نے امام حسین کو عراق کی طرف اس قدر تعجیل کے ساتھ روانگی پر مجبور کر دیا۔

نتیجہ آخر امام کے پیش نظر تھا یعنی شہادت جس پر آپ کی وہ تقریر گواہ ہے جو آپ نے مکہ معظمہ سے روانگی کے وقت فرمائی تھی۔ آپ نے کہا تھا کہ "موت فرزندِ آدم کے گلے کا ہار ہے اور مجھے اپنے اسلاف کی ملاقات کا اشتیاق ہے۔ اتنا ہی جتنا یعقوب کو یوسف سے ملنے کا اشتیاق تھا اور میرے لیے بہت اچھی ہے وہ جگہ جہاں میں کشتہ ہو کر گردن کا گویا میری آنکھوں میں پھر رہا ہے وہ سماں کہ میرے جوڑ بند کو صحرائی درندے جدا کر رہے ہیں کوئی چارو کا نہیں اس دن سے جو خطہ تقدیر میں گزر چکا۔ خدا کی مرضی میں ہم اہل بیت کی مرضی ہے۔ ہم اس کے امتحان پر صبر کرتے ہیں اور صابروں کے اجر کو حاصل کرتے ہیں۔ رسول سے ان کے جسم کے ٹکڑے الگ نہیں ہو سکتے۔ جو شخص ہمارے ساتھ اپنی جان کی قربانی پر آمادہ اور خدا سے ملاقات پر تیار ہو وہ ہمارے ساتھ سفر کرے۔ میں کل صبح کو انشاء اللہ روانہ ہو جاؤں گا۔ یہ تھی وہ تقریر جو آپ نے گرد و پیش کے لوگوں کے سامنے کی تھی۔ اس رات کو جس کی صبح ہوتے ہوئے آپ مکہ سے روانہ ہو گئے۔ اس کے علاوہ ایک واقعہ یہ ہے کہ اثنائے سفر میں آپ ہر منزل پر جنابِ یحییٰ اور ان کی شہادت کو یاد کرتے تھے اور فرماتے تھے کہ دنیا کی بے قدری کے لیے اللہ کے نزدیک یہ کافی ہے کہ اس دنیا میں یحییٰ بن زکریا کا سر قلم ہو کر نبی اسرائیل کے زنا کار کے سامنے بطور تحفہ بھیجا گیا۔

یہ بھی حقیقت میں اپنے مستقبل کی طرف ایک اشارہ ہی تھا جو آپ بار بار فرماتے تھے

لے طبری ج ۲ ص ۲۱۸ س ۳ یعنی دشمنانِ انسانیت س ۳ ارشاد ص ۲۱۸

اس کے معنی یہ ہوئے کہ مفسد نیک ہو اور نیت خیر اس کے بعد ہر چہ بادا باد۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ امام حسینؑ کسی کے وعدوں پر اعتماد کر کے منزل عمل میں گامزن نہیں ہوئے تھے بلکہ محض اللہ کے بھروسے پر اس کے عائد کردہ فرض کی تکمیل کے لیے امتحان گاہ عمل میں آگئے تھے۔
۲۔ تنصیح: اس جگہ میں کا ایک قافلہ آتا نظر آیا جس سے حضرت نے کچھ ادب اپنے اسباب اور ساتھیوں کی سواری کے لیے کرایہ پر لیے اور ان کے مالکوں سے فرمایا کہ تم میں سے جو عراق تک جانا چاہے اسے ہم پورا کر ایدیق گئے اور پھر کچھ انعام بھی عطا کریں گے اور جو راستے سے واپس جانا چاہے گا اسے ہم اتنی دور کا کرایہ دے کر واپس کر دیں گے۔ پتا چلے کہ لوگ ان میں سے حضرت کے ساتھ عراق تک جانے کے لیے تیار ہوئے۔

اس سے بھی ثابت ہوتا ہے کہ مکہ معظمہ سے آپ کی روانگی اچانک بغیر کسی تیاری کے ہوئی تھی اس لیے آپ اپنے ساتھیوں کے لیے مکہ معظمہ سے بار برداری اور سواری کا سامان بھی پورا نہیں فرما سکے تھے۔

اسی منزل پر عبداللہ بن جعفر اور یحییٰ بن سعید بن العاص نے امام سے آکر ملاقات کی۔ واقعہ یہ تھا کہ جب امام حسینؑ مکہ معظمہ سے روانہ ہوئے تھے اس وقت عبداللہ بن جعفر مدینہ میں تھے ظاہری حالات کی بنا پر امام کا مدینہ سے آنا اس خطرہ کے ماتحت ہوا تھا کہ وہاں کے حاکم کو یزید کا یہ فرمان پہنچ چکا تھا کہ اگر حسینؑ بیعت نہ کریں تو ان کا سر روانہ کیا جائے اور اب مکہ سے روانگی اس اندیشہ کی وجہ سے ہو رہی تھی کہ وہاں کچھ لوگ حاجیوں کے لباس میں بھیج دیے گئے تھے تاکہ جس طرح ممکن ہو حسینؑ کو قتل کر ڈالیں یا گرفتار کر کے شام کی سمت بھیج دیں۔ اس موقع پر عبداللہ بن جعفر نے عون و محمد اپنے دونوں فرزندوں کے ہاتھ امام کے نام بڑھائیجا کر میں آپ کو خدا کا واسطہ دیتا ہوں کہ آپ میرا خط دیکھتے ہی یہاں واپس آئیے کیونکہ اس طرف خدوہ آپ کا قصد ہے مجھے آپ کی ہالت اور آپ کے الہیت کے تباہ ہونے کا اندیشہ

رکنے پر تیار تھے اس لیے ان لوگوں کو پہننے پر مجبور ہونا پڑا اور قافلہ روانہ ہو گیا۔ دینوری نے لکھا ہے کہ خود عمرو بن سعید نے اس اندیشہ سے کہ صورت حال کچھ نازک نہ ہو جائے اپنے پولیس آفیسر کو واپس آنے کی ہدایت بھیج دی۔ یہ سہ شنبہ ۸ رذی الحجہ ۶۰ کا واقعہ ہے اور اسی روز کو ذہ میں ابن زیاد کی فوج سے جناب مسلم بن عقیل کا مقابلہ ہو رہا تھا اور دوسرے دن جبکہ وہ شہید ہوئے حضرت امام حسینؑ مکہ سے نکل کر وادی غربت میں راستہ طے فرما رہے تھے۔ آپ کے قیام مکہ کے دوران میں علاوہ آپ کے خاص خاص عزیزوں کے جو مدینہ سے ساتھ آئے تھے کچھ مخصوص افراد اہل حجاز میں سے اور کچھ اہل بصرہ میں سے آپ کی خدمت میں پہنچ گئے تھے۔ اب یہ سب آپ کے ساتھ ساتھ روانہ ہوئے۔

مکہ سے کربلا تک کے سفر میں حضرت امام حسینؑ نے جن منزلوں میں قیام کیا تھا ان کی تفصیل کے متعلق مورخین میں اختلاف ہے۔ جہاں تک تاریخی واقعات کی مدد سے ثابت ہوتا ہے ان کی ترتیب واقعات کے ساتھ ساتھ حسب ذیل ہے :-

۱۔ صفاح : یہ مکہ معظمہ سے روانگی کے بعد پہلی وہ جگہ ہے جس کا نام ملتا ہے۔ یہاں قیام نہیں ہوا بلکہ وہ گزر رہی ہیں فرزدق بن غالب شاعر سے ملاقات ہوئی۔ اور فرزدق نے کوفہ کی حالت بیان کی کہ لوگوں کے دل آپ کی طرف مگر تواریں ان کی بنی امیہ کے ساتھ ہوں گی۔ آپ نے فرمایا ”تم سچ کہتے ہو لیکن نہ بات اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ وہ جو چاہتا ہے کرتا ہے اور ہر دن وہ ایک نیا کرشمہ قدرت کا دکھاتا ہے۔ اللہ کی تقدیر اگر ہماری دلی خواہشوں کے مطابق ہو تو ہم اس کا شکر کریں گے اور ادا ئے شکر کے لیے اسی سے مدد کے طالب ہوں گے اور اگر قضائے الہی ہمارے مطلب میں سد راہ ہوئی تو انسان کے لیے یہی کیا کم ہے کہ اس کی نیت میں سچائی اور اس کے ضمیر میں پارسائی ہو۔“

۲۔ طبری ۶/۲۱۸-۲۱۹-۲۲۰-۲۲۱-۲۲۲-۲۲۳-۲۲۴-۲۲۵-۲۲۶-۲۲۷-۲۲۸-۲۲۹-۲۳۰-۲۳۱-۲۳۲-۲۳۳-۲۳۴-۲۳۵-۲۳۶-۲۳۷-۲۳۸-۲۳۹-۲۴۰-۲۴۱-۲۴۲-۲۴۳-۲۴۴-۲۴۵-۲۴۶-۲۴۷-۲۴۸-۲۴۹-۲۵۰-۲۵۱-۲۵۲-۲۵۳-۲۵۴-۲۵۵-۲۵۶-۲۵۷-۲۵۸-۲۵۹-۲۶۰-۲۶۱-۲۶۲-۲۶۳-۲۶۴-۲۶۵-۲۶۶-۲۶۷-۲۶۸-۲۶۹-۲۷۰-۲۷۱-۲۷۲-۲۷۳-۲۷۴-۲۷۵-۲۷۶-۲۷۷-۲۷۸-۲۷۹-۲۸۰-۲۸۱-۲۸۲-۲۸۳-۲۸۴-۲۸۵-۲۸۶-۲۸۷-۲۸۸-۲۸۹-۲۹۰-۲۹۱-۲۹۲-۲۹۳-۲۹۴-۲۹۵-۲۹۶-۲۹۷-۲۹۸-۲۹۹-۳۰۰-۳۰۱-۳۰۲-۳۰۳-۳۰۴-۳۰۵-۳۰۶-۳۰۷-۳۰۸-۳۰۹-۳۱۰-۳۱۱-۳۱۲-۳۱۳-۳۱۴-۳۱۵-۳۱۶-۳۱۷-۳۱۸-۳۱۹-۳۲۰-۳۲۱-۳۲۲-۳۲۳-۳۲۴-۳۲۵-۳۲۶-۳۲۷-۳۲۸-۳۲۹-۳۳۰-۳۳۱-۳۳۲-۳۳۳-۳۳۴-۳۳۵-۳۳۶-۳۳۷-۳۳۸-۳۳۹-۳۴۰-۳۴۱-۳۴۲-۳۴۳-۳۴۴-۳۴۵-۳۴۶-۳۴۷-۳۴۸-۳۴۹-۳۵۰-۳۵۱-۳۵۲-۳۵۳-۳۵۴-۳۵۵-۳۵۶-۳۵۷-۳۵۸-۳۵۹-۳۶۰-۳۶۱-۳۶۲-۳۶۳-۳۶۴-۳۶۵-۳۶۶-۳۶۷-۳۶۸-۳۶۹-۳۷۰-۳۷۱-۳۷۲-۳۷۳-۳۷۴-۳۷۵-۳۷۶-۳۷۷-۳۷۸-۳۷۹-۳۸۰-۳۸۱-۳۸۲-۳۸۳-۳۸۴-۳۸۵-۳۸۶-۳۸۷-۳۸۸-۳۸۹-۳۹۰-۳۹۱-۳۹۲-۳۹۳-۳۹۴-۳۹۵-۳۹۶-۳۹۷-۳۹۸-۳۹۹-۴۰۰-۴۰۱-۴۰۲-۴۰۳-۴۰۴-۴۰۵-۴۰۶-۴۰۷-۴۰۸-۴۰۹-۴۱۰-۴۱۱-۴۱۲-۴۱۳-۴۱۴-۴۱۵-۴۱۶-۴۱۷-۴۱۸-۴۱۹-۴۲۰-۴۲۱-۴۲۲-۴۲۳-۴۲۴-۴۲۵-۴۲۶-۴۲۷-۴۲۸-۴۲۹-۴۳۰-۴۳۱-۴۳۲-۴۳۳-۴۳۴-۴۳۵-۴۳۶-۴۳۷-۴۳۸-۴۳۹-۴۴۰-۴۴۱-۴۴۲-۴۴۳-۴۴۴-۴۴۵-۴۴۶-۴۴۷-۴۴۸-۴۴۹-۴۵۰-۴۵۱-۴۵۲-۴۵۳-۴۵۴-۴۵۵-۴۵۶-۴۵۷-۴۵۸-۴۵۹-۴۶۰-۴۶۱-۴۶۲-۴۶۳-۴۶۴-۴۶۵-۴۶۶-۴۶۷-۴۶۸-۴۶۹-۴۷۰-۴۷۱-۴۷۲-۴۷۳-۴۷۴-۴۷۵-۴۷۶-۴۷۷-۴۷۸-۴۷۹-۴۸۰-۴۸۱-۴۸۲-۴۸۳-۴۸۴-۴۸۵-۴۸۶-۴۸۷-۴۸۸-۴۸۹-۴۹۰-۴۹۱-۴۹۲-۴۹۳-۴۹۴-۴۹۵-۴۹۶-۴۹۷-۴۹۸-۴۹۹-۵۰۰-۵۰۱-۵۰۲-۵۰۳-۵۰۴-۵۰۵-۵۰۶-۵۰۷-۵۰۸-۵۰۹-۵۱۰-۵۱۱-۵۱۲-۵۱۳-۵۱۴-۵۱۵-۵۱۶-۵۱۷-۵۱۸-۵۱۹-۵۲۰-۵۲۱-۵۲۲-۵۲۳-۵۲۴-۵۲۵-۵۲۶-۵۲۷-۵۲۸-۵۲۹-۵۳۰-۵۳۱-۵۳۲-۵۳۳-۵۳۴-۵۳۵-۵۳۶-۵۳۷-۵۳۸-۵۳۹-۵۴۰-۵۴۱-۵۴۲-۵۴۳-۵۴۴-۵۴۵-۵۴۶-۵۴۷-۵۴۸-۵۴۹-۵۵۰-۵۵۱-۵۵۲-۵۵۳-۵۵۴-۵۵۵-۵۵۶-۵۵۷-۵۵۸-۵۵۹-۵۶۰-۵۶۱-۵۶۲-۵۶۳-۵۶۴-۵۶۵-۵۶۶-۵۶۷-۵۶۸-۵۶۹-۵۷۰-۵۷۱-۵۷۲-۵۷۳-۵۷۴-۵۷۵-۵۷۶-۵۷۷-۵۷۸-۵۷۹-۵۸۰-۵۸۱-۵۸۲-۵۸۳-۵۸۴-۵۸۵-۵۸۶-۵۸۷-۵۸۸-۵۸۹-۵۹۰-۵۹۱-۵۹۲-۵۹۳-۵۹۴-۵۹۵-۵۹۶-۵۹۷-۵۹۸-۵۹۹-۶۰۰-۶۰۱-۶۰۲-۶۰۳-۶۰۴-۶۰۵-۶۰۶-۶۰۷-۶۰۸-۶۰۹-۶۱۰-۶۱۱-۶۱۲-۶۱۳-۶۱۴-۶۱۵-۶۱۶-۶۱۷-۶۱۸-۶۱۹-۶۲۰-۶۲۱-۶۲۲-۶۲۳-۶۲۴-۶۲۵-۶۲۶-۶۲۷-۶۲۸-۶۲۹-۶۳۰-۶۳۱-۶۳۲-۶۳۳-۶۳۴-۶۳۵-۶۳۶-۶۳۷-۶۳۸-۶۳۹-۶۴۰-۶۴۱-۶۴۲-۶۴۳-۶۴۴-۶۴۵-۶۴۶-۶۴۷-۶۴۸-۶۴۹-۶۵۰-۶۵۱-۶۵۲-۶۵۳-۶۵۴-۶۵۵-۶۵۶-۶۵۷-۶۵۸-۶۵۹-۶۶۰-۶۶۱-۶۶۲-۶۶۳-۶۶۴-۶۶۵-۶۶۶-۶۶۷-۶۶۸-۶۶۹-۶۷۰-۶۷۱-۶۷۲-۶۷۳-۶۷۴-۶۷۵-۶۷۶-۶۷۷-۶۷۸-۶۷۹-۶۸۰-۶۸۱-۶۸۲-۶۸۳-۶۸۴-۶۸۵-۶۸۶-۶۸۷-۶۸۸-۶۸۹-۶۹۰-۶۹۱-۶۹۲-۶۹۳-۶۹۴-۶۹۵-۶۹۶-۶۹۷-۶۹۸-۶۹۹-۷۰۰-۷۰۱-۷۰۲-۷۰۳-۷۰۴-۷۰۵-۷۰۶-۷۰۷-۷۰۸-۷۰۹-۷۱۰-۷۱۱-۷۱۲-۷۱۳-۷۱۴-۷۱۵-۷۱۶-۷۱۷-۷۱۸-۷۱۹-۷۲۰-۷۲۱-۷۲۲-۷۲۳-۷۲۴-۷۲۵-۷۲۶-۷۲۷-۷۲۸-۷۲۹-۷۳۰-۷۳۱-۷۳۲-۷۳۳-۷۳۴-۷۳۵-۷۳۶-۷۳۷-۷۳۸-۷۳۹-۷۴۰-۷۴۱-۷۴۲-۷۴۳-۷۴۴-۷۴۵-۷۴۶-۷۴۷-۷۴۸-۷۴۹-۷۵۰-۷۵۱-۷۵۲-۷۵۳-۷۵۴-۷۵۵-۷۵۶-۷۵۷-۷۵۸-۷۵۹-۷۶۰-۷۶۱-۷۶۲-۷۶۳-۷۶۴-۷۶۵-۷۶۶-۷۶۷-۷۶۸-۷۶۹-۷۷۰-۷۷۱-۷۷۲-۷۷۳-۷۷۴-۷۷۵-۷۷۶-۷۷۷-۷۷۸-۷۷۹-۷۸۰-۷۸۱-۷۸۲-۷۸۳-۷۸۴-۷۸۵-۷۸۶-۷۸۷-۷۸۸-۷۸۹-۷۹۰-۷۹۱-۷۹۲-۷۹۳-۷۹۴-۷۹۵-۷۹۶-۷۹۷-۷۹۸-۷۹۹-۸۰۰-۸۰۱-۸۰۲-۸۰۳-۸۰۴-۸۰۵-۸۰۶-۸۰۷-۸۰۸-۸۰۹-۸۱۰-۸۱۱-۸۱۲-۸۱۳-۸۱۴-۸۱۵-۸۱۶-۸۱۷-۸۱۸-۸۱۹-۸۲۰-۸۲۱-۸۲۲-۸۲۳-۸۲۴-۸۲۵-۸۲۶-۸۲۷-۸۲۸-۸۲۹-۸۳۰-۸۳۱-۸۳۲-۸۳۳-۸۳۴-۸۳۵-۸۳۶-۸۳۷-۸۳۸-۸۳۹-۸۴۰-۸۴۱-۸۴۲-۸۴۳-۸۴۴-۸۴۵-۸۴۶-۸۴۷-۸۴۸-۸۴۹-۸۵۰-۸۵۱-۸۵۲-۸۵۳-۸۵۴-۸۵۵-۸۵۶-۸۵۷-۸۵۸-۸۵۹-۸۶۰-۸۶۱-۸۶۲-۸۶۳-۸۶۴-۸۶۵-۸۶۶-۸۶۷-۸۶۸-۸۶۹-۸۷۰-۸۷۱-۸۷۲-۸۷۳-۸۷۴-۸۷۵-۸۷۶-۸۷۷-۸۷۸-۸۷۹-۸۸۰-۸۸۱-۸۸۲-۸۸۳-۸۸۴-۸۸۵-۸۸۶-۸۸۷-۸۸۸-۸۸۹-۸۹۰-۸۹۱-۸۹۲-۸۹۳-۸۹۴-۸۹۵-۸۹۶-۸۹۷-۸۹۸-۸۹۹-۹۰۰-۹۰۱-۹۰۲-۹۰۳-۹۰۴-۹۰۵-۹۰۶-۹۰۷-۹۰۸-۹۰۹-۹۱۰-۹۱۱-۹۱۲-۹۱۳-۹۱۴-۹۱۵-۹۱۶-۹۱۷-۹۱۸-۹۱۹-۹۲۰-۹۲۱-۹۲۲-۹۲۳-۹۲۴-۹۲۵-۹۲۶-۹۲۷-۹۲۸-۹۲۹-۹۳۰-۹۳۱-۹۳۲-۹۳۳-۹۳۴-۹۳۵-۹۳۶-۹۳۷-۹۳۸-۹۳۹-۹۴۰-۹۴۱-۹۴۲-۹۴۳-۹۴۴-۹۴۵-۹۴۶-۹۴۷-۹۴۸-۹۴۹-۹۵۰-۹۵۱-۹۵۲-۹۵۳-۹۵۴-۹۵۵-۹۵۶-۹۵۷-۹۵۸-۹۵۹-۹۶۰-۹۶۱-۹۶۲-۹۶۳-۹۶۴-۹۶۵-۹۶۶-۹۶۷-۹۶۸-۹۶۹-۹۷۰-۹۷۱-۹۷۲-۹۷۳-۹۷۴-۹۷۵-۹۷۶-۹۷۷-۹۷۸-۹۷۹-۹۸۰-۹۸۱-۹۸۲-۹۸۳-۹۸۴-۹۸۵-۹۸۶-۹۸۷-۹۸۸-۹۸۹-۹۹۰-۹۹۱-۹۹۲-۹۹۳-۹۹۴-۹۹۵-۹۹۶-۹۹۷-۹۹۸-۹۹۹-۱۰۰۰-۱۰۰۱-۱۰۰۲-۱۰۰۳-۱۰۰۴-۱۰۰۵-۱۰۰۶-۱۰۰۷-۱۰۰۸-۱۰۰۹-۱۰۱۰-۱۰۱۱-۱۰۱۲-۱۰۱۳-۱۰۱۴-۱۰۱۵-۱۰۱۶-۱۰۱۷-۱۰۱۸-۱۰۱۹-۱۰۲۰-۱۰۲۱-۱۰۲۲-۱۰۲۳-۱۰۲۴-۱۰۲۵-۱۰۲۶-۱۰۲۷-۱۰۲۸-۱۰۲۹-۱۰۳۰-۱۰۳۱-۱۰۳۲-۱۰۳۳-۱۰۳۴-۱۰۳۵-۱۰۳۶-۱۰۳۷-۱۰۳۸-۱۰۳۹-۱۰۴۰-۱۰۴۱-۱۰۴۲-۱۰۴۳-۱۰۴۴-۱۰۴۵-۱۰۴۶-۱۰۴۷-۱۰۴۸-۱۰۴۹-۱۰۵۰-۱۰۵۱-۱۰۵۲-۱۰۵۳-۱۰۵۴-۱۰۵۵-۱۰۵۶-۱۰۵۷-۱۰۵۸-۱۰۵۹-۱۰۶۰-۱۰۶۱-۱۰۶۲-۱۰۶۳-۱۰۶۴-۱۰۶۵-۱۰۶۶-۱۰۶۷-۱۰۶۸-۱۰۶۹-۱۰۷۰-۱۰۷۱-۱۰۷۲-۱۰۷۳-۱۰۷۴-۱۰۷۵-۱۰۷۶-۱۰۷۷-۱۰۷۸-۱۰۷۹-۱۰۸۰-۱۰۸۱-۱۰۸۲-۱۰۸۳-۱۰۸۴-۱۰۸۵-۱۰۸۶-۱۰۸۷-۱۰۸۸-۱۰۸۹-۱۰۹۰-۱۰۹۱-۱۰۹۲-۱۰۹۳-۱۰۹۴-۱۰۹۵-۱۰۹۶-۱۰۹۷-۱۰۹۸-۱۰۹۹-۱۱۰۰-۱۱۰۱-۱۱۰۲-۱۱۰۳-۱۱۰۴-۱۱۰۵-۱۱۰۶-۱۱۰۷-۱۱۰۸-۱۱۰۹-۱۱۱۰-۱۱۱۱-۱۱۱۲-۱۱۱۳-۱۱۱۴-۱۱۱۵-۱۱۱۶-۱۱۱۷-۱۱۱۸-۱۱۱۹-۱۱۲۰-۱۱۲۱-۱۱۲۲-۱۱۲۳-۱۱۲۴-۱۱۲۵-۱۱۲۶-۱۱۲۷-۱۱۲۸-۱۱۲۹-۱۱۳۰-۱۱۳۱-۱۱۳۲-۱۱۳۳-۱۱۳۴-۱۱۳۵-۱۱۳۶-۱۱۳۷-۱۱۳۸-۱۱۳۹-۱۱۴۰-۱۱۴۱-۱۱۴۲-۱۱۴۳-۱۱۴۴-۱۱۴۵-۱۱۴۶-۱۱۴۷-۱۱۴۸-۱۱۴۹-۱۱۵۰-۱۱۵۱-۱۱۵۲-۱۱۵۳-۱۱۵۴-۱۱۵۵-۱۱۵۶-۱۱۵۷-۱۱۵۸-۱۱۵۹-۱۱۶۰-۱۱۶۱-۱۱۶۲-۱۱۶۳-۱۱۶۴-۱۱۶۵-۱۱۶۶-۱۱۶۷-۱۱۶۸-۱۱۶۹-۱۱۷۰-۱۱۷۱-۱۱۷۲-۱۱۷۳-۱۱۷۴-۱۱۷۵-۱۱۷۶-۱۱۷۷-۱۱۷۸-۱۱۷۹-۱۱۸۰-۱۱۸۱-۱۱۸۲-۱۱۸۳-۱۱۸۴-۱۱۸۵-۱۱۸۶-۱۱۸۷-۱۱۸۸-۱۱۸۹-۱۱۹۰-۱۱۹۱-۱۱۹۲-۱۱۹۳-۱۱۹۴-۱۱۹۵-۱۱۹۶-۱۱۹۷-۱۱۹۸-۱۱۹۹-۱۲۰۰-۱۲۰۱-۱۲۰۲-۱۲۰۳-۱۲۰۴-۱۲۰۵-۱۲۰۶-۱۲۰۷-۱۲۰۸-۱۲۰۹-۱۲۱۰-۱۲۱۱-۱۲۱۲-۱۲۱۳-۱۲۱۴-۱۲۱۵-۱۲۱۶-۱۲۱۷-۱۲۱۸-۱۲۱۹-۱۲۲۰-۱۲۲۱-۱۲۲۲-۱۲۲۳-۱۲۲۴-۱۲۲۵-۱۲۲۶-۱۲۲۷-۱۲۲۸-۱۲۲۹-۱۲۳۰-۱۲۳۱-۱۲۳۲-۱۲۳۳-۱۲۳۴-۱۲۳۵-۱۲۳۶-۱۲۳۷-۱۲۳۸-۱۲۳۹-۱۲۴۰-۱۲۴۱-۱۲۴۲-۱۲۴۳-۱۲۴۴-۱۲۴۵-۱۲۴۶-۱۲۴۷-۱۲۴۸-۱۲۴۹-۱۲۵۰-۱۲۵۱-۱۲۵۲-۱۲۵۳-۱۲۵۴-۱۲۵۵-۱۲۵۶-۱۲۵۷-۱۲۵۸-۱۲۵۹-۱۲۶۰-۱۲۶۱-۱۲۶۲-۱۲۶۳-۱۲۶۴-۱۲۶۵-۱۲۶۶-۱۲۶۷-۱۲۶۸-۱۲۶۹-۱۲۷۰-۱۲۷۱-۱۲۷۲-۱۲۷۳-۱۲۷۴-۱۲۷۵-۱۲۷۶-۱۲۷۷-۱۲۷۸-۱۲۷۹-۱۲۸۰-۱۲۸۱-۱۲۸۲-۱۲۸۳-۱۲۸۴-۱۲۸۵-۱۲۸۶-۱۲۸۷-۱۲۸۸-۱۲۸۹-۱۲۹۰-۱۲۹۱-۱۲۹۲-۱۲۹۳-۱۲۹۴-۱۲۹۵-۱۲۹۶-۱۲۹۷-۱۲۹۸-۱۲۹۹-۱۳۰۰-۱۳۰۱-۱۳۰۲-۱۳۰۳-۱۳۰۴-۱۳۰۵-۱۳۰۶-۱۳۰۷-۱۳۰۸-۱۳۰۹-۱۳۱۰-۱۳۱۱-۱۳۱۲-۱۳۱۳-۱۳۱۴-۱۳۱۵-۱۳۱۶-۱۳۱۷-۱۳۱۸-۱۳۱۹-۱۳۲۰-۱۳۲۱-۱۳۲۲-۱۳۲۳-۱۳۲۴-۱۳۲۵-۱۳۲۶-۱۳۲۷-۱۳۲۸-۱۳۲۹-۱۳۳۰-۱۳۳۱-۱۳۳۲-۱۳۳۳-۱۳۳۴-۱۳۳۵-۱۳۳۶-۱۳۳۷-۱۳۳۸-۱۳۳۹-۱۳۴۰-۱۳۴۱-۱۳۴۲-۱۳۴۳-۱۳۴۴-۱۳۴۵-۱۳۴۶-۱۳۴۷-۱۳۴۸-۱۳۴۹-۱۳۵۰-۱۳۵۱-۱۳۵۲-۱۳۵۳-۱۳۵۴-۱۳۵۵-۱۳۵۶-۱۳۵۷-۱۳۵۸-۱۳۵۹-۱۳۶۰-۱۳۶۱-۱۳۶۲-۱۳۶۳-۱۳۶۴-۱۳۶۵-۱۳۶۶-۱۳۶۷-۱۳۶۸-۱۳۶۹-۱۳۷۰-۱۳۷۱-۱۳۷۲-۱۳۷۳-۱۳۷۴-۱۳۷۵-۱۳۷۶-۱۳۷۷-۱۳۷۸-۱۳۷۹-۱۳۸۰-۱۳۸۱-۱۳۸۲-۱۳۸۳-۱۳۸۴-۱۳۸۵-۱۳۸۶-۱۳۸۷-۱۳۸۸-۱۳۸۹-۱۳۹۰-۱۳۹۱-۱۳۹۲-۱۳۹۳-۱۳۹۴-۱۳۹۵-۱۳۹۶-۱۳۹۷-۱۳۹۸-۱۳۹۹-۱۴۰۰-۱۴۰۱-۱۴۰۲-۱۴۰۳-۱۴۰۴-۱۴۰۵-۱۴۰۶-۱۴۰۷-۱۴۰۸-۱۴۰۹-۱۴۱۰-۱۴۱۱-۱۴۱۲-۱۴۱۳-۱۴۱۴-۱۴۱۵-۱۴۱۶-۱۴۱۷-۱۴۱۸-۱۴۱۹-۱۴۲۰-۱۴۲۱-۱۴۲۲-۱۴۲۳-۱۴۲۴-۱۴۲۵-۱۴۲۶-۱۴۲۷-۱۴۲۸-۱۴۲۹-۱۴۳۰-۱۴۳۱-۱۴۳۲-۱۴۳۳-۱۴۳۴-۱۴۳۵-۱۴۳۶-۱۴۳۷-۱۴۳۸-۱۴۳۹-۱۴۴۰-۱۴۴۱-۱۴۴۲-۱۴۴۳-۱۴۴۴-۱۴۴۵-۱۴۴۶-۱۴۴۷-۱۴۴۸-۱۴۴۹-۱۴۵۰-۱۴۵۱-۱۴۵۲-۱۴۵۳-۱۴۵۴-۱۴۵۵-۱۴۵۶-۱۴۵۷-۱۴۵۸-۱۴۵۹-۱۴۶۰-۱۴۶۱-۱۴۶۲-۱۴۶۳-۱۴۶۴-۱۴۶۵-۱۴۶۶-۱۴۶۷-۱۴۶۸-۱۴۶۹-۱۴۷۰-۱۴۷۱-۱۴۷۲-۱۴۷۳-۱۴۷۴-۱۴۷۵-۱۴۷۶-۱۴۷۷-۱۴۷۸-۱۴۷۹-۱۴۸۰-۱۴۸۱-۱۴۸۲-۱۴۸۳-۱۴۸۴-۱۴۸۵-۱۴۸۶-۱۴۸۷-۱۴۸۸-۱۴۸۹-۱۴۹۰-۱۴۹۱-۱۴۹۲-۱۴۹۳-۱۴۹۴-۱۴۹۵-۱۴۹۶-۱۴۹۷-۱۴۹۸-۱۴۹۹-۱۵۰۰-۱۵۰۱-۱۵۰۲-۱۵۰۳-۱۵۰۴-۱۵۰۵-۱۵۰۶-۱۵۰۷-۱۵۰۸-۱۵۰۹-۱۵۱۰-۱۵۱۱-۱۵۱۲-۱۵۱۳-۱۵۱۴-۱۵۱۵-۱۵۱۶-۱۵۱۷-۱۵۱۸-۱۵۱۹-۱۵۲۰-۱۵۲۱-۱۵۲۲-۱۵۲۳-۱۵۲۴-۱۵۲۵-۱۵۲۶-۱۵۲۷-۱۵۲۸-۱۵۲۹-۱۵۳۰-۱۵۳۱-۱۵۳۲-۱۵۳۳-۱۵۳۴-۱۵۳۵-۱۵۳۶-۱۵۳۷-۱۵۳۸-۱۵۳۹-۱۵۴۰-۱۵۴۱-۱۵۴۲-۱۵۴۳-۱۵۴۴-۱۵۴۵-۱۵۴۶-۱۵۴۷-۱۵۴۸-۱۵۴۹-۱۵۵۰-۱۵۵۱-۱۵۵۲-۱۵۵۳-۱۵۵۴-۱۵۵۵-۱۵۵۶-۱۵۵۷-۱۵۵۸-۱۵۵۹-۱۵۶۰-۱۵۶۱-۱۵۶۲-۱۵۶۳-۱۵۶۴-۱۵۶۵-۱۵۶۶-۱۵۶۷-۱۵۶۸-۱۵۶۹-۱۵۷۰-۱۵۷۱-۱۵۷۲-۱۵۷۳-۱۵۷۴-۱۵۷۵-۱۵۷۶-۱۵۷۷-۱۵۷۸-۱۵۷۹-۱۵۸۰-۱۵۸۱-۱۵۸۲-۱۵۸۳-۱۵۸۴-۱۵۸۵-۱۵۸۶-۱۵۸۷-۱۵۸۸-۱

کے ساتھ ساتھ تھے۔ اہل کوفہ کے نام خط دے کر انہیں فرمایا۔ اس خط کا مضمون یہ تھا:-
 ”بیخط ہے حسین بن علی کا برادران الیانی واسلامی کے نام۔ بعد سلام اور حمد الہی کے
 معلوم ہو کہ تسم بن عقیل کے خط سے مجھے تمہارے رسالت کی درستی اور میری نصرت پر
 تم لوگوں کی ہم آہنگی کا علم ہوا جس پر میں نے خدا سے دعا کی کہ وہ ہمارے معاملہ کو
 بہترین صورت پر انجام تک پہنچائے اور تم کو اس کے متعلق بہترین اجر عطا فرمائے۔
 میں مکہ معظمہ سے روز شنبہ ۸ رزی الحجہ کو روانہ ہو گیا ہوں جب میرا خط تمہیں پہنچے تو
 انتظامات مکمل اور تیزی سے اپنا نظام درست کر لیتا کیونکہ چند ہی روز میں میں تمہارے
 یہاں پہنچنے والا ہوں۔ انشاء اللہ۔ والسلام۔“

بعض کا قول ہے کہ اس خط کو عبداللہ بن لقیطہ کے ہاتھ بھیجا تھا۔ اس خط کے مضمون اور
 نوعیت سے صاف ظاہر ہے کہ مکہ سے نکلنے کے بعد یہ سب سے پہلی منزل ایسی منزل تھی جہاں
 اطمینان کی سانس لی جاسکتی تھی ورنہ اس خط کو پہلے ہی روانہ کر دیا جاتا۔

قیس اس خط کو لے کر کوفہ کی طرف روانہ ہوئے مگر جب قادیسیہ پہنچے تو حصین کی فوج
 نے گرفتار کر لیا اور انھیں ابن زیاد کے پاس بھیج دیا۔ ابن زیاد نے کہا کہ اگر جوان بچا چاہتے ہو
 تو منبر پر جا کر حسین بن علی کے خلاف تفریہ کرو اور ان کی مذمت بیان کرو۔ قیس یہ سنکر
 منبر پر چلے گئے۔ مجمع مہذب گوش تھا کہ دیکھیں حسین کا فاصد حسین کے خلاف کیا کہتا ہے
 مگر انھوں نے مقصد امام کی اشاعت کا یہ ایک ممکن موقع پیدا کیا تھا۔ حمد و ثنائے الہی کے
 بعد مجمع کو مخاطب کیا اور کہا:-

”ایہا الناس! اس وقت خلق خدا میں بہترین شخص حسین بن علی ہیں جو رسول کی بیٹی

حضرت فاطمہ کے فرزند ہیں۔ میں انہی کا بھیجا ہوا تمہارے پاس آیا ہوں۔ تمہارا فرض

ہے کہ ان کی نصرت کے لیے قدم آگے بڑھاؤ اور ان کی آواز پر لبیک کہو۔“

۱۔ الاخبار الطوال ۲۴۵ ۲۔ الاخبار الطوال ۲۴۵ ۳۔ طبری ج ۵ ۴۔ ۲۲۲۔ ارشاد صفحہ ۲۳ ۵۔ ارشاد صفحہ ۲۳

ہے اور اگر آپ دنیا سے اٹھ گئے تو زمین کی روشنی رخصت ہو گئی کیونکہ آپ طالبان ہدایت کے
 لیے نشان راہ اور مومنین کی امیدوں کا مرکز ہیں۔ سفر میں جلدی نہ کیجیے۔ میں خود اس خط کے
 پیچھے آ رہا ہوں۔ عون و محمد یہ خط لے کر امام کے قافلہ سے راستے میں جا کر ملحق ہوئے۔ اس
 کے بعد عبداللہ بن جعفر، حاکم مدینہ عمر بن سعید بن العاص کے پاس گئے اور اس سے گفتگو
 کر کے ایک امان کا پروانہ امام حسین کے لیے حاصل کرنے میں کامیاب ہوئے۔ عبداللہ کی خواہش
 کے مطابق عمر بن سعید نے اس پر ٹھہر کی اور اپنے بھائی یحییٰ بن سعید کو عبداللہ کے ساتھ کیا۔

عبداللہ یحییٰ کے ساتھ اس تحریر کو لیے ہوئے مدینہ سے روانہ ہوئے اور راستے میں امام سے ملحق
 ہو کر تحریر آپ کے سامنے پیش کی۔ آپ خوب جانتے تھے کہ مرکزی حکومت کی پالیسی کے خلاف
 ایک مقامی حاکم کے امان نامہ کی کیا وقعت ہے۔ آپ نے عبداللہ بن جعفر کی رائے سے اختلاف

کیا اور فرمایا کہ مجھے اب یہاں قیام کرنا مناسب نہیں ہے اور عمر بن سعید کے نام اس تحریر
 کا جواب لکھ کر ان کے سپرد کیا۔ عبداللہ کچھ مجبوریل کی وجہ سے اس سفر میں ساتھ نہ جاسکتے
 تھے۔ انھوں نے عون و محمد کو حضرت کے ساتھ رہنے کی ہدایت کی اور خود مدینہ واپس ہو گئے۔

۳۔ ذات عراق: شیخ مفید نے عبداللہ بن جعفر اور یحییٰ بن سعید کی واپسی کا ذکر کرتے
 کے بعد لکھا ہے کہ حضرت امام حسین تیزی کے ساتھ عراق کی سمت راہ قطع کرتے رہے
 یہاں تک کہ ذات عراق میں پہنچ کر قیام فرمایا۔

۴۔ بطن الرمة اور حاجر: ”بطن الرمة“ ایک وادی کا نام تھا جس کے ایک مقام
 کا نام ”حاجر“ ہے۔ اس منزل سے آپ نے قیس بن مسہر کو جو اہل کوفہ کے فرستادہ آپ

لے عمر بن سعید مکہ اور مدینہ کا مشترکہ حاکم تھا۔ بظاہر جب وقت امام روانہ ہوئے اس وقت عمر بن سعید اور اس کا
 بھائی یحییٰ بن سعید دونوں مکہ میں موجود تھے اور یحییٰ کی قیادت میں ایک دستہ نے اگر امام کا راستہ رکھا۔ اس کے بعد امام
 عراق کے راستے پر روانہ ہوئے اور یہ دونوں مدینہ چلے گئے۔ وہاں عبداللہ بن جعفر نے عمر بن سعید سے ملاقات کر کے
 بیخط حاصل کیا اور یحییٰ بن سعید کے ساتھ امام سے منزل تنعیم پر ملاقات کی۔ ۱۔ طبری ج ۶ ۲۔ ۱۹۹۔ ارشاد صفحہ ۲۴

وہ ہیں سے علیحدہ ہو جائے۔ چنانچہ ساتھ والے سب علیحدہ ہو گئے۔ یہ صورت حال سے صاف ظاہر ہے کہ امام کی گفتگو ہمیں سے کچھ خوش آئند توقعات یا امید افزا تصورات پر مبنی نہ تھی بلکہ صفائی کے ساتھ اس انجام کار کا انکشاف کر دیا گیا تھا جس پر ابھی تک عام نگاہوں میں توقعات کے پردے پڑے ہوئے تھے۔ کیا اس کے بعد بھی یہ سمجھا جاسکتا ہے کہ حضرت امام حسینؑ کسی غلط فہمی میں مبتلا ہو کر منزلِ علیؑ میں گامزن ہوئے تھے۔ پھر بھی چونکہ عوام بالکل ظاہرین ہوتے ہیں لہذا ان کے توقعات امام کی نسبت بہت خوش آئند تھے۔ وہ سمجھتے تھے کہ فرزندِ رسولؐ اپنے باپ بھائی کے پایہ تخت اور عراق ایسے مردم خیز صوبہ کے صدر مرکز کو فز کی طرف خود وہیں کے باشندوں کے اصرار و طلب پر جاتا ہے ہیں دہاں پہنچ کر تخت و تاج، فرج و لشکر اور خشم و خدام سب کچھ ہتیا ہوگا۔ حضرت شاہِ عراق تسلیم کیے جائیں گے اور اپنی ذات میں امامت و سلطنت دوش بدوش جمع ہوگی۔ ان خیالات کو پیش نظر رکھ کر دنیا کے لالچی لوگ بھی جوق در جوق آپ کے ساتھ شامل ہو رہے تھے اور راستے میں آپ کا وہ مختصر قافلہ جو مکہ سے نکلنے وقت خاص خاص لوگوں پر مشتمل تھا اب ایک مختصر لشکر کی صورت اختیار کر چکا تھا اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ بیشک کوئی بادشاہ ہے جو اپنے مرکزِ سلطنت کی طرف جارہا ہے لیکن زرد سب سے پہلا وہ مقام تھا جہاں سے روانہ ہونے پر پریشانی کا آغاز ہوا جبکہ عبداللہ بن سلیم اور نذری بن شمعل دونوں اسدی شخصوں نے جو مکہ معظمہ سے فراغت حج کے بعد بہت تیزی سے روانہ ہو کر زرد میں حضرت سے ملحق ہو گئے تھے۔ ایک شخص کو فز کی طرف سے آتے دیکھا۔ امام اس کو دیکھتے ہی ٹھہر گئے تھے کہ کچھ حالات کو فز کے معلوم کریں لیکن اس نے حسینی قافلہ کو دیکھ کر رخ دوسری جانب کر دیا لہذا امام آگے بڑھ گئے۔ ان دونوں اسدی شخصوں نے آپس میں مشورہ کیا کہ اس سے کچھ کو فز کے حالات دریافت کرنا چاہئیں۔ چنانچہ یہ دونوں قافلہ سے جدا ہو کر انتہائی تیز رفتاری

ابن زیاد غضب ناک ہوا اور اس نے حکم دیا کہ انھیں قصر کے اوپر سے زمین پر گرادو۔ بے رحموں نے انھیں نیچے گرا دیا جس سے ان کے اعضا رچکنا چوک ہو گئے۔ یہ جب آپ اس منزل سے آگے بڑھے تو ایک چشمہ پر عبداللہ بن مطیع سے ملاقات ہوئی جو عراق سے واپس ہو رہے تھے۔ انھوں نے بھی آپ سے مکہ چھوڑنے کا سبب دریافت کیا اور اہل کو فز کی دعوت کا حال سنا کر دوسرے تمام مشورہ دینے والوں کی طرح آپ کے کو فز جانے سے اختلاف کیا۔ ۵۔ زرد: اس منزل سے قریب جو چشمہ تھا اس پر زہیر بن القین کا خیمہ نصب تھا۔ یہ رج کر کے مکہ سے واپس ہوئے تھے اور کو فز جارہے تھے۔ شروع میں ان کو خاندانِ رسولؐ سے کوئی عقیدت نہ تھی بلکہ عام طور پر وہ اہل شام کے ہم عقیدہ سمجھے جاتے تھے جس کی اس زمانہ میں عثمانی مسلک کہا جاتا تھا۔ مگر امام حسینؑ کی نباضِ فطرت و بصیرت انکی باطنی استعداد کو دیکھ رہی تھی۔ آپ نے ان کے پاس پیغام بھیجا کہ میں تم سے ملنا چاہتا ہوں۔ خاندانِ رسولؐ سے جو وحشت عام طور سے اس گروہ میں پیدا کر دی گئی تھی اس کی بنا پر انھوں نے ملنے سے انکار کر دینا چاہا مگر ان کی بیوی نے جو ان کے ساتھ تھیں کہا کہ وہ کیا غضب کی بات ہے کہ رسولؐ کا فرزند تمہارے پاس پیغام ملاقات بھیجے اور تم مسترد کر دو۔ اس بات سے متاثر ہو کر یہ امام حسینؑ کے پاس گئے اور کچھ اس طرح صفائی سے ان کے سامنے امام حسینؑ نے اپنے معاملہ کو پیش کیا کہ وہ ہمہ تن آپ کے موافق ہو گئے اور بڑے خوش خوش اپنی قیام گاہ پر پہنچ کر انھوں نے حکم دیا کہ ہمارا خیمہ یہاں سے لکھاڑ کر اصحابِ حسینؑ کے خیموں کے پاس لگا دیا جائے۔ اس کے بعد انھوں نے اپنی بیوی کو طلاق دے دیا اور ان سے کہا کہ وہ اپنے بھائی کے ساتھ میکے چلی جائیں پھر ساتھ ہوں سے مخاطب ہو کر کہا کہ میں نے امام حسینؑ کے ساتھ مرنے کا مضبوط ارادہ کر لیا ہے جو شخص تم میں سے ہمارے ساتھ شہید ہونا چاہے وہ میرے ساتھ رہے اور جو نہ چاہے

ہے اور اگر آپ دنیا سے اٹھ گئے تو زمین کی روشنی رخصت ہو گئی کیونکہ آپ طالبان ہدایت کے لیے نشان راہ اور مومنین کی امیدوں کا مرکز ہیں۔ سفر میں جلدی نہ کیجیے۔ میں خود اس خط کے پیچھے آ رہا ہوں۔ عون و محمد بیخاطر کے امام کے قافلہ سے راستے میں جا کر ملحق ہوئے۔ اہل کے بعد عبداللہ بن جعفر، حاکم مدینہ عمر بن سعید بن العاص کے پاس گئے اور اس سے گفتگو کر کے ایک امان کا پروانہ امام حسین کے لیے حاصل کرنے میں کامیاب ہوئے۔ عبداللہ کی خواہش کے مطابق عمر بن سعید نے اس پر مہر کی اور اپنے بھائی یحییٰ بن سعید کو عبداللہ کے ساتھ کیا۔ عبداللہ یحییٰ کے ساتھ اس تحریر کو لیے ہوئے مدینہ سے روانہ ہوئے اور راستے میں امام سے ملحق ہو کر تحریر آپ کے سامنے پیش کی۔ آپ خوب جانتے تھے کہ مرکزی حکومت کی پالیسی کے خلاف ایک مقامی حاکم کے امان نامہ کی کیا وقعت ہے۔ آپ نے عبداللہ بن جعفر کی رائے سے اختلاف کیا اور فرمایا کہ مجھے اب یہاں قیام کرنا مناسب نہیں ہے اور عمر بن سعید کے نام اہل تحریر کا جواب لکھ کر ان کے سپرد کیا۔ عبداللہ کچھ مجبوریل کی وجہ سے اس سفر میں ساتھ نہ جاسکتے تھے۔ انھوں نے عون و محمد کو حضرت کے ساتھ رہنے کی ہدایت کی اور خود مدینہ واپس ہوئے۔

۳۔ ذات عراق : شیخ مفید نے عبداللہ بن جعفر اور یحییٰ بن سعید کی داپسی کا ذکر کرنے کے بعد لکھا ہے کہ حضرت امام حسین تیزی کے ساتھ عراق کی سمت راہ قطع کرتے رہے یہاں تک کہ ذات عراق میں پہنچ کر قیام فرمایا۔

۴۔ بطن الرمرہ اور حاجرہ : "بطن الرمرہ" ایک وادی کا نام تھا جس کے ایک مقام کا نام "حاجرہ" ہے۔ اس منزل سے آپ نے قیس بن مسرہ کو جواب کوذہ کے فرستادہ آپ لے عمر بن سعید مکہ اور مدینہ کا مشترکہ حاکم تھا۔ بظاہر ہر وقت اہم روانہ ہوئے اس وقت عمر بن سعید واپس کا بھائی یحییٰ بن سعید دونوں مکہ میں موجود تھے اور یحییٰ کی قیادت میں ایک دستہ نے اکراہ کا راستہ روکا۔ اس کے بعد امام عراق کے راستے پر روانہ ہوئے اور یہ دونوں مدینہ چلے گئے۔ وہاں عبداللہ بن جعفر نے عمر بن سعید ملاقات کے بیخاطر حاصل کیا اور یحییٰ بن سعید کے ساتھ امام سے منزل تنعیم پر ملاقات کی۔ ۱۹ ج ۷۔ ارشاد ۲۲۵

کے ساتھ ساتھ تھے۔ اہل کوذہ کے نام خط در۔ کر روانہ فرمایا۔ اس خط کا مضمون یہ تھا۔

"بیخاطر ہے حسین بن علی کا برادران ایمانی و اسلامی کے نام۔ بعد سلام اور حمد الہی کے معلوم ہو کہ مسلم بن عقیل کے خط سے مجھے تمہارے حالات کی درست اور میری نصرت پر تم لوگوں کی ہم آہنگی کا علم ہوا جس پر میں نے خدا سے دعا کی کہ وہ ہمارے معاملہ کو بہترین صورت پر انجام تک پہنچائے اور تم کو اس کے متعلق بہترین اجر عطا فرمائے۔ میں مکہ معظمہ سے روز شنبہ ۸ رذی الحجہ کو روانہ ہو گیا ہوں جب میرا خط تمہیں پہنچے تو انتظامات مکمل اور تیزی سے اپنا نظام درست کر لینا کیونکہ چند ہی روز میں میں تمہارے یہاں پہنچنے والا ہوں۔ انشاء اللہ۔ والسلام۔"

بعض کا قول ہے کہ اس خط کو عبداللہ بن ابیطہر کے ہاتھ بھیجا تھا۔ اس خط کے مضمون اور نوعیت سے صاف ظاہر ہے کہ مکہ سے نکلنے کے بعد یہ سب سے پہلی منزل ایسی منزل تھی جہاں اطمینان کی سانس لی جاسکتی تھی ورنہ اس خط کو پہلے ہی روانہ کر دیا جاتا۔

قیس اس خط کو لے کر کوذہ کی طرف روانہ ہوئے مگر جب قادیسیہ پہنچے تو حصین کی فوج نے گرفتار کر لیا اور اٹھیں ابن زیاد کے پاس بھیج دیا۔ ابن زیاد نے کہا کہ اگر جوان بچا چاہتے ہو تو منبر پر جا کر یحییٰ بن علی کے خلاف تقریر کرو اور ان کی مذمت بیان کرو۔ قیس یہ سن کر منبر پر چلے گئے۔ جمع ہمت ن گوش تھا کہ دیکھیں حسین کا فاضل حصین کے خلاف کیا کہتا ہے۔ مگر انھوں نے مقصد امام کی اشاعت کا یہ ایک ملکن موقع پیدا کیا تھا۔ حمد و ثنائے الہی کے بعد جمع کو مخاطب کیا اور کہا:-

"ایہا الناس! اس وقت خلق خدا میں بہترین شخص حسین بن علی ہیں جو رسول کی بیٹی حضرت فاطمہ کے فرزند ہیں۔ میں انہی کا بھیجا ہوا تمہارے پاس آیا ہوں تمہارا فرض ہے کہ ان کی نصرت کے لیے قدم آگے بڑھاؤ اور ان کی آواز پر لبیک کہو۔"

۲۲۵۔ الاخبار الطوال ۲۲۵ ج ۵۔ ۲۲۳۔ ارشاد ۲۳۔ ۲۳۔ ارشاد ۲۳

ظاہری تمام امیدوں کا ختم ہو جانا، لیکن ایک رئیس قوم اور سردار کی حیثیت تحت موقع پر بہت ذمہ دارانہ ہوتی ہے اس لیے کہ تمام لوگوں کی نظریں اسی پر ہوتی ہیں۔ اگر کہیں اس کو اضطراب ہوا تو پھر تمام رفقاء اور ساتھیوں پر بالواسطہ کا چھا جانا اور اضطراب کا پیدا ہو جانا لازمی امر ہے۔ اسی لیے اس موقع پر جب یہ اچانک خبر امام حسینؑ کو پہنچی تو آپ نے صرف اتنا کیا کہ چند بار کھڑا ہوا اور دعا پڑھی: **وَاِنَّا اِلَيْهِ رَاٰجِعُوْنَ وَرَحْمَةُ اللّٰهِ عَلَيْنٰهُمَا** اور بس خاموش ہو گئے۔ دینوری نے نے کلمہ استرجاع کے بعد ان الفاظ کا اضافہ کیا ہے کہ عند اللہ تختب الفسنا (یعنی ہم اللہ کے یہاں حساب کرتے ہیں اپنی جانوں کا)۔ مطلب اس کا یہ ہوا کہ اسی کی راہ میں ہم اپنی جانوں کو نثار کرتے ہیں اور وہی معاوضہ دینے والا ہے۔

اسدی جو ایک رات تک اس وحشت ناک خبر کو اپنے دل میں رکھ کر اس سے پورا پورا اثر لے چکے تھے اور نتائج کو ہر طرح سوچ کر دل ہی دل میں رائے قائم کر چکے تھے ان سے اپنے دل کی بات چھپائی نہ گئی اور وہ بیباک بول اٹھے کہ خدا کا واسطہ اپنی اور اپنے گھر بھر کی جان کو خطرہ میں نہ ڈالیے۔ یہیں سے واپس ہو جائیے کیونکہ کوفہ میں آپ کا نہ کوئی مددگار رہے نہ دوست بلکہ میں خوف ہے کہ پورا کوفہ آپ کے خلاف ہی ہو گا، ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ ایک ہنگامی اضطراب اور تاثر کے جذبہ سے جو مہمردی کا مشورہ دیا جائے اس کا جواب زیادہ سنجیدہ دلائل کا منتہی نہیں ہو سکتا۔ اگرچہ حضرت امام حسینؑ خود پہلے ہی سے انجام پر مطلع تھے اور آپ کا سفر جہنم نتائج کو پیش نظر رکھ کر تھا ان میں اس خبر کے آنے سے کوئی تبدیلی نہیں ہوئی تھی۔ لیکن دوسرے افراد کے لیے وقتی جذبات کے مقابل میں عقلی دلائل کے پیش کرنے کا محل نہیں ہوا کرتا۔ اس لیے حضرت نے اس ہنگامی جذبہ کے ماتحت مشورہ کا جواب بالکل متضاد ایک فطری جذبہ

کے تحت دیا جو بالکل عقلی دلائل کے مقابل میں فطری جذبہ کی طرف اشارہ کرتا ہے۔

سے اس جانے والے تک پہنچ گئے۔ اور صاحب سلامت کے بعد اس کا قوم و قبیلہ اور نام و نسب دریافت کیا۔ معلوم ہوا بکیر بن مشعبہ اسدی ہے تو انھوں نے بھی اپنا تعارف کرایا اور کہا کہ ہم بھی قبیلہ بنی اسد میں سے ہیں۔ ذرا تم سے اپنے شہر کی حالت دریافت کرنا چاہتے ہیں۔ اس نے کہا کہ ہاں سنو میں کوفہ سے باہر نہیں آیا تھا کہ مسلم بن عقیل اور آتانی بن عروہ قتل کیے گئے اور میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ ان کی لاش کے پاؤں میں رسی باندھ کر بازار میں گھسیٹا جا رہا ہے۔ بڑی وحشت ناک خبر تھی۔ دونوں آدمیوں نے سن لیا اور موقع شناسی سے کام لے کر اس وقت اسے دل میں رکھ لیا۔ یہاں تک کہ وقت اس کے اظہار کی اجازت دے۔

۶۔ **تعلییبہ** : اس منزل پر دوسرے دن شام کے وقت جب امام حسینؑ نے قیام کیا تو دونوں اسدی آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور تسلیم بجالائے۔ حضرت نے سلام کا جواب دیا۔ انھوں نے عرض کیا کہ ہمیں ایک اطلاع دینا ہے۔ حضور فرمائیں تو سب کے سامنے عرض کریں اور اگر ارشاد ہو تو علیحدہ تخلیبہ میں کہیں؟ حضرت نے ایک نظر حاضر الوقت اشخاص پر ڈالی اور فرمایا: "ان لوگوں سے کسی راہ داری کی ضرورت نہیں،" انھوں نے کہا کہ آپ نے اس سوار کو دیکھا تھا جو کل شام کے وقت آ رہا تھا؟ فرمایا: "ہاں! اور میں نے اس سے کچھ حالات بھی دریافت کرنا چاہے تھے۔" انھوں نے کہا کہ ہم نے حضور کی منشاء کے مطابق اس سے حالات دریافت کیے اور وہ ہمارے ہی قبیلہ کا آدمی ہے اور بہت سمجھ دار سچا اور دانش مند شخص ہے۔ اس نے ہم سے بیان کیا کہ وہ کوفہ سے باہر نہیں آیا تھا کہ مسلم بن عقیل اور آتانی بن عروہ دونوں شہید کر دیے گئے اور ان کی لاشیں بازاروں میں پھانسی گئیں۔"

یہ خبر سن کر امام حسینؑ نے فرمایا: "میں نے ان لوگوں سے دریافت کیا کہ وہ کوفہ سے باہر نہیں آیا تھا کہ مسلم بن عقیل اور آتانی بن عروہ دونوں شہید کر دیے گئے اور ان کی لاشیں بازاروں میں پھانسی گئیں۔"

میں لہذا آپ کو یہ منظور نہ ہوا کہ وہ لوگ غلط فہمی میں مبتلا رہیں اور حقیقت حال سے تاریکی میں رہنے کی وجہ سے آپ کا ساتھ دیں۔ آپ کو یقین تھا کہ جب آپ صورت حال کا اظہار کریں گے تو بس وہی جان نثار آپ کے ساتھ رہ جائیں گے جو حقیقتاً آپ کے مقصد کے ساتھ ہمدردی رکھتے اور آپ کی نصرت میں جان تک سے ہاتھ دھونا پسند کرتے ہیں۔ چنانچہ آپ نے حسب ذیل بیان کے ذریعے سب سے تمام اہل قافلہ کو صورت حال سے مطلع فرمایا:-

”ہمیں یہ دردناک خبر معلوم ہوئی ہے کہ ستم بن عقیل اور ہانی بن عروہ قتل کر ڈالے گئے اور ہماری اطاعت کے دعویداروں نے ہماری نصرت سے ہاتھ اٹھا لیا ایل لیے جو شخص تم میں سے واپس جانا چاہے وہ واپس چلا جائے۔ ہماری طرف سے اس پر کوئی ذمہ داری نہیں ہے۔ والسلام“

نتیجہ وہی ہوا جو معلوم تھا کہ اس اعلان کے ساتھ ہی لوگ متفرق ہونا شروع ہوئے اور تقریباً سب دائیں بائیں روانہ ہو گئے۔ یہاں تک کہ زیادہ تر وہی لوگ بو مدینہ سے آپ کے ساتھ آئے تھے باقی رہ گئے۔

۸۔ **ابن عقیل**ؓ: اس منزل پر قبیلہ عکرمہ کا ایک شخص عمر بن لوزانؓ ملا اور اس نے بتایا کہ ابن زیاد کی طرف سے قادیسیہ اور غزیب کے درمیان ناکہ بندی ہو گئی ہے اور اس نے کہا کہ برائے خدا واپس جائیے۔ آپ کے سامنے سواتواروں اور نیزوں کے کوئی چیز آنے والی نہیں ہے اور خطوط لکھنے والوں پر بھروسہ نہ کیجیے۔ وہی لوگ سب پہلے آپ سے لڑنے کے لیے آئیں گے۔ امام حسینؓ نے اس کی خیر خواہی پر اسے دعائے خیر دی اور آگے روانہ ہوئے۔

بظاہر یہ سننے کے بعد کہ قادیسیہ کے ناکہ پر فوجوں کا پہرہ ہے اور وہاں پہنچنا اپنے

۱۔ الاخبار الطوال ص ۲۶ طبری ج ۶ ص ۲۶۷۔ ارشاد ص ۲۳۳ ص ۲۳۳ شیعہ عقیدے اس منزل کا نام لہج غقبہ لکھا ہے

(ارشاد ص ۲۳۳) ۲۔ الاخبار الطوال ص ۲۶ طبری ج ۶ ص ۲۶۷۔ ارشاد ص ۲۳۳ ص ۲۳۳ شیعہ عقیدے اس منزل کا نام لہج غقبہ لکھا ہے

مسلم نے چکھا۔ حضرت منوجہ ہوئے دونوں اسدیوں کی طرف اور فرمایا۔ جب یہ نہ ہوئے تو ہم زندہ رہ کر کیا کریں گے۔ حاضرین میں سے ایک شخص نے یہ بھی کہا کہ آپ کی اور مسلم کی برابری نہیں۔ آپ کو ذمہ میں پہنچ جائیں تو کوذ کے لوگ آپ کی مدد کے لیے دوڑ پڑیں گے۔ حضرت نے اس خیال کی کوئی تائید نہیں کی اور خاموشی اختیار فرمائی۔

رات یہیں گزاری گئی۔ سحر کے وقت آئندہ کی منزلوں کے لیے کافی پانی ساتھ لینے کے بعد آگے روانہ ہوئے یہاں تک کہ زبالہ پہنچے۔

۷۔ زبالہ: اس منزل پر آیس بن عثل طائی جو شعراء میں سے تھا محمد بن اشعث کا بھیجا ہوا خط لے کر امام کے پاس پہنچا۔ چونکہ جناب مسلم نے دشمن کے ہاتھوں میں گرفتار ہونے اور اپنی شہادت کا یقین ہو چکنے کے بعد یہ وصیت کی تھی کہ میرے بعد حضرت امام حسینؓ کو اطلاع دے دی جائے کہ کوذ کی یہ حالت ہے اور آپ کے مددگار اب کوذ میں موجود نہیں ہیں اس لیے آپ اب یہاں آنے کا ارادہ نہ کیجیے چنانچہ یہ خط بھیجا گیا اور منزل زبالہ پر امام کے پاس پہنچا۔

اس قاصد نے یہ بھی اطلاع دی کہ قیس بن مسرقتل کر دیے گئے۔

قرآن بتلاتے ہیں کہ وہ افراد جن کی موجودگی میں جناب مسلم کی غیر شہادت بیان کی گئی تھی واقعی نہایت مخصوص رازدار ہستیاں تھیں۔ اسی لیے اس مجمع کے رد و مسلم کی خبر شہادت ظاہر ہونے کے بعد پھر بھی عام اہل قافلہ سے وہ راز ہی کی حیثیت سے مخفی رہی۔ حضرت نے اب ان واقعات کو اہل قافلہ سے مخفی رکھنا مناسب نہیں سمجھا کیونکہ آپ جتنے تھے۔ رتے کے بت سے غرب آج سے رتے نہ خیر سے۔ تحت ہو گئے ہیں کہ آپ ایک ایسے ملک کی طرف جا رہے ہیں جہاں لوگ آپ کی سلطنت تسلیم کر چکے

۱۔ الاخبار الطوال ص ۲۶ طبری ج ۶ ص ۲۶۷۔ ارشاد ص ۲۳۳ ص ۲۳۳ شیعہ عقیدے اس منزل کا نام لہج غقبہ لکھا ہے

۲۔ الاخبار الطوال ص ۲۶ طبری ج ۶ ص ۲۶۷۔ ارشاد ص ۲۳۳ ص ۲۳۳ شیعہ عقیدے اس منزل کا نام لہج غقبہ لکھا ہے

امام اپنے اصحاب سمیت عمارت سرحد پر رکھے تلواریں حمالیہ کیے کھڑے تھے کہ دشمن کے ہانپتے ہوئے گھوڑے اور سوار سامنے آ کر کھڑے ہو گئے۔ آثارِ پاسبان کی شدت کے گواہ تھے اور صورتِ سوال۔ حسینؑ ایک حساس دل رکھتے تھے جس میں انسانی ہمدردی کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ آپ کے لیے دشمن کی موجودہ حالت ناقابلِ برداشت تھی۔ آپ نے اپنے جوانوں کو حکم دیا کہ ان کو پانی پلاؤ اور تمام فوج کو پرری طرح سیراب کر دو۔ حکم

کونقینی طور پر دشمن کے ہاتھ میں گرفتار کر دینا ہے آپ نے سمتِ سفر میں ذرا تبدیلی فرمائی اور اسی لیے قادسیہ کہ جس کا سر کوفہ جانے والے کے محلِ گزریں واقع ہونا ضروری تھا اور جہاں قیس بن مسہر گرفتار کیے گئے تھے آپ کے منازلِ سفر میں واقع نہیں ہوا اور آپ کا اس فوج سے تصادم نہیں ہوا جو حصین کی سرکردگی میں قادسیہ کے حدود میں مقیم تھی۔

۹۔ **سراة**: بطنِ عقیق سے روانہ ہو کر امام نے یہاں رات بسر کی یہ
۱۰۔ **اشراف**: قبری اور شیخ مفید کی تصریح کے مطابق ثعلبیہ و زبالبہ کے بعد اس منزل پر امام
نے حکم دیا کہ بانی بھڑلو اور مشکیں اور چھانگیں پُر کر لو۔ اس منزل سے آگے بڑھے اور اب

غبارِ محرم ستیرہ یو پند نیک پر نمود رہوچہ ہے۔
پہلی تاریخِ دوپہر کو امام حسینؑ کا قافلہ منزلِ شراف کے حدود سے آگے بڑھا تھا۔ قادیسیہ
سے تین میل کے فاصلہ پر کہ آپ کے اصحاب میں کسی نے کہا: "اللہ اکبر" امام نے فرمایا: بے شک
لہذیب سے بڑا ہے مگر اس وقت تکبیر کہنے کی وجہ؟ اس نے کہا: مجھے خرمے کے درخت دکھائی
دے رہے ہیں۔ اس کے یہ معنی ہیں کہ کوئی آبادی نزدیک ہے۔ اصحاب میں سے کچھ لوگوں نے
کہا کہ اس جگہ تو کبھی ہم نے درخت نہ مایکھیے نہیں۔ حضرت نے فرمایا: پھر تم ہی دیکھو کیا دکھائی
دیتا ہے؟ انھوں نے کہا: ہم کو تو گھوڑوں کی گردنیں یا کوتیاں نظر آتی ہیں۔ حضرت نے
فرمایا: میں بھی یہی دیکھتا ہوں۔

۱۱۔ ذوقِ حسم : مخالف فوج کو ادھر متوجہ پا کر امام حسینؑ نے اپنے اصحاب سے پوچھا کہ یہاں کوئی ایسی محفوظ جگہ ہے جسے ہم اپنی پشت پر قرار دے کر دشمن سے سامنے کی جانب سے مقابلہ کریں۔ مطلب یہ تھا کہ چاروں طرف سے گھرنے کا امکان باقی نہ رہے۔ لوگوں نے کہا یہ ذوقِ حسم پہاڑ موجود ہے جو آپ کے بائیں پہلو کی طرف ہے۔ آپ اس کی طرف متوجہ

سے الاخبار الطوال ۲۲۶ سے طبری ج ۶ ۲۲۷ ارشاد ۲۳۳-۲۳۴ سے طبری ج ۶ ۲۳۵

۲۲۴ ج ۶ ص ۲۳۴ ۵۵ ارشاد ص ۲۳۴ ۵۵ دینوری نے دو ختم لکھا ہے (الانخبار الطوال ص ۲۳۴)

نماز کے بعد حضرت نے اس جماعت کی طرف رخ کیا اور حمد و ثنائے الہی کے بعد مَحْرُور کی فوج کو مخاطب کرتے ہوئے ارشاد کیا۔ "اے گروہِ مردم! میں خدا کی بارگاہ میں اور تمہارے سامنے اپنی صفائی پیش کرتا ہوں۔ میں تمہاری طرف اس وقت تک نہیں آیا جب تک کہ تمہارے خطوط میرے پاس نہیں گئے کہ آپ ہماری طرف آئیے۔ ہمارا کوئی امام نہیں ہے۔ شاید خدا آپ کے ذریعہ سے ہمیں ہدایت پر مجتمع کر دے اب اگر تم اپنی بات پر قائم ہو تو میں آپ ہی گیا ہوں اپنے ارادہ پر قائم رہوں اور اگر تم میرے آنے سے ناراض ہو تو میں واپس چلا جاؤں وہیں جہاں آيا ہوں۔" اس تقریر کے بعد خاموشی چھائی اور کوئی جواب نہیں ملا۔ آخر حضرت اپنے خیمہ میں تشریف لے گئے اور آپ کے اصحاب آپ کے خیمہ میں مجتمع ہو گئے مَحْرُور اس خیمہ میں جو اس کے لیے لگایا گیا تھا داخل ہوا اور اس کے کچھ ساتھی اس کے پاس جا کر بیٹھ گئے۔ دوسرے لوگ متفرق طور پر اسی میدان میں اسی شان سے کہ سپاہیوں نے اپنے گھوڑوں کی باگیں ہاتھوں میں لے لیں ان ہی کے سایہ میں دہر کا وقت گزرنے تک بیٹھ رہے عصر کا وقت ہوا تو امام حسینؑ نے اپنے اصحاب کو حکم دیا کہ روانگی کی تیاری کرو۔ پھر آپ نے باہر آ کر عصر کی نماز کا اعلان کیا اور اسی صورت سے حضرت کی اقتداء میں دونوں گروہوں نے نماز پڑھی۔ نماز کے بعد آپ نے پھر جمع کی طرف رخ کیا اور حمد و ثنائے الہی کے بعد فرمایا۔ "اگر تقویٰ اختیار کرو اور حقدار کا حق پہچانو تو خدا کی رضامندی حاصل کرو گے حقیقتاً ہم اہل بیت امتِ اسلامیہ کی فرمانبرداری کے ان لوگوں سے زیادہ مستحق ہیں۔ جو آج اس منصب کے غلط دعویدار ہیں اور مسلمانوں پر ستم ڈھاتے ہیں لیکن اگر تم ہم کو ناپسند کرتے ہو اور ہمارے حق کا اقرار نہیں رکھتے ہو اور اس رائے کے خلاف ہو تو تمہارے خطوط اور قاصدوں کے بیانات سے ظاہر ہو رہی تھی تو میں واپس چلا جاؤں گا۔" یہی وہی وہی خاموشی ٹوٹی اور اس نے کہا۔ "ہمیں تو بخدا خبر بھی نہیں کہ یہ خطوط کیسے ہیں؟ جن کا

۲۲۸ طبري ج ۶ ۲۲۹ الاخبار الطوال ۲۳۰ طبري ج ۶ ۲۳۱

۲۲۸ ج ۶ - ارشاد ص ۲۳۵ - ۲۳۶

کی دیر تھی اطاعتِ امام پر کمر بستہ جوان کھڑے ہو گئے اور سب کو میرا بگایا۔ حالت یہ تھی کہ پیالے، لگنیں، طشت پانی سے بھرتے تھے اور گھوڑوں کے پاس لے جاتے تھے۔ سب ہر گھوڑا تین چار باجھ دنگہ پی کر منہ ہٹا لیتا تھا تاہم دوسرے گھوڑے کے پاس لے جاتے تھے۔ یہاں تک کہ راکب و مرکب سب میرا بھو گئے۔ علی بن طعان محارب بنی مُر کا ایک ساتھی تھا۔ وہ کہتا ہے کہ میری حالت پیاس سے بہت تباہ تھی اور سب سے آخر میں میں پہنچا۔ جب امام حسین نے میری اور میرے گھوڑے کی پائیں کو دیکھا فرمایا، ”راویہ (یعنی شتر بکش کو) بٹھا لو“ میری زبان میں ”راویہ“ مشک کو کہتے تھے اہل لیے میں اس کے معنی نہ سمجھا حضرت نے فرمایا، ”جمل (یعنی اونٹ) کو بٹھا لو“ میں نے اونٹ کو بٹھایا حضرت نے فرمایا، اب پانی پیو مگر میں اتنا بدحواس تھا کہ جتنا پینے کی کوشش کرتا پانی زمین پر بہتا اور مجھ تک نہ پہنچتا۔ امام نے کہا مشک کے دہانے کو اپنی طرف موڑ لو۔ پھر بھی میری کچھ میں نہ آیا تب حضرت خود اٹھے اور مشک کے دہانے کو ٹھیک کر کے مجھے دیا۔ میں نے خود بھی پانی پیا اور اپنے گھوڑے کو میرا بگایا۔

و میرا ب کیا بلکہ
امام حسینؑ کی اس بلند ظرفی کا جو اثر مخالفت سردار یعنی حرؑ کے دل پر قائم ہوا اس کے ظاہر ہونے کا ابھی وقت نہ آیا تھا لیکن کم از کم وہ ششدر رہ گیا ہو گا کہ اس احسان کے بعد اب اہل بزرگ فطرت انسان سے کس طرح گفتگو کر دل امام نے بھی اپنے فطری استقلال و اطمینان کی وجہ سے اس وقت کچھ نہ پوچھا کہ تم کیوں آئے ہو اور کیا مطلب ہے؟ فوج حرؑ کے سپاہی اپنے گھوڑوں کے سایہ میں باگیں ہاتھوں سے پکڑے ہوئے بیٹھ گئے تھے یہاں تک کہ ظہر کی نماز کا وقت آیا اور امام حسینؑ نے حجاج بن مسروق جعفی کو اذان کا حکم دیا اور انھوں نے اذان کی جب نماز جماعت کی صفیں تیار ہو گئیں تو امام اپنے نماز کے لباس میں خیمہ سے برآمد ہوئے اور اقامت کا حکم دیا۔ اہل کے بعد آپ نے حرؑ سے فرمایا کہ تم ہمارے ساتھ نماز پڑھو گے یا اپنے ساتھیوں کو الگ نماز پڑھانا چاہتے ہو؟ حرؑ نے کہا نہیں آپ نماز پڑھائیے اور ہم سب آپ کے پیچھے نماز پڑھیں گے۔ چنانچہ

٢٢٤

کہ میں اس جماعت میں تازہ شریک ہوا ہوں اس لیے مجھے ایسے مواقع پر سبقت کرنے کا حق حاصل نہیں ہے۔ دوسرے اصحاب سے ان الفاظ میں تقریر کی اجازت چاہی کہ آپ لوگ پہلے تقریر کریں گے یا میں کچھ کہوں؟ سب نے کہا کہ نہیں تم تقریر کرو۔ نہ میرے حمد و ثناء الہی کے بعد کہا: ”اللہ آپ کو مقصد تک پہنچائے اسے فرزند رسول! ہم نے آپ کے ارشاد کو مناجاد دینا اگر ہمارے لیے ہمیشہ باقی رہنے والی ہوتی مگر جدا ہونا اس سے محض آپ کی نصرت اور ہمدردی کی بنا پر ہوتا تو بھی ہم آپ کا ساتھ دینے کو دنیا میں ہمیشہ قیام پر ترجیح دیتے“ یہ منکر امام نے زہیر کو دعائے خیر دی اور ان کے خلوص کی تعریف کی (۱) اس کے بعد نافع بن ہلال جمعی کھڑے ہوئے اور انھوں نے حسب ذیل پُر زور تقریر کی:-

”فرزند رسول! آپ کو معلوم ہے کہ آپ کے جدِ بزرگوار کے لیے بھی یہ ممکن نہیں ہوا کہ لوگوں کو اپنی محبت گھول کر ملا دیں اور لوگ حضرت کی اس طرح اطاعت کرنے لگیں جن طرح کہ حضرت چاہتے تھے اور حضرت کے ساتھ والوں میں بہت سے منافق تھے جو حضرت سے نصرت کا وعدہ کرتے تھے مگر دماغ میں غدار کی کا خیال مضمحل رکھتے تھے وہ آپس میں تو ایسی بناتے تھے جو شہد سے زیادہ شیریں ہوتیں مگر کردار سے مخالفت کرتے ایسی جو انتہائی تلخ ثابت ہوتی یہاں تک کہ رسول اللہ کا انتقال ہو گیا اس کے بعد آپ کے والد بزرگوار حضرت علیؓ کو بھی اسی صورت سے دوچار ہونا پڑا۔ کچھ لوگ ان کی نصرت پر متفق ہوئے اور انھوں نے ان کا ساتھ دیتے ہوئے ناکثین و قاسطین مارقین (جمل صفین اور نہروان والوں) سے جنگ کی اور کچھ لوگوں نے مخالفت کی۔ یہاں تک کہ حضرت کی وفات ہو گئی اور آج ہمارے سامنے آپ کے لیے وہی صورت درپیش ہے۔ لہذا جو شخص اپنے عہد کو توڑے گا اور نیت کو خراب کرے گا وہ خود اپنا بُرا کرے گا اور خدا آپ کو اس سے لاپرواہ کر دے گا۔ بسم اللہ چلیے ہم

آپ حوالہ دے رہے ہیں۔ امام نے عقبہ بن معان سے فرمایا لاؤ وہ تھیلے جن میں ان لوگوں کے خطوط بھرے ہوئے ہیں۔ عقبہ نے دو تھیلے خطوط سے بھرے ہوئے لاکر سامنے رکھے اور ان میں سے خطوط نکال کر پھیلایا دیے۔ پھر نے کہا کہ ہم تو ان لوگوں میں سے نہیں ہیں جنہوں نے آپ کو خطوط لکھے ہیں۔ ہم تو مامور کیے گئے ہیں۔ اس پر کہ جہاں بھی آپ مل جائیں پھر ہم آپ کا ساتھ نہ چھوڑیں۔ یہاں تک کہ آپ کو ابن زیاد کے پاس پہنچا دیں۔ یہ سننا تھا کہ امام نے زور سے کہا کہ ”موت تمھارے لیے اس سے قریب تر ثابت ہوگی“ لے

اور اس کے بعد آپ نے کوڈ جانے کا ارادہ کلیتہً ترک کر دیا یعنی اس کے پہلے راستہ بدلنے کے بعد بھی آپ کا رخ کوڈ ہی کی طرف تھا۔ لیکن اب کوڈ جلنے کے خیال ہی کو ذہن سے نکال دیا۔ اس کے بعد آپ نے اپنے اصحاب کے سامنے ایک خطبہ ارشاد فرمایا۔ جس میں حمد و ثناء باری کے بعد فرمایا ”صورتِ حال پوشش آئی ہے وہ تم دیکھ رہے ہو یقیناً دنیا کا رنگ بدل گیا ہے اور اس کی نئی رخصت ہو چکی ہے اور اس میں کچھ نہیں رہ گیا ہے۔ سوا ایسے غور سے حصّہ کے جو پانی کے بہنے کے بعد کسی ظرف میں نہ رہتا ہے اور ایک پست زندگی کے جوش زہری گھاٹ کے ہے۔ کیا تم نہیں دیکھتے کہ حق پر عمل نہیں ہوتا اور باطل سے علیحدگی نہیں اختیار کی جاتی۔ اس صورت میں مومن یقیناً خدا کی ملاقات کا آرزو مند ہوتا ہے۔ میرے نزدیک تو موت کی صورت میں شہادت کی سی نعمت ہے اور زندہ رہنا ان ظالموں کے درمیان وبالِ جان ہے۔ اس خطبہ کا مقصد صرف اصحاب کو انجام کار کی طرف ایک مرتبہ پھر متوجہ کرنا اور اس طرح ان کو اپنے عزائم کی پختگی کا دوبارہ جائزہ لینے کی دعوت دینا ہی قرار دیا جاسکتا تھا اور اس لیے ضرورت تھی کہ اس تقریر کو سنکر اصحاب کی جانب سے خلوص نیت اور پختگی عزم کا قرار واقعی ملے اور دیا جاتا چنانچہ امام کی تقریر ختم ہوتے ہی زہیر بن قین کھڑے ہو گئے اور اس احساس کی

میں میرے اور آپ کے درمیان انصاف کا یہی ایک طریقہ ہے۔ اس وقت تک کہ جب تک مجھے حکم کی رائے معلوم ہو۔“ حضرت کو حُر کی یہ بات معقول معلوم ہوئی، اور آپ قادیسیہ و عذیب کے راستے سے بائیں سمت کی طرف متوجہ ہو گئے، اور حُر بھی آپ کے ساتھ ساتھ چلا۔ تاریخ میں صراحت ہے کہ یہاں سے اور عذیب تک ۳۸ میل کا فاصلہ تھا۔

راستے میں امام حسینؑ اور حُر کے درمیان ہو گشتگو ہوتی جاتی تھی وہ بھی بڑی معنی نیز محنت پر تھا۔ آپ کو خدا کا واسطہ دیتا ہوں کہ آپ اپنے اوپر رحم کریں اس لیے کہ اگر آپ نے جنگ کی تفسیر کیا آپ قتل کر دیے جائیں گے اور نباہ ہوں گے۔“ حضرت نے جواب دیا۔ ”کیا تم مجھے موت دے رہے ہو؟ کیا تم اس سے زیادہ کچھ کر سکتے ہو کہ مجھے قتل کر ڈالو؟“ اس کے بعد حضرت نے قبیلہ اوس کے ایک شاعر کا وہ شعر پڑھا جس کا مضمون یہ تھا کہ ”میں اپنے ارادہ پر قائم رہوں گا اور موت سے ہمارا ہونے میں جو اغرد کے لیے کوئی عار و ذنگ نہیں ہے جبکہ اس کی نیت میں سچائی ہو اور وہ راہ میں جہاد کر رہا ہو۔“

حُر اس انتہائی عزم و استقلال کا اظہار سن کر حسینی قافلہ سے کچھ دور ساتھ ساتھ ہو کر راستے طے کرنے لگا۔
 تبصرہ: اس مقام پر امام حسینؑ نے فوج حُر اور اپنے اصحاب کے سامنے ایک تقریر فرمائی جس میں اسلام کے تعلیمات کے حوالہ سے اپنے فرائض پر روشنی ڈالتے ہوئے فرمایا کہ ”ایہا الناس پیغمبر اسلامؐ نے فرمایا ہے کہ جو شخص کسی بادشاہ کو دیکھے کہ وہ ظلم و جور کرتا ہے، محرماتِ اللہ کو حلال بنائے، اوسے بے خدائی عہد و پیمان کو توڑ دیتا ہے، سنتِ رسولؐ کی مخالفت کرتا ہے اور بندگانِ خدا میں مصیبت کا طرز اختیار کیے ہوئے ہے اور یہ شخص ان باتوں کو گوارا کرے اور اصلاح کی کوشش نہ کرے اپنے قول اور اپنے عمل سے تو وہ تمہاری ہونگا اس کا کہ اللہ اس کو بھی ایسی بادشاہ کے درجہ میں محبوب کرے۔“

اس کے بعد موجودہ صورتِ حال پر تبصرہ کی حیثیت سے فرمایا:-

کو لے کر غیر اسلامی کے ساتھ چاہے مشرق کی طرف اور چاہے مغرب کی جانب، ہم بخدا خدا کے مقرر فیصلہ سے خوفزدہ نہیں ہیں اور نہ اپنے رب کی ملاقات (موت) سے کراہت رکھتے ہیں۔ ہم اپنی نیتوں اور اعتقادوں پر قائم ہیں۔ موالات رکھتے ہیں۔ اس شخص سے جو آپ کے ساتھ موالات رکھے اور دشمن ہیں اس کے جو آپ سے دشمنی کرے۔“

پھر بربر بنِ خنصیر ہمدانی نے تقریر کی:-

خدا کی قسم لے فرزندِ رسولؐ! یہ خدا کا ہم پر احسان ہے کہ اس نے ہم کو موقع دیا اس بات کا کہ ہم آپ کے سامنے جنگ کریں اور آپ کی نصرت کے سلسلہ میں ہمارے اعضاء و جوارح قطع کیے جائیں یہاں تک کہ آپ کے جگر بزرگوار روزِ قیامت ہمارے شفاعت خواہ ہوں کیونکہ وہ جماعت کبھی نجات نہیں پاسکتی جس نے اپنے نبی کے نواسے کو ترغیب کیا ہو اور دائے ہوان کے لیے وہ خدا کو کیا منہ دکھائیں گے اور ان کا کیا حال ہوگا۔ اس دن جب وہ آتشِ جہنم میں نالہ و فریاد کرتے ہوں گے۔“

اس گفتگو کے بعد امام نے اپنے اصحاب سے فرمایا کہ اپنی سواریوں پر سوار ہو جاؤ اور یہ لوگ یہاں تک کہ خواہن بھی اپنی عماریوں میں سوار ہو گئیں۔ آپ نے حکم دیا کہ چلو جس راستے سے ہیں اسی راستے پر واپس چلو۔ جب اصحاب نے ارادہ پلٹنے کا کیا حُر کی سپاہ سامنے آکر سدِ راہ ہوئی۔ اس پر امام نے دریافت کیا کہ تمہارا مطلب کیا ہے؟“ حُر نے کہا میں چاہتا ہوں کہ آپ کو ابنِ زیاد کے پاس لے جاؤں۔“ حضرت نے فرمایا۔ ”خدا کی قسم یہ نہیں ہوگا۔“ حُر نے کہا پھر میں بخدا آپ کو چھوڑوں گا بھی نہیں۔“ یونہی تین مرتبہ رد و بدل ہوئی۔

آخر میں حُر نے کہا کہ میں آپ سے جنگ کرنے پر مامور نہیں ہوا ہوں۔ مجھے تو بس یہ حکم ہوا ہے کہ آپ کے ساتھ ساتھ رہوں یہاں تک کہ آپ کو فہم پہنچیں۔ اب اس صورت میں کہ آپ کو دیکھتے ہیں سے ہی انکار کرتے ہیں تو ایک ایسا راستہ اختیار کیجیے جو نہ کو فہ کی طرف جاتا ہو اور نہ مدینہ کی طرف

طراح نے امام سے ابن زیاد کی افواج کی کثرت بیان کی اور کہا: "کوفہ سے باہر نکلنے کے پہلے میں نے ہشت کوفہ پر اتنا عظیم لشکر دیکھا ہے جتنا آج تک تو میری ذمہ داریوں سے نہیں گزرا تھا اور میں نے دریافت کیا تو بتلایا گیا کہ یہ سب اس لیے اکٹھے ہیں کہ ان کا جائزہ لیا جائے گا اور پھر یہ حضرت امام حسین سے مقابلہ کے لیے روانہ ہوں گے۔"

یہ بیان کرنے کے بعد انھوں نے کہا کہ "اس جماعت سے مقابلہ آپ کے لیے ممکن نہیں لہذا آپ میرے ساتھ کوہِ آجبار پر چلیے جہاں شاہانِ خستہ و حیر اور نعمان بن منذر ایسے زبردست بادشاہ تک ہم پر قابو نہیں پاسکے، وہاں میں ذمہ داری لیتا ہوں کہ قبیلہ طے کے میں ہزار سپاہی آپ کی مدد کے لیے تیار ہوں گے۔"

امام نے طراح کی مخلصانہ پیشکش پر انھیں دعائے نیر دی لیکن ان کے مشورہ پر عمل کرنے سے معذوری ظاہر فرمائی۔

۱۲۔ **قصر بنی مقاتل:** عذیب البجانات سے امام حسینؑ کو کوفہ کے راستے کو چھوڑ کر داہنے ہاتھ کی سمت روانہ ہوئے یہاں تک کہ قصر بنی مقاتل پہنچے۔ یہاں پہنچ کر آپؑ اور ساتھ ہی ساتھ حُر بنی قیام کیا گیا۔ اسی منزل پر کوفہ کے بہادر دل اور شاہسواروں میں سے ایک شخص عبید اللہ بن حُر جعفری قیام پذیر تھا۔ حضرت نے اتمامِ حجت کے لیے اسے نصرت کی دعوت دی۔ مگر اس کی قسمت میں یہ سعادت نہ تھی لہذا اس کی فوج ارادی ابھی اس جنگی تنگ پہنچی ہوئی نہ تھی، اس نے حیدرِ حوالہ کر کے اس موقع کو ہاتھ سے دے دیا جس پر اسے عمرِ بھر افسوس رہا اور بعد میں خونِ امام کے انتقام لینے میں شریک ہوا۔ یہاں سے روانگی کے قبل رات کے آخری حصہ میں حسرت نے اپنے قافلہ کے جوڑوں کو بلانے کے ساتھ لینے کا حکم دیا جس کی تعمیل ہوئی۔ پھر سب آگے روانہ ہوئے۔

ابھی تھوڑا رستہ طے ہوا تھا کہ امام پر کچھ غنودگی سی طاری ہوئی۔ آنکھ کھلی تو آپ فرما رہے تھے۔

طبری ج ۶ ص ۲۲۹ - ۲۳۰ - ۲۳۱ - ۲۳۲ - ۲۳۳ - ۲۳۴ - ۲۳۵ - ۲۳۶ - ۲۳۷ - ۲۳۸ - ۲۳۹ - ۲۴۰ - ۲۴۱ - ۲۴۲ - ۲۴۳ - ۲۴۴ - ۲۴۵ - ۲۴۶ - ۲۴۷ - ۲۴۸ - ۲۴۹ - ۲۵۰ - ۲۵۱ - ۲۵۲ - ۲۵۳ - ۲۵۴ - ۲۵۵ - ۲۵۶ - ۲۵۷ - ۲۵۸ - ۲۵۹ - ۲۶۰ - ۲۶۱ - ۲۶۲ - ۲۶۳ - ۲۶۴ - ۲۶۵ - ۲۶۶ - ۲۶۷ - ۲۶۸ - ۲۶۹ - ۲۷۰ - ۲۷۱ - ۲۷۲ - ۲۷۳ - ۲۷۴ - ۲۷۵ - ۲۷۶ - ۲۷۷ - ۲۷۸ - ۲۷۹ - ۲۸۰ - ۲۸۱ - ۲۸۲ - ۲۸۳ - ۲۸۴ - ۲۸۵ - ۲۸۶ - ۲۸۷ - ۲۸۸ - ۲۸۹ - ۲۹۰ - ۲۹۱ - ۲۹۲ - ۲۹۳ - ۲۹۴ - ۲۹۵ - ۲۹۶ - ۲۹۷ - ۲۹۸ - ۲۹۹ - ۳۰۰ - ۳۰۱ - ۳۰۲ - ۳۰۳ - ۳۰۴ - ۳۰۵ - ۳۰۶ - ۳۰۷ - ۳۰۸ - ۳۰۹ - ۳۱۰ - ۳۱۱ - ۳۱۲ - ۳۱۳ - ۳۱۴ - ۳۱۵ - ۳۱۶ - ۳۱۷ - ۳۱۸ - ۳۱۹ - ۳۲۰ - ۳۲۱ - ۳۲۲ - ۳۲۳ - ۳۲۴ - ۳۲۵ - ۳۲۶ - ۳۲۷ - ۳۲۸ - ۳۲۹ - ۳۳۰ - ۳۳۱ - ۳۳۲ - ۳۳۳ - ۳۳۴ - ۳۳۵ - ۳۳۶ - ۳۳۷ - ۳۳۸ - ۳۳۹ - ۳۴۰ - ۳۴۱ - ۳۴۲ - ۳۴۳ - ۳۴۴ - ۳۴۵ - ۳۴۶ - ۳۴۷ - ۳۴۸ - ۳۴۹ - ۳۵۰ - ۳۵۱ - ۳۵۲ - ۳۵۳ - ۳۵۴ - ۳۵۵ - ۳۵۶ - ۳۵۷ - ۳۵۸ - ۳۵۹ - ۳۶۰ - ۳۶۱ - ۳۶۲ - ۳۶۳ - ۳۶۴ - ۳۶۵ - ۳۶۶ - ۳۶۷ - ۳۶۸ - ۳۶۹ - ۳۷۰ - ۳۷۱ - ۳۷۲ - ۳۷۳ - ۳۷۴ - ۳۷۵ - ۳۷۶ - ۳۷۷ - ۳۷۸ - ۳۷۹ - ۳۸۰ - ۳۸۱ - ۳۸۲ - ۳۸۳ - ۳۸۴ - ۳۸۵ - ۳۸۶ - ۳۸۷ - ۳۸۸ - ۳۸۹ - ۳۹۰ - ۳۹۱ - ۳۹۲ - ۳۹۳ - ۳۹۴ - ۳۹۵ - ۳۹۶ - ۳۹۷ - ۳۹۸ - ۳۹۹ - ۴۰۰ - ۴۰۱ - ۴۰۲ - ۴۰۳ - ۴۰۴ - ۴۰۵ - ۴۰۶ - ۴۰۷ - ۴۰۸ - ۴۰۹ - ۴۱۰ - ۴۱۱ - ۴۱۲ - ۴۱۳ - ۴۱۴ - ۴۱۵ - ۴۱۶ - ۴۱۷ - ۴۱۸ - ۴۱۹ - ۴۲۰ - ۴۲۱ - ۴۲۲ - ۴۲۳ - ۴۲۴ - ۴۲۵ - ۴۲۶ - ۴۲۷ - ۴۲۸ - ۴۲۹ - ۴۳۰ - ۴۳۱ - ۴۳۲ - ۴۳۳ - ۴۳۴ - ۴۳۵ - ۴۳۶ - ۴۳۷ - ۴۳۸ - ۴۳۹ - ۴۴۰ - ۴۴۱ - ۴۴۲ - ۴۴۳ - ۴۴۴ - ۴۴۵ - ۴۴۶ - ۴۴۷ - ۴۴۸ - ۴۴۹ - ۴۵۰ - ۴۵۱ - ۴۵۲ - ۴۵۳ - ۴۵۴ - ۴۵۵ - ۴۵۶ - ۴۵۷ - ۴۵۸ - ۴۵۹ - ۴۶۰ - ۴۶۱ - ۴۶۲ - ۴۶۳ - ۴۶۴ - ۴۶۵ - ۴۶۶ - ۴۶۷ - ۴۶۸ - ۴۶۹ - ۴۷۰ - ۴۷۱ - ۴۷۲ - ۴۷۳ - ۴۷۴ - ۴۷۵ - ۴۷۶ - ۴۷۷ - ۴۷۸ - ۴۷۹ - ۴۸۰ - ۴۸۱ - ۴۸۲ - ۴۸۳ - ۴۸۴ - ۴۸۵ - ۴۸۶ - ۴۸۷ - ۴۸۸ - ۴۸۹ - ۴۹۰ - ۴۹۱ - ۴۹۲ - ۴۹۳ - ۴۹۴ - ۴۹۵ - ۴۹۶ - ۴۹۷ - ۴۹۸ - ۴۹۹ - ۵۰۰ - ۵۰۱ - ۵۰۲ - ۵۰۳ - ۵۰۴ - ۵۰۵ - ۵۰۶ - ۵۰۷ - ۵۰۸ - ۵۰۹ - ۵۱۰ - ۵۱۱ - ۵۱۲ - ۵۱۳ - ۵۱۴ - ۵۱۵ - ۵۱۶ - ۵۱۷ - ۵۱۸ - ۵۱۹ - ۵۲۰ - ۵۲۱ - ۵۲۲ - ۵۲۳ - ۵۲۴ - ۵۲۵ - ۵۲۶ - ۵۲۷ - ۵۲۸ - ۵۲۹ - ۵۳۰ - ۵۳۱ - ۵۳۲ - ۵۳۳ - ۵۳۴ - ۵۳۵ - ۵۳۶ - ۵۳۷ - ۵۳۸ - ۵۳۹ - ۵۴۰ - ۵۴۱ - ۵۴۲ - ۵۴۳ - ۵۴۴ - ۵۴۵ - ۵۴۶ - ۵۴۷ - ۵۴۸ - ۵۴۹ - ۵۵۰ - ۵۵۱ - ۵۵۲ - ۵۵۳ - ۵۵۴ - ۵۵۵ - ۵۵۶ - ۵۵۷ - ۵۵۸ - ۵۵۹ - ۵۶۰ - ۵۶۱ - ۵۶۲ - ۵۶۳ - ۵۶۴ - ۵۶۵ - ۵۶۶ - ۵۶۷ - ۵۶۸ - ۵۶۹ - ۵۷۰ - ۵۷۱ - ۵۷۲ - ۵۷۳ - ۵۷۴ - ۵۷۵ - ۵۷۶ - ۵۷۷ - ۵۷۸ - ۵۷۹ - ۵۸۰ - ۵۸۱ - ۵۸۲ - ۵۸۳ - ۵۸۴ - ۵۸۵ - ۵۸۶ - ۵۸۷ - ۵۸۸ - ۵۸۹ - ۵۹۰ - ۵۹۱ - ۵۹۲ - ۵۹۳ - ۵۹۴ - ۵۹۵ - ۵۹۶ - ۵۹۷ - ۵۹۸ - ۵۹۹ - ۶۰۰ - ۶۰۱ - ۶۰۲ - ۶۰۳ - ۶۰۴ - ۶۰۵ - ۶۰۶ - ۶۰۷ - ۶۰۸ - ۶۰۹ - ۶۱۰ - ۶۱۱ - ۶۱۲ - ۶۱۳ - ۶۱۴ - ۶۱۵ - ۶۱۶ - ۶۱۷ - ۶۱۸ - ۶۱۹ - ۶۲۰ - ۶۲۱ - ۶۲۲ - ۶۲۳ - ۶۲۴ - ۶۲۵ - ۶۲۶ - ۶۲۷ - ۶۲۸ - ۶۲۹ - ۶۳۰ - ۶۳۱ - ۶۳۲ - ۶۳۳ - ۶۳۴ - ۶۳۵ - ۶۳۶ - ۶۳۷ - ۶۳۸ - ۶۳۹ - ۶۴۰ - ۶۴۱ - ۶۴۲ - ۶۴۳ - ۶۴۴ - ۶۴۵ - ۶۴۶ - ۶۴۷ - ۶۴۸ - ۶۴۹ - ۶۵۰ - ۶۵۱ - ۶۵۲ - ۶۵۳ - ۶۵۴ - ۶۵۵ - ۶۵۶ - ۶۵۷ - ۶۵۸ - ۶۵۹ - ۶۶۰ - ۶۶۱ - ۶۶۲ - ۶۶۳ - ۶۶۴ - ۶۶۵ - ۶۶۶ - ۶۶۷ - ۶۶۸ - ۶۶۹ - ۶۷۰ - ۶۷۱ - ۶۷۲ - ۶۷۳ - ۶۷۴ - ۶۷۵ - ۶۷۶ - ۶۷۷ - ۶۷۸ - ۶۷۹ - ۶۸۰ - ۶۸۱ - ۶۸۲ - ۶۸۳ - ۶۸۴ - ۶۸۵ - ۶۸۶ - ۶۸۷ - ۶۸۸ - ۶۸۹ - ۶۹۰ - ۶۹۱ - ۶۹۲ - ۶۹۳ - ۶۹۴ - ۶۹۵ - ۶۹۶ - ۶۹۷ - ۶۹۸ - ۶۹۹ - ۷۰۰ - ۷۰۱ - ۷۰۲ - ۷۰۳ - ۷۰۴ - ۷۰۵ - ۷۰۶ - ۷۰۷ - ۷۰۸ - ۷۰۹ - ۷۱۰ - ۷۱۱ - ۷۱۲ - ۷۱۳ - ۷۱۴ - ۷۱۵ - ۷۱۶ - ۷۱۷ - ۷۱۸ - ۷۱۹ - ۷۲۰ - ۷۲۱ - ۷۲۲ - ۷۲۳ - ۷۲۴ - ۷۲۵ - ۷۲۶ - ۷۲۷ - ۷۲۸ - ۷۲۹ - ۷۳۰ - ۷۳۱ - ۷۳۲ - ۷۳۳ - ۷۳۴ - ۷۳۵ - ۷۳۶ - ۷۳۷ - ۷۳۸ - ۷۳۹ - ۷۴۰ - ۷۴۱ - ۷۴۲ - ۷۴۳ - ۷۴۴ - ۷۴۵ - ۷۴۶ - ۷۴۷ - ۷۴۸ - ۷۴۹ - ۷۵۰ - ۷۵۱ - ۷۵۲ - ۷۵۳ - ۷۵۴ - ۷۵۵ - ۷۵۶ - ۷۵۷ - ۷۵۸ - ۷۵۹ - ۷۶۰ - ۷۶۱ - ۷۶۲ - ۷۶۳ - ۷۶۴ - ۷۶۵ - ۷۶۶ - ۷۶۷ - ۷۶۸ - ۷۶۹ - ۷۷۰ - ۷۷۱ - ۷۷۲ - ۷۷۳ - ۷۷۴ - ۷۷۵ - ۷۷۶ - ۷۷۷ - ۷۷۸ - ۷۷۹ - ۷۸۰ - ۷۸۱ - ۷۸۲ - ۷۸۳ - ۷۸۴ - ۷۸۵ - ۷۸۶ - ۷۸۷ - ۷۸۸ - ۷۸۹ - ۷۹۰ - ۷۹۱ - ۷۹۲ - ۷۹۳ - ۷۹۴ - ۷۹۵ - ۷۹۶ - ۷۹۷ - ۷۹۸ - ۷۹۹ - ۸۰۰ - ۸۰۱ - ۸۰۲ - ۸۰۳ - ۸۰۴ - ۸۰۵ - ۸۰۶ - ۸۰۷ - ۸۰۸ - ۸۰۹ - ۸۱۰ - ۸۱۱ - ۸۱۲ - ۸۱۳ - ۸۱۴ - ۸۱۵ - ۸۱۶ - ۸۱۷ - ۸۱۸ - ۸۱۹ - ۸۲۰ - ۸۲۱ - ۸۲۲ - ۸۲۳ - ۸۲۴ - ۸۲۵ - ۸۲۶ - ۸۲۷ - ۸۲۸ - ۸۲۹ - ۸۳۰ - ۸۳۱ - ۸۳۲ - ۸۳۳ - ۸۳۴ - ۸۳۵ - ۸۳۶ - ۸۳۷ - ۸۳۸ - ۸۳۹ - ۸۴۰ - ۸۴۱ - ۸۴۲ - ۸۴۳ - ۸۴۴ - ۸۴۵ - ۸۴۶ - ۸۴۷ - ۸۴۸ - ۸۴۹ - ۸۵۰ - ۸۵۱ - ۸۵۲ - ۸۵۳ - ۸۵۴ - ۸۵۵ - ۸۵۶ - ۸۵۷ - ۸۵۸ - ۸۵۹ - ۸۶۰ - ۸۶۱ - ۸۶۲ - ۸۶۳ - ۸۶۴ - ۸۶۵ - ۸۶۶ - ۸۶۷ - ۸۶۸ - ۸۶۹ - ۸۷۰ - ۸۷۱ - ۸۷۲ - ۸۷۳ - ۸۷۴ - ۸۷۵ - ۸۷۶ - ۸۷۷ - ۸۷۸ - ۸۷۹ - ۸۸۰ - ۸۸۱ - ۸۸۲ - ۸۸۳ - ۸۸۴ - ۸۸۵ - ۸۸۶ - ۸۸۷ - ۸۸۸ - ۸۸۹ - ۸۹۰ - ۸۹۱ - ۸۹۲ - ۸۹۳ - ۸۹۴ - ۸۹۵ - ۸۹۶ - ۸۹۷ - ۸۹۸ - ۸۹۹ - ۹۰۰ - ۹۰۱ - ۹۰۲ - ۹۰۳ - ۹۰۴ - ۹۰۵ - ۹۰۶ - ۹۰۷ - ۹۰۸ - ۹۰۹ - ۹۱۰ - ۹۱۱ - ۹۱۲ - ۹۱۳ - ۹۱۴ - ۹۱۵ - ۹۱۶ - ۹۱۷ - ۹۱۸ - ۹۱۹ - ۹۲۰ - ۹۲۱ - ۹۲۲ - ۹۲۳ - ۹۲۴ - ۹۲۵ - ۹۲۶ - ۹۲۷ - ۹۲۸ - ۹۲۹ - ۹۳۰ - ۹۳۱ - ۹۳۲ - ۹۳۳ - ۹۳۴ - ۹۳۵ - ۹۳۶ - ۹۳۷ - ۹۳۸ - ۹۳۹ - ۹۴۰ - ۹۴۱ - ۹۴۲ - ۹۴۳ - ۹۴۴ - ۹۴۵ - ۹۴۶ - ۹۴۷ - ۹۴۸ - ۹۴۹ - ۹۵۰ - ۹۵۱ - ۹۵۲ - ۹۵۳ - ۹۵۴ - ۹۵۵ - ۹۵۶ - ۹۵۷ - ۹۵۸ - ۹۵۹ - ۹۶۰ - ۹۶۱ - ۹۶۲ - ۹۶۳ - ۹۶۴ - ۹۶۵ - ۹۶۶ - ۹۶۷ - ۹۶۸ - ۹۶۹ - ۹۷۰ - ۹۷۱ - ۹۷۲ - ۹۷۳ - ۹۷۴ - ۹۷۵ - ۹۷۶ - ۹۷۷ - ۹۷۸ - ۹۷۹ - ۹۸۰ - ۹۸۱ - ۹۸۲ - ۹۸۳ - ۹۸۴ - ۹۸۵ - ۹۸۶ - ۹۸۷ - ۹۸۸ - ۹۸۹ - ۹۹۰ - ۹۹۱ - ۹۹۲ - ۹۹۳ - ۹۹۴ - ۹۹۵ - ۹۹۶ - ۹۹۷ - ۹۹۸ - ۹۹۹ - ۱۰۰۰

طبری ج ۶ ص ۲۲۹ - ۲۳۰ - ۲۳۱ - ۲۳۲ - ۲۳۳ - ۲۳۴ - ۲۳۵ - ۲۳۶ - ۲۳۷ - ۲۳۸ - ۲۳۹ - ۲۴۰ - ۲۴۱ - ۲۴۲ - ۲۴۳ - ۲۴۴ - ۲۴۵ - ۲۴۶ - ۲۴۷ - ۲۴۸ - ۲۴۹ - ۲۵۰ - ۲۵۱ - ۲۵۲ - ۲۵۳ - ۲۵۴ - ۲۵۵ - ۲۵۶ - ۲۵۷ - ۲۵۸ - ۲۵۹ - ۲۶۰ - ۲۶۱ - ۲۶۲ - ۲۶۳ - ۲۶۴ - ۲۶۵ - ۲۶۶ - ۲۶۷ - ۲۶۸ - ۲۶۹ - ۲۷۰ - ۲۷۱ - ۲۷۲ - ۲۷۳ - ۲۷۴ - ۲۷۵ - ۲۷۶ - ۲۷۷ - ۲۷۸ - ۲۷۹ - ۲۸۰ - ۲۸۱ - ۲۸۲ - ۲۸۳ - ۲۸۴ - ۲۸۵ - ۲۸۶ - ۲۸۷ - ۲۸۸ - ۲۸۹ - ۲۹۰ - ۲۹۱ - ۲۹۲ - ۲۹۳ - ۲۹۴ - ۲۹۵ - ۲۹۶ - ۲۹۷ - ۲۹۸ - ۲۹۹ - ۳۰۰ - ۳۰۱ - ۳۰۲ - ۳۰۳ - ۳۰۴ - ۳۰۵ - ۳۰۶ - ۳۰۷ - ۳۰۸ - ۳۰۹ - ۳۱۰ - ۳۱۱ - ۳۱۲ - ۳۱۳ - ۳۱۴ - ۳۱۵ - ۳۱۶ - ۳۱۷ - ۳۱۸ - ۳۱۹ - ۳۲۰ - ۳۲۱ - ۳۲۲ - ۳۲۳ - ۳۲۴ - ۳۲۵ - ۳۲۶ - ۳۲۷ - ۳۲۸ - ۳۲۹ - ۳۳۰ - ۳۳۱ - ۳۳۲ - ۳۳۳ - ۳۳۴ - ۳۳۵ - ۳۳۶ - ۳۳۷ - ۳۳۸ - ۳۳۹ - ۳۴۰ - ۳۴۱ - ۳۴۲ - ۳۴۳ - ۳۴۴ - ۳۴۵ - ۳۴۶ - ۳۴۷ - ۳۴۸ - ۳۴۹ - ۳۵۰ - ۳۵۱ - ۳۵۲ - ۳۵۳ - ۳۵۴ - ۳۵۵ - ۳۵۶ - ۳۵۷ - ۳۵۸ - ۳۵۹ - ۳۶۰ - ۳۶۱ - ۳۶۲ - ۳۶۳ - ۳۶۴ - ۳۶۵ - ۳۶۶ - ۳۶۷ - ۳۶۸ - ۳۶۹ - ۳۷۰ - ۳۷۱ - ۳۷۲ - ۳۷۳ - ۳۷۴ - ۳۷۵ - ۳۷۶ - ۳۷۷ - ۳۷۸ - ۳۷۹ - ۳۸۰ - ۳۸۱ - ۳۸۲ - ۳۸۳ - ۳۸۴ - ۳۸۵ - ۳۸۶ - ۳۸۷ - ۳۸۸ - ۳۸۹ - ۳۹۰ - ۳۹۱ - ۳۹۲ - ۳۹۳ - ۳۹۴ - ۳۹۵ - ۳۹۶ - ۳۹۷ - ۳۹۸ - ۳۹۹ - ۴۰۰ - ۴۰۱ - ۴۰۲ - ۴۰۳ - ۴۰۴ - ۴۰۵ - ۴۰۶ - ۴۰۷ - ۴۰۸ - ۴۰۹ - ۴۱۰ - ۴۱۱ - ۴۱۲ - ۴۱۳ - ۴۱۴ - ۴۱۵ - ۴۱۶ - ۴۱۷ - ۴۱۸ - ۴۱۹ - ۴۲۰ - ۴۲۱ - ۴۲۲ - ۴۲۳ - ۴۲۴ - ۴۲۵ - ۴۲۶ - ۴۲۷ - ۴۲۸ - ۴۲۹ - ۴۳۰ - ۴۳۱ - ۴۳۲ - ۴۳۳ - ۴۳۴ - ۴۳۵ - ۴۳۶ - ۴۳۷ - ۴۳۸ - ۴۳۹ - ۴۴۰ - ۴۴۱ - ۴۴۲ - ۴۴۳ - ۴۴۴ - ۴۴۵ - ۴۴۶ - ۴۴۷ - ۴۴۸ - ۴۴۹ - ۴۵۰ - ۴۵۱ - ۴۵۲ - ۴۵۳ - ۴۵۴ - ۴۵۵ - ۴۵۶ - ۴۵۷ - ۴۵۸ - ۴۵۹ - ۴۶۰ - ۴۶۱ - ۴۶۲ - ۴۶۳ - ۴۶۴ - ۴۶۵ - ۴۶۶ - ۴۶۷ - ۴۶۸ - ۴۶۹ - ۴۷۰ - ۴۷۱ - ۴۷۲ - ۴۷۳ - ۴۷۴ - ۴۷۵ - ۴۷۶ - ۴۷۷ - ۴۷۸ - ۴۷۹ - ۴۸۰ - ۴۸۱ - ۴۸۲ - ۴۸۳ - ۴۸۴ - ۴۸۵ - ۴۸۶ - ۴۸۷ - ۴۸۸ - ۴۸۹ - ۴۹۰ - ۴۹۱ - ۴۹۲ - ۴۹۳ - ۴۹۴ - ۴۹۵ - ۴۹۶ - ۴۹۷ - ۴۹۸ - ۴۹۹ - ۵۰۰ - ۵۰۱ - ۵۰۲ - ۵۰۳ - ۵۰۴ - ۵۰۵ - ۵۰۶ - ۵۰۷ - ۵۰۸ - ۵۰۹ - ۵۱۰ - ۵۱۱ - ۵۱۲ - ۵۱۳ - ۵۱۴ - ۵۱۵ - ۵۱۶ - ۵۱۷ - ۵۱۸ - ۵۱۹ - ۵۲۰ - ۵۲۱ - ۵۲۲ - ۵۲۳ - ۵۲۴ - ۵۲۵ - ۵۲۶ - ۵۲۷ - ۵۲۸ - ۵۲۹ - ۵۳۰ - ۵۳۱ - ۵۳۲ - ۵۳۳ - ۵۳۴ - ۵۳۵ - ۵۳۶ - ۵۳۷ - ۵۳۸ - ۵۳۹ - ۵۴۰ - ۵۴۱ - ۵۴۲ - ۵۴۳ - ۵۴۴ - ۵۴۵ - ۵۴۶ - ۵۴۷ - ۵۴۸ - ۵۴۹ - ۵۵۰ - ۵۵۱ - ۵۵۲ - ۵۵۳ - ۵۵۴ - ۵۵۵ - ۵۵۶ - ۵۵۷ - ۵۵۸ - ۵۵۹ - ۵۶۰ - ۵۶۱ - ۵۶۲ - ۵۶۳ - ۵۶۴ - ۵۶۵ - ۵۶۶ - ۵۶۷ - ۵۶۸ - ۵۶۹ - ۵۷۰ - ۵۷۱ - ۵۷۲ - ۵۷۳ - ۵۷۴ - ۵۷۵ - ۵۷۶ - ۵۷۷ - ۵۷۸ - ۵۷۹ - ۵۸۰ - ۵۸۱ - ۵۸۲ - ۵۸۳ - ۵۸۴ - ۵۸۵ - ۵۸۶ - ۵۸۷ - ۵۸۸ - ۵۸۹ - ۵۹۰ - ۵۹۱ - ۵۹۲ - ۵۹۳ - ۵۹۴ - ۵۹۵ - ۵۹۶ - ۵۹۷ - ۵۹۸ - ۵۹۹ - ۶۰۰ - ۶۰۱ - ۶۰۲ - ۶۰۳ - ۶۰۴ - ۶۰۵ - ۶۰۶ - ۶۰۷ - ۶۰۸ - ۶۰۹ - ۶۱۰ - ۶۱۱ - ۶۱۲ - ۶۱۳ - ۶۱۴ - ۶۱۵ - ۶۱۶ - ۶۱۷ - ۶۱۸ - ۶۱۹ - ۶۲۰ - ۶۲۱ - ۶۲۲ - ۶۲۳ - ۶۲۴ - ۶۲۵ - ۶۲۶ - ۶۲۷ - ۶۲۸ - ۶۲۹ - ۶۳۰ - ۶۳۱ - ۶۳۲ - ۶۳۳ - ۶۳۴ - ۶۳۵ - ۶۳۶ - ۶۳۷ - ۶۳۸ - ۶۳۹ - ۶۴۰ - ۶۴۱ - ۶۴۲ - ۶۴۳ - ۶۴۴ - ۶۴۵ - ۶۴۶ - ۶۴۷ - ۶۴۸ - ۶۴۹ - ۶۵۰ - ۶۵۱ - ۶۵۲ - ۶۵۳ - ۶۵۴ - ۶۵۵ - ۶۵۶ - ۶۵۷ - ۶۵۸ - ۶۵۹ - ۶۶۰ - ۶۶۱ - ۶۶۲ - ۶۶۳ - ۶۶۴ - ۶۶۵ - ۶۶۶ - ۶۶۷ - ۶۶۸ - ۶۶۹ - ۶۷۰ - ۶۷۱ - ۶۷۲ - ۶۷۳ - ۶۷۴ - ۶۷۵ - ۶۷۶ - ۶۷۷ - ۶۷۸ - ۶۷۹ - ۶۸۰ - ۶۸۱ - ۶۸۲ - ۶۸۳ - ۶۸۴ - ۶۸۵ - ۶۸۶ - ۶۸۷ - ۶۸۸ - ۶۸۹ - ۶۹۰ - ۶۹۱ - ۶۹۲ - ۶۹۳ - ۶۹۴ - ۶۹۵ - ۶۹۶ - ۶۹۷ - ۶۹۸ - ۶۹۹ - ۷۰۰ - ۷۰۱ - ۷۰۲ - ۷۰۳ - ۷۰۴ - ۷۰۵ - ۷۰۶ - ۷۰۷ - ۷۰۸ - ۷۰۹ - ۷۱۰ - ۷۱۱ - ۷۱۲ - ۷۱۳ - ۷۱۴ - ۷۱۵ - ۷۱۶ - ۷۱۷ - ۷۱۸ - ۷۱۹ - ۷۲۰ - ۷۲۱ - ۷۲۲ - ۷۲۳ - ۷۲۴ - ۷۲۵ - ۷۲۶ - ۷۲۷ - ۷۲۸ - ۷۲۹ - ۷۳۰ - ۷۳۱ - ۷۳۲ - ۷۳۳ - ۷۳۴ - ۷۳۵ - ۷۳۶ - ۷۳۷ - ۷۳۸ - ۷۳۹ - ۷۴۰ - ۷۴۱ - ۷۴۲ - ۷۴۳ - ۷۴۴ - ۷۴۵ - ۷۴۶ - ۷۴۷ - ۷۴۸ - ۷۴۹ - ۷۵۰ - ۷۵۱ - ۷۵۲ - ۷۵۳ - ۷۵۴ - ۷۵۵ - ۷۵۶ - ۷۵۷ - ۷۵۸ - ۷۵۹ - ۷۶۰ - ۷۶۱ - ۷۶۲ - ۷۶۳ - ۷۶۴ - ۷۶۵ - ۷۶۶ - ۷۶۷ - ۷۶۸ - ۷۶۹ - ۷۷۰ - ۷۷۱ - ۷۷۲ - ۷۷۳ - ۷۷۴ - ۷۷۵ - ۷۷۶ - ۷۷۷ - ۷۷۸ - ۷۷۹ - ۷۸۰ - ۷۸۱ - ۷۸۲ - ۷۸۳ - ۷۸۴ - ۷۸۵ - ۷۸۶ - ۷۸۷ - ۷۸۸ - ۷۸۹ - ۷۹۰ - ۷۹۱ - ۷۹۲ - ۷۹۳ - ۷۹۴ - ۷۹۵ - ۷۹۶ - ۷۹۷ - ۷۹۸ - ۷۹۹ - ۸۰۰ - ۸۰۱ - ۸۰۲ - ۸۰۳ - ۸۰۴ - ۸۰۵ - ۸۰۶ - ۸۰۷ - ۸۰۸ - ۸۰۹ - ۸۱۰ - ۸۱۱ - ۸۱۲ - ۸۱۳ - ۸۱۴ - ۸۱۵ - ۸۱۶ - ۸۱۷ - ۸۱۸ - ۸۱۹ - ۸۲۰ - ۸۲۱ - ۸۲۲ - ۸۲۳ - ۸۲۴ - ۸۲۵ - ۸۲۶ - ۸۲۷ - ۸۲۸ - ۸۲۹ - ۸۳۰ - ۸۳۱ - ۸۳۲ - ۸۳۳ - ۸۳۴ - ۸۳۵ - ۸۳۶ - ۸۳۷ - ۸۳۸ - ۸۳۹ - ۸۴۰ - ۸۴۱ - ۸۴۲ - ۸۴۳ - ۸۴۴ - ۸۴۵ - ۸۴۶ - ۸۴۷ - ۸۴۸ - ۸۴۹ - ۸۵۰ - ۸۵۱ - ۸۵۲ - ۸۵۳ - ۸۵۴ - ۸۵۵ - ۸۵۶ - ۸۵۷ - ۸۵۸ - ۸۵۹ - ۸۶۰ - ۸۶۱ - ۸۶۲ - ۸۶۳ - ۸۶۴ - ۸۶۵ - ۸۶۶ - ۸۶۷ - ۸۶۸ - ۸۶۹ - ۸۷۰ - ۸۷۱ - ۸۷۲ - ۸۷۳ - ۸۷۴ - ۸۷۵ - ۸۷۶ - ۸۷۷ - ۸۷۸ - ۸۷۹ - ۸۸۰ - ۸۸۱ - ۸۸۲ - ۸۸۳ -

معلوم ہوتا ہے کہ امام کے ساتھ حر کے روادارانہ برتاؤ کی اطلاع ابن زیاد کو ہوئی اس کا اہم کے پیچھے اپنی فوج سمیت نماز پڑھنا اور پھر کوڑے جانے کے مطالبہ سے دست بردار ہو کر یہ صورت بخیر نہ کرنا کہ مدینہ اور کوڑے کے علاوہ دوسرا کوئی راستہ اختیار کیا جائے۔ یہ باتیں وہ کہتی ہیں جن سے حر کی وفاداری ابن زیاد کی نگاہ میں مشکوک بن جائے اور شاید اسی بناء پر اسے ضرورت محسوس ہوئی کہ وہ اپنے حکم کی تعمیل میں حر کی نگرانی اپنے قاصد سے کرائے ہوئے جو کچھ بھی ابھی تک دنیا کا بندہ تھا اس لیے ہزار ناپاری و مجبوری اور ناخوستگی طبع کے ساتھ ہی مگر اس نے امام اور آپ کے اصحاب کے رد و بد آ کر یہ اعلان کیا کہ یہ امیر ابن زیاد کا خط ہے۔ اس میں مجھے حکم دیا گیا ہے کہ جہاں بھی مجھے یہ خط پہنچے وہیں پر میں آپ کو اترنے پر مجبور کر دوں اور ابن زیاد کا قاصد ہے جسے حکم ہے کہ وہ مجھ سے بغیر اس حکم کی تعمیل کرائے ہوئے الگ ہی نہ ہو۔ اس طرح حر نے واقعی ضرورت حال کو صفائی کے ساتھ پیش کر دیا۔ اس کے بعد امام نے نہ چاہا کہ اس کے ضمیر کی طاقت کا زیادہ امتحان لیا جائے۔ آپ نے اتنا کہا کہ اچھا تم کو ذرا آگے بڑھ کر اس قریہ میں قیام کرنے دو جس کا نام قاضیہ ہے یا اس دوسرے قریہ میں جس کا نام شفیقہ ہے بلکہ مگر حر نے کہا کہ مجھے اس کا اختیار نہیں ہے۔ مجھے تو حکم ہے کہ میں آپ کو ایسے خشک صحرا میں اتار دوں جہاں آب و گیارہ ہو اور یہ شخص مجھ پر نگران مقرر کیا گیا ہے کہ یہ میرے طرز عمل کی جاکر اطلاع دے۔ اس جواب پر اصحاب امام میں ہوش پیدا ہو گیا اور تیسرے قریہ کے کہا کہ ”فرزند رسول! ان سے جنگ کر لینا ہمارے لیے آسان ہے بہ نسبت ان لوگوں سے جنگ کرنے کے جو ان کے بعد آئیں گے“ مگر اس کے بعد اتنی فوجیں آئیں گی کہ ان کے مقابلہ کی ہم میں طاقت نہ ہوگی“ مگر امام نے فرمایا کہ میں نے جنگ میں ابتدا کرنا نہیں چاہتا۔

آخر امام حسین نے حر سے فرمایا کہ اچھا کچھ تو چلنے دو، اور حر خاموش ہو گیا۔

کربلا: امام ذرا بائیں طرف مڑ کر تھوڑا سا چلے تھے کہ سپاہ حر سامنے آکر سد راہ ہو گئی اور کہا

”وہابی نے سبقہ لکھا ہے (الاخبار الطوال ص ۲۵) طبری ج ۶ ص ۲۳۶۔ ارشاد ص ۲۳۸۔

”اَللّٰهُمَّ اِنَّا اِلَيْكَ رَاجِعُونَ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ“ دو تین مرتبہ آپ نے یہی کلمات مبارک پرجاری فرمائے۔

اس وقت آپ کے فرزند علی اکبر گھوڑا بڑھا کر آپ کے قریب آئے اور اس وقت ان کے زبانی پرجاری کرنے کا سبب دریافت کیا حضرت نے فرمایا۔ ”ابھی میری آنکھ لگ گئی تھی۔“ نے ایک سوار کو دیکھا جو کہہ رہا تھا کہ ”یہ لوگ تو راستے پر جا رہے ہیں اور موت ان کی طرف آ رہی ہے“ میں سمجھتا ہوں کہ اس طرح ہماری موت کی اطلاع دی گئی ہے۔“ علی اکبر نے عرض کیا کہ خدا آپ کو رنج کی صورت نہ دکھلائے، کیا ہم حق پر نہیں ہیں؟ امام نے فرمایا ”کیوں نہیں؟ قسم اس خدا کی جس کی جانب تمام خلق کی بازگشت ہے، ہم حق پر ہیں“ علی اکبر نے کہا ”خیر ہم حق پر ہیں تو پھر ہمیں موت کی کیا پروا ہے؟“ امام نے فرمایا۔ ”بیٹا تمہیں خدا جزائے فردوس بہترین جزا جو کسی بیٹے کو اس کے باپ کی طرف سے مل سکتی ہو۔“ یہ عزت نفس، اطمینان قلب و ثبات ضمیر کا عجیب مرقع تھا۔

۱۰۔ نینوا: قافلہ راستہ قطع کر رہا ہے۔ امام آگے بڑھتے جا رہے ہیں اور حر کی طرف بھی کوئی مزاحمت نہیں کی جا رہی ہے۔ یہاں تک کہ نینوا کی زمین تک پہنچنا ہوا۔ میل سوار ستر کوڑے کی طرف سے آتا دکھائی دیا، اور سب ٹھہر کر اس کا انتظار کرنے لگے جبکہ پہنچا تو اس نے حر اور اس کے اصحاب کو تو سلام کیا لیکن حسین اور اصحاب حسین کو سلام نہ دیا۔ ضروری نہیں سمجھا۔ یہ ابن زیاد کا قاصد تھا جو حر کے نام خط لایا تھا۔ اس خط میں کہا کہ تم کو لازم ہے کہ جہاں پر تم کو یہ خط پہنچے وہیں پر حسین کو آگے بڑھنے سے روک دو اور ایسی جگہ قیام کرنے پر مجبور کرو جہاں آب و گیارہ موجود نہ ہو اور نہ کوئی قلعہ یا جگہ پناہ دے۔ اپنے فرستادہ کو حکم دے دیا ہے کہ وہ تمہارے ساتھ ساتھ رہے اور تمہاری کارروائی کی مجھے اطلاع دے۔ اور تم سے جدا نہ ہو جب تک کہ میرے حکم کی تعمیل نہ ہو جائے۔

طبری ج ۶ ص ۲۳۶۔ ارشاد ص ۲۳۸۔ ۲۳۹۔ ۲۴۰۔ ۲۴۱۔ ۲۴۲۔ ۲۴۳۔ ۲۴۴۔ ۲۴۵۔ ۲۴۶۔ ۲۴۷۔ ۲۴۸۔ ۲۴۹۔ ۲۵۰۔

اور سابقہ عملہ آمد کی وجہ سے جو صدیوں سے قائم تھا عرب کے اس خطہ کو تمام مختلف اخیال قبائل عرب کا محل اجتماع ہونا ضروری تھا۔ وہ شہور کا نفرین جو شعر و سخن اور خرید و فروخت کے لیے قائم ہوتی تھیں جن کو اسواق العرب کہا جاتا تھا۔ ذیقعد سے لیکر محرم تک مکہ و طائف اور مدینہ کے درمیان ہی قائم ہوتی تھیں۔ امام حسین کی شخصیت دنیائے عرب میں کوئی اجنبیت نہ رکھتی تھی اگرچہ مذہبی احساسات مردہ ہو گئے تھے اور حضرت کو آپ کے پورے مراتب کے ساتھ لوگ نہ پہچانتے تھے لیکن رسول کے نواسے، سلطان حجاز و عراق کے فرزند، ملک عرب کے سب سے بڑے سخی جن کے در سے کوئی سائل محروم نہیں پھرا، بنی ہاشم کے بزرگ خاندان اور اسلام کے سب سے بڑے عالم، پیغمبر کا اجتماع کا تھا کہ میں اپنے قیام کے لیے تجویز کیا۔ امام حسین کا یہاں خاموشی کے ساتھ قیام بھی تمام اطراف ملک میں آپ کی بیعت یزید سے کنارہ کشی کے اعلان کے لیے کافی تھا اور یہی سب سے بڑی وہ وجہ تھی جس کی بنا پر آپ کی زندگی سیاست و قت کے لیے یہاں بھی ناقابل برداشت ثابت ہوئی چنانچہ یزید کی طرف سے حاجیوں کے بھیس میں آدمی بھیجے گئے تاکہ وہ آپ کو گرفتار کر لیں یا قتل کر دیں امام حسین جیسا کہ آپ نے مکہ سے روانگی کے وقت فرمایا تھا یہ نہ چاہتے تھے کہ آپ مکہ کے اندر شہید کیے جائیں جس کی بنا پر خانہ کعبہ کی حرمت زائل ہو۔ پھر یہ بھی ظاہر ہے کہ خانہ کعبہ کے گرد و پیش حج کے زمانہ میں ہر قسم کے لوگ ہر طرف سے آئے ہوئے ہوتے ہیں اور امام حسین کے لیے یہ غیر ممکن تھا کہ آپ عرفات، منی، مشعر، مقام ہرجہ اپنے ساتھ محافظ رکھتے۔ ایسی صورت میں بہت آسان تھا کہ حجر اسود کے استلام کے وقت، عرفات میں، وقوف کی حالت میں، مشعر کی طرف واپسی کے دوران میں، منی میں قربانی کے موقع پر، مقام ابراہیم میں نماز پڑھنے کی حالت میں کسی دقت آپ پر قائمانہ حمد ہو جاتا اور قاتل موجود ہنگامہ وار ہام کے اندر گم ہو جاتے۔ اس کے بعد کون کہہ سکتا تھا کہ حسین کا قاتل حقیقتاً یزید یا اس کا کوئی فرستادہ ہے۔

اس شدید خطرہ کی بنا پر امام حسین نے مکہ کو چھوڑا اس طرح کہ حج کو بھی مکمل نہ کیا جس کا سبب

کہیں نہیں اتر پڑیے۔ فرات یہاں سے دور نہیں ہے۔ امام نے نام پوچھا، معلوم ہوا کہ بلا۔ فرمایا "اچھا کرب دہلا کی یہی منزل ہے" یہ کہہ کر گھوڑے سے اتر پڑے۔ یہ دوسری محرم ۶۱ھ بمطابق ۶۱ھ کا دن تھا۔

اب جبکہ امام کا سفر منزل آخر تک پہنچ گیا تو ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس سفر کے مختلف پہلوؤں پر ایک سیر حاصل تبصرہ کر دیا جائے تاکہ اسکی اہمیت اور ضرورت کچھ اور واضح ہو جائے۔

یہ تو پہلے بیان ہو چکا ہے کہ امام کا مقصد یزید سے اس طرح کی جنگ کرنا نہ تھا جیسی دنیا میں ہوا کرتی ہے۔ آپ کو نہ سلطنت کا حاصل کرنا مقصود تھا۔ نہ براہ راست یزید کی سلطنت کا ختم کرنا بلکہ آپ کا مقصد یہ تھا کہ مسلمانوں کو خواب غفلت سے بیدار کر دیں اور ان میں ایک ایسا انقلاب ذہنی پیدا کر دیں کہ وہ یزید کی کردار کو اس کی اصلی شکل میں دیکھنے لگیں اور اس کے ظاہری دعوئے اسلام سے دھوکا نہ کھائیں۔ اس کے لیے آپ نے مدینہ سے روانگی اختیار کی۔ جہاں تک مدینہ سے نکلنے کا تعلق ہے پورے طور سے اس پر تبصرہ کیا جا چکا ہے۔ اگر آپ مدینہ میں قیام کر کے اور وہاں رہ کر یزید کے مقابلہ میں جنگ کرتے یا قربانی پیش کرتے تو اس سے وہ نوعیت پیدا ہی نہ ہوتی جو آپ کو مد نظر تھی۔ یا نہ ہر کام کرتا اور یا تلوار مگر تو اکیسی جس کی ذمہ داری کسی صورت سے سلطنت شام پر عائد نہ ہو سکتی بلکہ کوئی خارجی نکلتا ابن ابی نجیم کا سا جس نے علی کو شہید کیا تھا یا کوئی تیرا آؤدی نہیں کہ جنوں کی طرف سے جیسا کہ اسلامی تاریخ میں سعد بن عبادہ کا شام میں خاتمہ ہوا تھا۔ یہی ہوتی ہیں تمام حکومتوں کی مشہور کاریاں جن کا نام دینے "سیاست" رکھا ہے۔ حضرت امام اس طرح کی سیاست کے گردل کو خوب سمجھتے تھے چاہے خود اخلاقی و اسلامی پابندیوں کی وجہ سے اختیار نہ کریں۔ انھوں نے مدینہ ان لیے چھوڑا کہ انکا واقعہ شہادت کوئی اچانک اور بے سان گمان کا حادثہ نہ سمجھا جائے۔ جہاں قیام کیا کجماں، مگر مشعر میں جو قلب جزیرۃ العرب تھا اور جہاں حج کے لیے بہر حال ہر طرف سے کھینچ کھینچ کر مسلمان جمع ہوتے تھے۔ غرض فریقہ حج کے جو اسلامی شریعت کی رو سے ہر مستطیع مسلمان پر واجب ہے۔ خود عرب کے قدیم روایات

مخصوص دہوہ تراشنے کا موقع نہیں مل سکا اور امام حسینؑ کی مظلومیت و حقانیت پر پردہ نہ ڈالا جاسکا۔ لیکن اگر ایسا نہ ہوتا تو سلطنت یزید کی طرف سے امام کی شہادت کو طرح طرح کے لباس پہنائے جاتے اور آئین و شعار اسلام کے تحفظ کا وہ بلند مقام جو امام کے پیش نظر تھا اتنے کامیاب طریقہ پر حاصل نہ ہوتا۔ مگر یہ امام کے انتہائی مدبرانہ طریقہ کار کا نتیجہ تھا کہ ادھر امام شہید ہوئے اور ادھر تمام دنیا نے اس بات کو تسلیم کر لیا کہ آپ ناحق قتل کیے گئے۔ شام کا حاکم اور اس کے وزراء اور ہوا خواہ کسی نعمت کے تراشنے کا موقع نہ پاسکے۔ اس لیے کہ امام حسینؑ نے اپنی نقل و حرکت کے اسباب کو اپنی شہادت کے پہلے ہی عالم اسلام میں شائع کر کے دشمنوں کی زبانیں بند کر دیں اور اپنی حقانیت کے سامنے دنیا کا سرخم کرا لیا۔

نتیجہ کے اعتبار سے کہا جاسکتا ہے کہ حسینؑ کا قافلہ جو مکہ سے نکل کر جا رہا تھا ایک خاموش مبلغ تھا۔ اس لیے کہ حج کی وجہ سے عراق، یمن، طائف وغیرہ سب طرف سے قبائل مکہ میں آئے تھے اور ادھر امام حسینؑ اپنے اہل و اقرباء، انصار و اصحاب کی جماعت کے ساتھ خیمہ و خمر گاہ تمام اسباب ساتھ لیے ایک قافلہ کی صورت میں مکہ سے جا رہے تھے۔ عالم مسافرت میں زندگی گزارنے والے واقف ہیں کہ راستے میں چار پانچ آدمیوں کا بھی قافلہ نظر آئے تو کھوج پیدا ہو جاتی ہے کہ یہ کون لوگ ہیں؟ کہاں سے آتے ہیں؟ اور کیوں؟ پھر کہاں امام حسینؑ اور آپ کے اصحاب و انصار کا شاندار قافلہ حج کو صرف دو دن باقی رہتے ہوئے مکہ معظمہ کی طرف سے آ رہا ہو جبکہ دنیا مکہ معظمہ کی طرف حج کے لیے جا رہی ہو۔ یہ دہوہ یقیناً مجاذب نظر اور باعث توجہ تھے اور ایک اجنبی شخص کو یہ پوچھنا ناگزیر تھا کہ یہ کون جماعت ہے؟ اور کہاں جا رہی ہے؟ اور حسینؑ کا نام معلوم ہونے پر اسی قسم کا مکالمہ جیسا اوپر درج ہو چکا ہے، ان کے درمیان لازمی طور پر تفرج ہو جاتا ہو گا۔ چنانچہ تاریخیں شاہد ہیں کہ فردق کی ملاقات امام سے یونہی ہوئی اور عبداللہ بن مطیع اور عمر بن عبدالرحمن خنزرجی کی بھی کردہ مکہ کی طرف جا رہے تھے اور امام مکہ کی طرف سے آ رہے تھے اس سے ظاہر ہے کہ حسینؑ بن علیؑ اور ہاشمی جوانوں کا شاندار قافلہ جو خانہ خدا کو بحجوری چھوڑ کر

وہی ہنگامی صورت حال تھی جو پیدا ہو گئی تھی مگر جیسا کہ علامہ سید سببہ الدین شہرستانی نے مہضۃ الحسین میں لکھا ہے اس طرح دفعۃً ایسے موقع پر امام کی روانگی نے تمام قبائل عرب کے نمائندوں میں ایک بجلی کی سی لہر دوڑادی۔ اور اگر کوئی تاریخ اس موقع کی مکمل اسی وقت قلمبند کی گئی ہوتی تو اس میں ضرور نظر آتا کہ اس موقع پر کن خیالات کا اظہار کیا جاتا تھا۔ حسین بن علیؑ کہاں چلے گئے؟ حج بھی نہ کیا؟ آخر تمام اہل و عیال و اقرباء کے ساتھ اپنے نانا کی قبر کے جوار کو کیوں چھوڑ دیا؟

”یزید کے خوف سے۔“

”کیوں؟ یزید کیا چاہتا ہے؟“

”حسینؑ سے بیعت کا طالب ہے۔“

لاحول ولاقوة۔ بھلا ایسا کیونکر ہو سکتا ہے؟ فرزند رسولؐ ساتھ آشنا یزید لیے شہر خجرا اور زنا کار کی بیعت کرے! اچھا پھر مکہ معظمہ میں کیوں قیام نہ کیا؟ کس لیے حج کو بھی مکمل نہ کیا؟ ”جان کا خطرہ تھا۔ شاید مکہ میں حسینؑ کو قتل کرنے کے لیے شام سے کچھ لوگ بھیجے گئے تھے۔“ تو یہ تو یہ! اس سے بڑھ کر سفاکی اور ظلم کیا ہو گا؟ اُسے فرزند رسولؐ کو حرم میں بھی جین نہ لینے دیا۔ کم و بیش اس قسم کے تذکرے ہوں گے جو مکہ معظمہ اور اس کے اطراف و جوانب میں اکثر باخبر حلقوں میں بڑی قوت کے ساتھ پورے ہوں گے۔ اس زمانہ میں جب مراسلت و مخابرات کے طریقے محدود تھے اور تار ٹیلیفون، ریڈیو وغیرہ خبر رسانی کے ذرائع نایاب، اس سے بہتر کوئی صورت و اوقات کی اشاعت کے لیے نہیں ہو سکتی تھی اس لیے کہ بعد ازاں تمام حج جو شخص بھی اپنے شہر میں واپس آتا اس کو تازہ واقعات کے ضمن میں حسینؑ کی نقل و حرکت اور اس کے اسباب و علل کا بیان کرنا ضروری تھا۔

اس کا مطلب یہ نہیں کہ امام کی موافقت میں کسی لشکر کے جمع ہونے کا امکان پیدا ہو گیا تھا بلکہ یہ کہ پہلے سے ان حالات کی اشاعت ہو جانے کی وجہ سے آپ کی شہادت نامعلوم اسباب و علل کا نتیجہ قرار نہیں دی جاسکتی اور حکومت شام کو اس کے متعلق اپنے سیاسی مفاد کے لحاظ سے

بزرگ نہیں تھا بلکہ اس حد سے بڑھے ہوئے ارادہ کی پذیرائی اور غیر معمولی طلب و دعوت کی قبولیت تھی جس سے اتمام حجت کا مقصد پورا ہوتا تھا تو اس ارادہ کو اتنے پر کہ آپ کو مسلم کی غیر شہادت مل گئی متزلزل نہ ہونا چاہیے تھا۔ بلکہ استقلال و ثبات قدم، کوہ آسا عزم اور پختگی ارادہ، وعدہ کی پابندی اور اصول کے تحفظ کا تقاضا یہ تھا کہ آپ عملاً اس کا ثبوت پیش کر دیتے کہ آپ اپنے وعدہ پر قائم رہے۔ یہاں تک کہ آگے بڑھنے میں خونریزی اور نقصان اس عہد کے باعث ہونے کا اندیشہ ہو گیا۔ اس کے علاوہ اہل مسلم کی شہادت کے تفصیلی حالات بھی تو عام طور پر لوگوں کو معلوم نہ تھے اور ظاہری اسباب کی بنا پر یہ ممکن تھا کہ وہ بڑی خونریزی لڑائی کے بعد شہید ہوئے ہوں جس میں اہل کوفہ نے پورے طور پر داد و شجاعت دی ہو لیکن سرکاری فوج کے مقابلہ میں سربر نہ ہوئے ہوں اور ممکن ہے ان کے دل میں یہ ارمان ہوتا یا بعد میں کہنے کا موقع ملے کہ اگر امام حسینؑ اُجھڑتے تو ہمیں تازہ قوت حاصل دجاتی اور حالات کا درجہ بالکل بدل جاتا اس صورت میں آپ کا یہیں سے واپس ہو جانا جبکہ کوفہ کے بہت سے لوگ گویا آپ ہی کی خاطر سے ایک بڑی مصیبت اور کشمکش میں مبتلا ہو چکے، بڑی کمزوری اور کم ہمتی کا نمونہ سمجھا جاسکتا تھا۔ آپ نے ارادہ میں تبدیلی کی بس اس وقت جب خبر کا لشکر آپ سے دوچار ہوا اور یہ معلوم ہوا کہ وہ آپ کو ابن زیاد کے پاس لے جانے پر مامور ہے۔ اب امام نے اپنا ارادہ بدل دیا اس لیے کہ اب آپ کا آگے بڑھنا دوسری صورتوں سے ہو سکتا تھا۔ ایک تو یہ کہ آپ جنگ آزمایا نہ صورت سے فوجوں کو درہم و درہم اور راستے کو صاف کرتے، آگے کوفہ پر حملہ آور ہوتے اور ابن زیاد کو کوفہ سے نکال کر وہاں اپنی عملداری قائم کرتے، دوسرے یہ کہ آپ مبر و خاشی کے ساتھ جو طرح اب تک آ رہے تھے اسی طرح کوفہ کی طرف اپنی رفتار کو جاری رکھتے۔

دوسری صورت موجودہ حالات میں غیر ممکن تھی کیونکہ اب تک آپ کا آگے بڑھنا خود مختار ارادہ و حیثیت سے اور خود اپنے ارادہ سے تھا مگر فوج کے اس قصد سے آنے کے بعد کہ وہ آپ کا کوفہ ابن زیاد کے پاس لے جانے آپ کا خاموشی کے ساتھ آگے بڑھنا اس فوج کے ماتھے میں اسیر

دشت غربت میں راہ پیمایا تھا دور دور کے لوگوں کو حالات کی تحقیق اور حقیقت کے سمجھنے پر مجبور کر دیتا تھا۔ مکہ سے نکلنے کے بعد آپ نے کوفہ کا رخ کیا۔ اس لیے کہ اہل کوفہ کے انتہائی اصرار کو عدم اعتناء کی بنا پر مسترد کر دینا اخلاقی و مذہبی حیثیت سے کسی طرح آپ کے نزدیک مناسب نہ تھا خصوصاً جبکہ آپ کے معتمد سفیر (مسلم بن عقیل) نے وہاں کے حالات کو قول و قرار کے موافق پاکر آپ کو اس کی اطلاع بھی دے دی تھی جس کے بعد امام کے لیے ان کے مطالبہ ہدایت کی آواز پر لبیک کہتے ہوئے اتمام حجت کرنا ایک فریضہ تھا مگر اس ضمن میں اس انقلاب کے لیے جو حضرت کی شہادت سے پیدا ہونے والا کچھ مزید اسباب کا اضافہ ہو گیا۔ ظاہر ہے کہ حضرت امام حسینؑ وطن سے بے بسی اور بسکی کے ساتھ نکلے تھے۔ مکہ میں بھی کوئی قابل اطمینان حالت نہ تھی مگر مکہ سے آپ کا سفر اختیار کرنا اہل کوفہ کے حمان کی حیثیت سے تھا اور عرب کی غیرت و حمیت کا تقاضا تھا کہ آپ کے بارے میں ضرب المثل کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ بالکل صحیح ہے کہ عین موقع پر اہل کوفہ کثرت کے ساتھ امام حسینؑ کی نصرت کے لیے نہیں پہنچ سکے یا نہیں پہنچے مگر انسانی اور عربی فطرت کے لازمی نتیجہ کے طور پر یہ یقینی تھا کہ بعد کو اہل کوفہ کے دل میں ایک عجیب بقیار احساس پیدا ہوگا اں کا کہ ہم نے بلایا تھا اور مدد نہ کی اور یہی احساس آگے بڑھ کر اور بدورش پاکر ایک عظیم سیلاب کی صورت میں اُڑے گا جو اس سلطنت کے بڑے کو ہمیشہ کے لیے ڈبو کر چھوڑے گا جس کا نتیجہ ہوگا امام کی فتح اور دشمن کی شکست۔ بنی امیہ کی عداوت اور ان کے وسیع ذرائع حکومت کو دیکھتے ہوئے یہ ماننا پڑے گا کہ امام حسینؑ تو ملک عرب میں جہاں جاتے آخر میں شہید ہوتے لیکن ظاہری حیثیت سے یہ نتیجہ مرتب نہ ہوتا جو کوفہ کی طرف آنے کی صورت میں ہوتا۔ وہ لوگ جو مسلم کی شہادت کے بعد آپ کو واپس کا مشورہ دے رہے تھے یقیناً نیک نیت اور اپنے نقطہ خیال کے لحاظ سے حق بجانب بھی ہوں گے مگر انھیں حسینی اقدام کی نوعیت کا اندازہ نہ تھا۔ عراق کا سفر اختیار کرنا اگر کچھ خوشگوار توقعات پر مبنی ہوتا تو بیشک اب اس ارادہ کو بدل جانا چاہیے تھا۔ اس لیے کہ وہ توقعات اب مایوسی سے بدل گئے تھے لیکن جبکہ امام کے سامنے کوئی امید نہ

۱۰۰ نوٹن کے کسہ کے ساتھ ۱۲۸۰ تشہدِ آدم کراچہ

اور یہی آپ کا اپنی طرف سے جنگ کی ابتداء نہ کرنے کا اصول اس کا بھی باعث ہوا کہ جب کربلا کی سرزمین پر پہنچ کر فوج مرنے سختی کے ساتھ آگے بڑھنے سے روکا تو آپ نے وہیں پر خیمے نصب کرا لیے کیونکہ اب بغیر جنگ کیے ہوئے آگے بڑھنا ممکن نہ تھا پھر آگے بڑھنے کی صورت

اور اس کے بعد موجودہ مقام ہند کی طرف سے ہوتی ہوئی اس مقام کے شمال مغربی جانب جس کا نام ”قریہ ذی الکفل“ ہے اصل دریائے فرات سے مل جاتی تھی۔ یہ چھوٹی نہر ”علقمہ“ کے نام سے موسوم تھی اور اسے اپنی اصل کے اعتبار سے فرات بھی کہہ دیا جاتا تھا۔ ”طف“ کے معنی ہیں ”نہر کا کنارہ“۔ خصوصیت سے دریائے فرات کے اس کنارے کو جو جنوبی پہلو میں بصرہ سے نسبت تک تھا طفٹ کہا جاتا تھا اور اسی مناسبت سے ”فرات صغیر“ یعنی نہر علقمہ کے اس کنارہ کو جس میں کربلا واقع تھا طفٹ کہا جانے لگا اور اسی وجہ سے کربلا کے واقعہ کو ”واقعہ الطف“ کہا جاتا ہے اور کربلا کو شطر فرات کے نام سے بھی اسی وجہ سے یاد کیا جاتا ہے +



مغرب میں واقع تھا۔ وہاں اب کھنڈر ہیں جن میں بہت اہم آثار قدیمہ کے انکشاف کی امید کی جاتی ہے اور یہ بالکل دریائے فرات کے کنارے پر تھا، اور اپنے قدرتی محل وقوع یعنی ٹیلوں میں گھرے ہوئے کی وجہ سے ایک قلعہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس کے مقابل غاصریات کے دوسری جانب نوادیس کا مقام تھا جو مسلمانوں کے فتوحات کے قبل ایک عمومی قبرستان کی حیثیت رکھتا تھا۔ اس کے وسط میں زمین ”نیر“ تھی جو اب حائر کے نام سے معروف ہے اور جہاں حضرت امام حسینؑ کی قبر مبارک ہے۔ تیسرا ایک وسیع میدان کی حیثیت رکھتا تھا جو تین طرف سے متصل اور پہلو پہلو ٹیلوں سے گھرا ہوا ہے۔ ان ٹیلوں کا سلسلہ شمال مشرق کی طرف سے جدھر حرم حسینیؑ کا ”باب السد“ اور ”نارہ عبد“ ہے شروع ہو کر غرب کی جانب ”باب زینبہ“ کے حدود تک پہنچتا تھا اور وہاں سے پیچیدہ ہو کر جنوب کی طرف در قبلہ کے مقام تک آ کر ختم ہوتا تھا۔ ان متصل ٹیلوں کے اجتماع سے ایک نصف دائرہ کی شکل بنتی تھی جو ”ن“ کی صورت سمجھی جاسکتی ہے۔ اس دائرہ میں داخل ہونے کا راستہ مشرقی جہت میں اس جانب سے تھا کہ جدھر روضہ حضرت عباسؑ میں جانے کا راستہ ہے۔ تحقیقاتی انکشاف سے اب تک یہ بات پائی جاتی ہے کہ ان مکانات کے آثار جو قبر امام حسینؑ کے گرد ہیں، شمالی اور مغربی جانب زمین کی قدیمی بلندی کے قرینے موجود ہیں اور مشرقی جانب سوا نرم مٹی کے جو پستی کی طرف مائل ہے کچھ نظر نہیں آتا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس مقام کی قدیمی صورت ایسی ہی تھی کہ مشرق کی جانب سے ہموار اور شمال اور مغرب کی جانب ہلکی شکل کے طور پر بلند تھی۔ یہی ہلکی دائرہ وہ تھا جس میں امام حسینؑ کو گھیر کر شہید کیا گیا تھا۔ فرات کی اصلی نہر جسے ہماری زبان کے اعتبار سے دریائے فرات کہا جاتا ہے اس کا براہ راست کوئی تعلق کربلا کی زمین سے نہ تھا۔ اس کا خط سیر حدہ، مسیب وغیرہ مقامات سے ہوتا ہوا کوفہ کے بیرونی حصوں کی جانب جاتا تھا۔ کربلا اور اس کے درمیان بڑا فاصلہ تھا لیکن اس نہر یا دریائے فرات کی ایک چھوٹی شاخ تھا رھوانیہ کے پاس سے نکل کر جدا ہوتی تھی جو کربلا کے شمال مشرق کی جانب کے رگیستانوں اور ٹیلوں سے ہوتی ہوئی اس مقام سے ہو کر گزرتی تھی جہاں علمدار حسینؑ ابو الفضل العباسؑ کی قبر ہے۔

کیا کہ کوئی ایسا شخص نہیں جس پر گمان ہو سکتا تھا کہ وہ ستم و ستمی کی مخالفت کرے گا مگر یہ کہ وہ قیصرانہ کے اندر ہے۔“

شہر کے اندرونی حالات پر اس طرح قابو پانے کے بعد اس نے باہر کی طرف توجہ کی اس لیے کہ اسے اندیشہ تھا کہ کہیں بصرہ و مدائن اور دیگر اطراف کے لوگ امام حسینؑ کی مدد کے لیے نہ آجائیں۔ اس کے لیے حدود کی ناکہ بندی ہوئی اور قادیسیہ میں جو حجاز و عراق دشام کے خطوط سیر کا محل اجتماع تھا چار سو ہزار افراد کے ساتھ حصین بن تمیم کو جواب تک کو تو اس شہر کی حیثیت رکھتا تھا مقرر کیا گیا اور وہ فلس سے لے کر قطیفانہ، لعلع اور خفان اور اطراف و جوانب میں جو شام و بصرہ کے راستے تھے سب پر لشکر بھیل دیا گیا۔ یہاں تک کہ نہ کوئی شخص آ سکتا تھا اور نہ جاسکتا تھا۔ چنانچہ قیس بن مسهر صمدیؓ امام حسینؑ کا فرستادہ خط اہل کوفہ کے نام لے جا رہے تھے اسی قادیسیہ میں پہنچ کر حصین کے ہاتھوں گرفتار ہوئے اور جب امام نے بطن عقیق کے بعد یہ سن کر کہ آگے فوج سردارہ ہے محنت سفر میں تبدیلی فرمائی تو فوراً ایک ہزار کے لشکر کے ساتھ اسی فوج میں سے بھیجا گیا جو قادیسیہ میں حصین کی سرکردگی میں موجود تھی۔ جب حُر نے ابن زیاد کے خط کی تعمیل کرتے ہوئے حضرت امام حسینؑ کو کربلا میں اتارنے پر مجبور کر دیا تو اس نے ابن زیاد کو اس کی اطلاع دی۔ یہ وقت وہ تھا کہ ملک عجم میں بغاوت ہو گئی تھی اور ”دستبنی“ کے مقام پر قبیلہ دلم نے قبضہ کر لیا تھا۔ اس بغاوت کو فرو کرنے کے لیے مشورہ فوج عراق سعد بن ابی وقاص کے بیٹے عمر بن سعد کو چار ہزار فوج کا سردار بنایا گیا تھا اور اس کے لیے رے اور ملطہ ج ۶ ص ۲۲۲۔ الاخبار الطوال ص ۲۱۳۔ سلمہ دستبنی کا نام تاریخ میں مہمان اور رے کی فتح کے ساتھ آتا ہے نعیم بن مقرن نے ان مقامات کو ۲۲۳ھ میں فتح کیا۔ دستبنی چند اہل کوفہ میں تقسیم کر دیا گیا جن کے نام یہ ہیں: عصمتہ بن عبداللہ ذہبی، جلیل بن زید طائی، سماک بن عبد العسی، سماک بن مخزوم اسدی اور سماک بن خورشہ انصاری۔ یہ لوگ مسلمانوں میں سب سے پہلے دستبنی کی چھاؤنیوں والی ہوئے اور انھوں نے ولیم سے جنگ کی۔ ایک قول یہ ہے کہ رے کو قرطبہ بن کعب نے فتح کیا (طبری ج ۴ ص ۲۵۰) دستبنی مہمان کا جزو تھا اور وہاں کی چھاؤنیاں مہمان تک پھیلی ہوئی تھیں (طبری ج ۴ ص ۲۵۰) نعیم نے فتح کرنے کے بعد رے کا قدیم شہر برباد کر دیا اور اس سے ہٹ کر نئے شہر کی بنیاد قائم ہوئی (ص ۲۵۳)

بیسواں باب ! بیزیدی حکومت کی سرگرمی اور کربلا میں فوجوں کی آمد

مسلم بن عقیق کی شہادت کے بعد کوفہ میں سخت گیری انتہا کو پہنچ گئی۔ ابن زیاد کو اندیشہ تھا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ مسلم کی معیت کرنے والے جوان کی امداد سے قاصر رہے وہ اب اپنی قوتوں کو جمع کر کے کوئی انقلاب پیدا کریں لہذا اس نے تلاش کر کے جن جن اشخاص کو حضرت امام حسینؑ کا سہارا سمجھا جاسکتا تھا یا ان پر ایسا شبہ بھی ہو سکتا تھا انھیں قتل یا قید کرنا شروع کر دیا۔

میتن تمار اور رشید بھری اسی دوران میں شہید کیے گئے۔
تختار بن ابو عبیدہ جو مسلم کے جہاد کے زمانہ میں کوفہ کے اندر موجود نہ تھے اور اسی دن اطلاع پا کر آئے لیکن ایسے وقت پہنچے کہ مسلم شہید ہو چکے تھے اور عمر بن حرث نے رایت امان بلند کیا تھا کہ جو شخص اس کے نیچے چلا آئے گا اس کا جان و مال محفوظ رہے گا۔ چنانچہ قتل و مروع کی نزاکت کو محسوس کرتے ہوئے اس جھنڈے کے نیچے چلے گئے مگر انھیں اس پر بھی امان نہ مل سکی اور وہ پابزخیر کر کے قید خانہ بھیج دیے گئے۔ اسی طرح عبداللہ بن حارث بن نوفل اور دیگر اشخاص۔
ادھر تیزید کو دمشق میں جناب مسلم کے قتل کی خبر کے ساتھ ہی حضرت امام حسینؑ کی مکہ سے روانگی کی اطلاع پہنچی تو اس نے ابن زیاد کو خط لکھا:-

”جسے خبر ملی ہے کہ حسینؑ بن علیؑ عراق کی طرف متوجہ ہو چکے ہیں لہذا تم کو لازم ہے کہ ہوشیاری کے ساتھ جاؤں مقرر کرو۔ سورجے مضبوط کرو اور کسی شخص پر دم و گمان بھی ہو تو اس کا تدارک کرو اور فوراً گرفتار کر لو۔“

اب کیا تھا، جیلخانے قیدیوں سے چھلکنے لگے جس کا اظہار خود ابن زیاد نے اس کے بعد ان الفاظ میں

تقریباً بیسویں شعبہ نے جو اس کا بھانجا تھا حسب ذیل تقریر کی: ”آپ حسینؑ سے جنگ کرنے کو نہ جانیے اور گنہگار ہونے کے ساتھ ساتھ رشتہ قرابت کو قطع کرنے کے ترک نہ ہو جیسے خدا کی قسم اگر تمام دنیا کا مال و دولت اور عالم بھر کی سلطنت آپ کے قبضہ میں ہو اور پھر وہ نکل جائے تو بہتر ہے اس سے کہ آپ حسینؑ کے خون کا بار اپنی گردن پر لیں۔“

یہ وہ پہلو تھا جسے اس کے بچے مشیر کا پیش کر رہے تھے لیکن دوسری طرف اس کا جاہ طلبی کا جذبہ رہ رہ کر اسے کی حکومت کا خیال دلایا کرتا تھا۔ وہ ایک دماغی کشمکش میں مبتلا تھا جسے شب کے تاریک پردہ میں اس کے یہ اشعار ظاہر کر رہے تھے:

الترك ملك الروى والبرى رغبته ام ارجع مذموماً بقتل حسين
وفى قتله النار التى ليس دونها حجاب وملك الروى قرعة عيني
(یعنی) کیا میں رے کی حکومت چھوڑ دوں؟ یا خالی کہ وہ مجھے دل سے پسند ہے یا میں حسینؑ کو قتل کر کے طوق مذمت میں گرفتار ہوں؟ ان کو قتل کرنے میں دوزخ کی آگ ہے جس کے متعلق شک و شبہ کی گنجائش نہیں اور رے کا ملک میری آنکھوں کے لیے ٹھنڈک ہے۔

بعض مؤرخین اس کے ساتھ مزید اشعار اور نقل کرتے ہیں جن کا مضمون یہ ہے کہ حسینؑ کے قتل کا جو کچھ برم ہے اس کا نتیجہ مرنے کے بعد نمایاں ہو گا جو معلوم نہیں صحیح بھی ہے یا نہیں پھر رے کی نقد حکومت کو چھوڑ کر آخرت کے راحت و آرام کی امید باندھنا کس سمجھدار آدمی کا کام ہو سکتا ہے؟ غالباً ان اشعار کی روایت صحیح ہے۔ اس لیے کہ نتیجہ عمر بن سعد کے عمل سے بھی اسکی تصدیق ہوتی ہے نتیجہ یہی تھا کہ دنیا کی دینی و دنیوی غالب آئی اور اس نے فرزند رسولؐ سے جنگ کرنے پر مکر باندھ لی مگر ایک آخری بار ضمیر کی چٹکیوں نے اسے پھر آمادہ کیا کہ وہ ابن زیاد سے کمزور لفظ میں ہی معذرت کر لے۔ چنانچہ اس نے اگر کہا کہ آپ مجھ کو دستیابی اور ولیم کے حدود کی طرف جانے پر مامور کر چکے ہیں۔ لوگوں کو اس کا علم بھی ہو گیا ہے اور میری فوج دالوں نے

طبری ج ۶ ص ۱۳۳ ۱۳۴ کتاب البلدان ۲۵۱

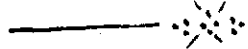
سرحد دستیابی و ولیم کی حکومت کا پروانہ لکھ دیا گیا تھا چنانچہ یہ فوج ایران جانے کے لیے باہر نکل بھی چکی تھی۔ اور عمر بن سعد اس فوج کو ساتھ لیے کوفہ کے باہر مقام ”حمام العین“ پر خیمہ زن تھا اور عنقریب آگے بڑھنے والا تھا۔ اب امام حسینؑ کی ہم جو درپیش ہوئی تو ابن زیاد نے عمر بن سعد کو حکم دیا کہ پہلے اس ہم کو مکر لے اور پھر ایران کی طرف روانہ ہو۔

عمر سعد صحابی تو نہیں مگر عام مسلمانوں کی اصطلاح کے مطابق تابعی ضرور تھا۔ عین خلیفہ دوم عمر بن خطاب کے انتقال کے دن اسکی پیدائش ہوئی تھی۔ اور اس کے سن تیز تک پہنچنے تک بہت سے صحابہ رسولؐ موجود تھے۔ یقینی ان کی زبانی اس نے وہ احادیث بھی سنے ہوں گے جو پیغمبر اسلامؐ نے حسنؑ و حسینؑ کے بارے میں فرمائے تھے۔ نیز امام حسینؑ کے ساتھ رسولؐ کی انتہائی محبت کے واقعات بھی اس کے گوش زد ہوئے ہوں گے۔ پھر حضرت عیسیٰ بن ابی طالبؑ کے زمانہ خلافت میں جب کہ امام حسینؑ بھی کوفہ میں موجود تھے عمر بن سعد کا کچھ ایسا کم سنی اور بے شعوری کا دور نہ تھا۔ اسے یقینی قریب سے حضرت امام حسینؑ کے محاسن ذات اور بلند اوصاف و اخلاق کے مشاہدہ کا موقع ملا ہو گا اور جب سے آپ مدینہ تشریف لے گئے تھے تو اب تک بیس برس کی مدت میں آنے جانے والوں کی زبان سے اس نے امام کے زہد و تقویٰ، عبادت و ریاضت اور خوش اخلاقی و سخاوت کے کتنے ہی واقعات ضرور سنے ہوں گے۔

شاید انہی امور کا نتیجہ تھا کہ وہ حضرت امام حسینؑ سے جنگ کو پسند نہ کرتا تھا اور اسے ایک گناہ خیالی کرتا تھا۔ چنانچہ اس نے انکار کیا اور کہا کہ مجھے معاف کر دیجیے تو بہتر ہے۔ ابن زیاد نے جواب دیا کہ اچھا تو ہمارا پروانہ حکومت رے کا واپس کر دو۔ یہ معاملہ سخت تھا۔ عمر سعد کو رے کی حکومت دل سے عزیز نہ تھی۔ جاہ طلبی اور حقیقی شناسی کے جذبوں میں کشمکش ہوئی۔ یہاں تک کہ اسے کیسوی حاصل کرنے کے لیے ایک دن کی ہمت مانگنا پڑی۔ ہمت ملی اور عمر سعد نے اپنے مخصوص احباب و اعزہ سے مشورہ کیا۔ سب نے مخالفت کی اور اس ہم کے لیے جانے سے منع کیا۔

۱۹ الاخبار الطوال ۲۵۱ طبری ج ۶ ص ۲۳۲ ۲۳۳ طبری ج ۶ ص ۲۳۳ ۲۳۴ تقریب التہذیب ص ۱۹

ثبث نے بیماری کا عذر کیا تھا لیکن ابن زیاد نے کہا، تم بیمار بن رہے ہو، اگر تم ہماری اطاعت میں ہو تو ہمارے دشمن سے جنگ کے لیے روانہ ہو۔ مجبوراً ثبث بھی روانہ ہوا۔ بعض اشخاص ایسے تھے کہ ابن زیاد کو اپنی صورت دکھا کر پھر کو ذرا پس چلے جاتے تھے۔ جب ابن زیاد کو اس کا علم ہوا تو اس نے سوید بن عبدالرحمن منقری کو کچھ سواروں کے ساتھ کو ذرا روانہ کیا کہ جو شخص کو ذرا نظر آئے اور وہ ابھی تک حسین سے جنگ کرنے کو نہیں روانہ ہوا اسے گرفتار کر کے میرے پاس لاؤ۔ چنانچہ سوید نے کو ذرا کے قبیلوں میں گردش کی۔ اتفاق سے ایک شخص نام کا بنے والا اپنے کسی متروک کے جھگڑے میں کو ذرا آیا تھا۔ سوید نے اسے پکڑ کر ابن زیاد کے پاس بھیج دیا۔ اس کی گردن مار دی گئی۔ اس واقعہ سے تمام لوگوں پر دہشت طاری ہو گئی اور سب امام حسین سے جنگ کے لیے نکل کھڑے ہوئے۔ اس کے بعد تاریخ کے لحاظ سے مردم شماری کی ضرورت نہیں اور نہ علماء کے اقوال دیکھنے کی حاجت کہ میں ہزار تھے جسے ابن طاؤس نے ترجیح دی ہے یا تیس ہزار جسکو علامہ مجلسی نے مانا ہے یا پینتیس ہزار جیسا کہ ابن شہر آشوب نے لکھا ہے یا ایک لاکھ تک مطابق بعض اہل مقاتل کی تحریر کے بلکہ گزشتہ انتظامات ہی سے ظاہر ہے کہ کو ذرا کی تمام قابل جنگ آبادی کربلا میں انڈیل دی گئی تھی۔ جس کے بعد کربلا کی زمین فوجوں کی کثرت سے موجیں مارنے لگی تھی۔



بھی وہیں جانے کی تیاری کی ہے۔ بہتر ہے کہ آپ مجھ کو ادھر ہی روانہ کیجیے اور حسین بن علی کے ساتھ جنگ کرنے کے لیے کسی اور کو اثرات اہل کو ذرا میں سے جو کسی طرح شخصیت و شہرت اور فن سپہی و ہمارے جنگ میں مجھ سے کم نہیں روانہ کر دیجیے۔ چنانچہ اس نے چند آدمیوں کے سرداران اہل کو ذرا میں سے نام بھی لے دیے مگر ابن زیاد برہم ہو گیا اور اس نے کہا کہ تمہیں سرداران کو ذرا کے نام مجھے گنوانے کی ضرورت نہیں ہے۔ مجھے اگر کسی کو بھیجنا ہو گا تو تم سے مشورہ کر نہیں بھیجوں گا۔ تم تو اپنے متعلق کو کہہ تھیں جانا ہے یا نہیں؟ اگر نہیں جانا ہے تو ہمارا پر روانہ حکومت رے کا واپس کر دو۔ عمر سعد نے سمجھ لیا کہ بغیر قربانی کے اس جرم سے چھٹکارا ملنا ممکن نہیں اور قربانی کے لیے اس کا نفس تیار نہیں ہوتا تھا۔ آخر اس نے اقرار کر لیا کہ اچھا میں ہی جاؤں گا۔ چنانچہ وہی چار ہزار کی فوج جو ملک ایران جانے پر کربلا سے تھی کربلا کی طرف روانہ ہو گئی اور عمر سعد اس فوج کے ساتھ امام حسین کے درود کربلا کے دوسرے ہی دن یعنی تیسری محرم کو یہاں پہنچ گیا۔

کربلا میں حُر کے ساتھ ایک ہزار کی فوج پہلے ہی سے موجود تھی۔ اب عمر سعد کی فوج ملا کر پانچ ہزار ہوئی۔ حضرت امام حسین اور ان کی مختصر جماعت کے لیے ظاہری حیثیت میں اتنا لشکر بہت تھا مگر امام حسین کی خاندانی شجاعت اور ان کی سچائی کی طاقت کا ابن زیاد کے دل پر اتنا رعب تھا کہ وہ فوج کی زیادہ سے زیادہ مقدار کو بھی کم سمجھتا رہا۔ چنانچہ حصین بن تمیم کو تو اس شہر کو ذرا کی سرداری میں قادیسیہ کے ناکے پر جو باقی تین ہزار فوج تھی وہ پوری کی پوری کربلا کی طرف منتقل کر دی گئی اس کے بعد کو ذرا میں عام بھرتی کا اعلان کر دیا گیا اور ابن زیاد خود کو ذرا سے باہر نکل کر تحلیہ میں جو کربلا کے راستہ پر تھا آکر خیمہ زن ہو گیا تاکہ اپنے سامنے افواج کا معائنہ کر کے پے در پے کربلا کی جانب روانہ کرے اور بڑے بڑے سرداران کو ذرا بن تھاجر، ثبث بن ربعی، عمرو بن الحجاج وغیرہ کو مامور کیا گیا کہ وہ اپنی اپنی جماعت کے ساتھ کربلا روانہ ہوں۔ ان میں سے ہر ایک کثیر فوج کے ساتھ روانہ ہوتا تھا۔ ان میں سے کسی ایک کا کوئی عذر بھی سنا نہیں جاتا تھا۔ چنانچہ

اکیسواں باب

انصار امام حسینؑ ان کی قلتِ تعداد اور اسکے اباب

سابقہ ابواب میں ان واقعات و حالات کا تذکرہ ہو چکا ہے جن سے معلوم ہوتا ہے کہ کوفہ کی اس جماعت میں سے جو حضرت امام حسینؑ کی ہمدرد تھی اور جنہیں آپ کی نصرت کا فریضہ محسوس ہو سکتا تھا ایک کثیر تعداد پابزنجیر کر لی گئی تھی۔ نیز حدود کی ناکہ بندی نے اطراف و جوانب کے رہے سے اشخاص کے لیے حضرت تک پہنچنا دشوار سے دشوار تر بنا دیا تھا اور کوفہ سے اگر کوئی آنے کا قصد کرتا تو تخیل میں جہاں ابن زیاد نے اپنا پڑاؤ ڈالا تھا گرفتار کر لیا جاتا اور کسی دوسری طرف سے آنا چاہتا تو قادیسیہ و قفقاز، قلع و غیرہ کی کسی نہ کسی منزل پر وہ مقید ہو جاتا۔

اس کے علاوہ کربلا میں آپ کا ورود اچانک طور پر تھا اس لیے اطراف و جوانب میں اس کی اطلاع تک ممکن نہ تھی جبکہ بعد کے واقعات بتاتے ہیں کہ اس وقت تک بھی کہ جب امام حسینؑ شہید ہو چکے ہیں اور امیروں کو کوفہ بجا یا گیا ہے بہت سے اشخاص ان واقعات سے بے خبر تھے ایسی صورت میں یہ ممکن ہی نہ تھا کہ آپ کے پاس کوئی بڑی جمعیت نصرت کے لیے پہنچ جاتی۔ خصوصاً جبکہ آپ نے پہلے ہی سے اپنے ساتھ تعداد کے بڑھانے کی کوئی کوشش بھی نہ فرمائی تھی۔ پھر بھی مذکورہ بالا تمام مشکلات کے باوجود شیعان کوفہ کی وفاداری اور اولوالعزمی کا ایک بڑا تاریخی کارنامہ یہ ہے کہ وہ افراد جو امام حسینؑ کے کوفہ کی طرف تشریف لانے کی تحریک کے ذمہ دار تھے جنہوں نے حضرت مسلم بن عقیل سے ان کے ورود کے موقع پر پہلے جلسہ میں وفاداری کا اقرار اور جانبازی کا عہد کیا تھا وہ کسی نہ کسی طرح حسینؑ بن علی تک پہنچ گئے اور اپنی جانیں آپ کے قدموں پر نثار

کریں اور جو لوگ اس جماعت میں سے حسینؑ کی نصرت کے لیے نہ پہنچے یا نہ پہنچ سکے ان میں سے بھی کسی متنفس کی امام حسینؑ کے عنایت سے کربلا میں موجودگی ہرگز پائی نہیں جاتی۔ بلکہ کچھ کمزور عزم ایمان رکھنے والے اشخاص جو بظاہر ضعیف العمر بھی تھے اس لیے ابن زیاد کی فوج میں جانے سے بھی مستثنیٰ ہو سکے تھے اس وقت جب کربلا میں جہاد ہو رہا تھا، سیردن کو ذہیلے پر کھڑے ہوئے آٹھ ہمارے تھے اور دعائیں مانگ رہے تھے کہ خداوند اپنی نصرت نازل فرما اہل بیت رسولؐ اور ان کے انصار پر جنہیں اس طرح دیکھ کر راوی کو غصہ آیا اور کہا اے کم بخت تمہارے جذبات یہ ہیں تو آخر خود جا کر نصرت کیوں نہیں کرتے؟

مگر یہ توقع ہر شخص سے کرنا کہ وہ عزم و ہمت میں مسلم بن عسیر اور حبیب بن مظاہر ہی ثابت ہو ایک دور از کار بات ہے۔ بہر حال ان کمزور نفوس والے افراد کے بالمقابل ان پر جگر اور باوقا افراد کی تعداد جنہوں نے امام حسینؑ کا اس نازک موقف میں ساتھ دیا اور وہ کوفہ ہی کے باشندہ تھے بجائے خود قلیل ہونے کے باوجود تاریخ عالم کے تجربات کو سامنے رکھتے ہوئے ہرگز کم نہیں ہے۔

یہی وہ پہلو ہے جسے اہل کوفہ کی حمایت میں پیش کیا گیا۔ اس وقت جب ابوالعباس سفاح کے سامنے ابوبکر ہذلی بصری اور ابن عباسؓ میں بصرہ اور کوفہ کی باہمی فضیلت کے بارے میں مناظرہ ہوا اور ابن عباسؓ نے شجاعت کے تذکرہ میں کچھ شہسواران کوفہ کے نام لیے اور ابوبکر ہذلی نے دکھتی ہوئی رگ کو دباتے ہوئے کہا کہ کوفہ والوں کی بہادری کا کیا کہنا کہ ان میں جتنے بھی تھے وہ یا امام حسینؑ اور ان کے اقربا و انصار کے قاتل تھے یا عدم تعاون کرنے والے یا ان کا مال و اسباب لوٹنے والے یا ان کی لاشوں کو پامال کرنے والے، یہ سنکر ابن عباسؓ نے کہا کہ جو فخر کا پہلو ہے وہ تم نے چھوڑ دیا اور طعنے دینے پر اتر آئے۔ تم نے امام حسینؑ کے والد بزرگوار حضرت علیؑ بن ابی طالب کو قتل کیا (ابن عجم لہرہ کا رہنے والا تھا) رہ گئے اہل کوفہ۔

درحقیقت یہ ایک مارے باندھے کا سودا تھا جو کیا جا رہا تھا جس کے لیے آخر وقت تک فوج کی اکثریت سپر ذخیرہ ثابت ہو رہی تھی اور کچھ افسران فوج کی زبردستیاں اور جائزہ و انعام وغیرہ کے ترغیبات اور عقاب حکومت کے تازیانے ہی تھے جو ان کے جذباتِ خدا کی کمزوری کے باعث ان کے رُکتے ہوئے قدموں کو بار بار آگے بڑھاتے تھے۔ اس کے برخلاف حسینی سپاہیوں کا ضبط و نظام ایک بے مثال نمونہ ہے۔ یہاں نہ بڑھنے کے موقع پر قدم پیچھے ہٹنے کا امکان تھا نہ بے موقع قدم آگے بڑھنے کا سوال۔ ان کا کوئی اقدام ہوش کے ماتحت نہیں ہوتا تھا بلکہ وہ برابر اپنے سالار کے اشارہ کے منتظر رہتے تھے اور جس وقت تک امام اتمامِ حجت کی منزلوں کو ختم کر کے جنگ کے اقدام کو حق بجانب نہ سمجھ لیں۔ اس وقت تک ایک سپاہی بھی ایسا نہ تھا جو حسینی نظام کے خلاف خود رائی یا خود سری سے کام لے۔ یہ بات صرف اس لیے تھی کہ یہ جتنے افراد تھے سب عارفِ حق امام کے تربیت یافتہ اور صاحبِ اخلاق تھے۔



ان میں سے حضرت امام حسینؑ کے ساتھ روزِ شہادت چالیس آدمی تھے جب کہ آپ کے سپاہیوں کی مجموعی تعداد تقریباً ستر تھی اور کوفہ کے یہ جتنے آدمی تھے ان میں سے کوئی ایک بھی زندہ واپس نہیں گیا بلکہ سب نے امام پر اپنی جان نثار کی اور ہر ایک نے قتل ہونے سے پہلے کچھ نہ کچھ اپنے دشمنوں کو قتل بھی کیا۔

حقیقت یہ ہے کہ فوج عمر سعد میں کوفہ کے عوام تھے اور اطراف و جوانب کے قبائل جن کا مسلک صرف اطاعتِ شیوخ تھا اور کچھ نہیں۔ ان میں سے اکثر کا نصب العین قتلِ امام حسینؑ میں صرف حکمِ حاکم کی تعمیل اور اپنی فوجی ذمہ داری کا پورا کرنا اور جائزہ و انعام کی ہوس تھی اور کچھ ایسے بھی تھے جو حضرت امام حسینؑ سے جنگ کرنے پر خوشی سے رضا مند نہ تھے مگر ان میں اتنی قوتِ ارادی نہ تھی کہ وہ حکومت کے خلاف اپنے اختیار سے کام لیں۔ نیز یہ بھی ممکن ہے کہ ان میں بہت سے ایسے جوان اور نو عمر بھی ہوں جو حسینؑ کی شخصیت سے آگاہ ہی نہ ہوں اور وہ صرف سمجھتے ہوں کہ ہم کو حاکم کی طرف سے ایک باغی سے مقابلہ کرنے کے لیے روانہ کیا گیا ہے۔ اس کے برخلاف حضرت امام حسینؑ کے ساتھ کوفہ کے جتنے آدمی تھے وہ دہاں کی خلقت کے دل و دماغ تھے۔ وہ وہ تھے جو دنیا کے تمام محرکات کے مقابل میں اپنے شعور اور ارادہ کے مالک ثابت ہوئے اور یہ بہت بڑی بات ہے۔ ان میں سے بہت سوں سے کوفہ کے عوام واقف بھی تھے اور ان کی شخصیت سے متاثر ہوتے تھے اور ان کے لیے یہ عجیب معجزہ بن گیا تھا کہ ایسے عابد و زاہد اور پرہیزگار لوگ آج کس طرح میدانِ جنگ میں آگئے ہیں؟ ان شخصیتوں کا فوجِ مخالف کے افراد پر اتنا زبردست اثر پڑ رہا تھا کہ ان کے دلوں کی طاقت نے جواب دے دیا تھا۔ واقعہً کربلا کی جنگ میں بارہا تاریخ کے اوراق پر نظر آتا ہے کہ فوجِ مخالف نے حسینی مجاہدین کے سامنے سے فرار کیا۔ حقیقتاً یہ فرار مادی قوت کی کمی کا نتیجہ نہیں بلکہ ان میں سب سے زیادہ ضمیر کی کمزوری کا دخل تھا۔

تفسیر پر ہاتھ رکھے رہوں گا اور اس طرح تم کو امام کی خدمت میں لے جاؤں گا۔ کثیر نے اسے بھی منظور نہ کیا اور کہا، میری تلوار کو تو تم ہاتھ بھی نہیں لگا سکتے۔ ابو ثامر نے کہا کہ اچھا پھر اپنا پیغام تم مجھ سے کہہ دو۔ میں اس کا جواب امام سے لادوں گا۔ اس طرح گفتگو بڑھتے بڑھتے بالآخر سخت کلامی کی نوبت آگئی اور کثیر نے واپس جا کر عمر سعد کو اپنی سرگزشت سے مطلع کر دیا۔

اب اس نے قرہ بن قیس حنفلی کو بلایا اور اس سے کہا تم جا کر حسینؑ سے دریافت کر دو کہ وہ اس سرزمین پر کس لیے آئے ہیں؟ چنانچہ قرہ بن قیس روانہ ہوا۔ امام نے جو اسے آتے دیکھا تو دریافت فرمایا کہ تم لوگ اسے پہچانتے ہو؟ جتیب بن مظاہر نے کہا جی ہاں۔ یہ قبیلہ حنظلہ کا ایک شخص ہے۔ بنی تمیم میں ہے۔ اور نہ خیال کی طرف سے ہمارا عزیز ہوتا ہے میں ایک عرصہ سے اس کو جانتا ہوں اور میرے خیال میں یہ سنجیدہ و فرزانہ شخص تھا۔ مجھے یہ خیال نہ تھا کہ یہ اس موقع پر جنگ کے لیے ہمارے مقابل میں آئے گا۔ اتنی دیر میں وہ آگیا اور امام کی خدمت میں تسلیم بجالاتے ہوئے اس نے عمر سعد کا پیغام پہنچایا۔ وہی کہ آپ کی تشریف آوری کا مقصد کیا ہے؟ حضرت نے فرمایا، ”مجھ کو تمہارے شہر کے لوگوں نے لکھا تھا کہ میں آؤں لیکن اب جبکہ وہ میرا آنا پسند کرتے ہیں تو میں واپس چلا جاؤں گا۔“ جواب اتمام حجت کے مقصد کا حامل اور صلح پسندی کے مطابق ہونے کے ساتھ ساتھ بالکل صاف تھا۔ قاصد واپس جانے لگا، جتیب ابن مظاہر کو موقع تبلیغ کا مل گیا۔ کہنے لگے، ”اے قرہ بن قیس ظالم جماعت کی طرف کہاں واپس جاتے ہو، آؤ اور اس مظلوم کی مدد کرو جس کے بزرگوں کی بدولت تمہاری اور ہماری ہدایت ہوئی ہے۔“ قرہ نے کہا، میں جو پیغام لایا تھا اس کا جواب پہنچا دوں اور پھر غور کروں گا کہ مجھے کیا کرنا چاہیے۔ اس نے جا کر عمر سعد سے جواب امام حسینؑ کا بیان کیا۔ اس جواب سے اسے توقع پیدا ہوئی کہ اب صلح ہو جائے گی لہذا اس نے عبید اللہ بن زیاد

۶ مئی ۶۳۳ء - دینوری نے قرہ بن سفیان حنفلی راج کیا ہے (الاخبار الطوال ص ۲۵۱)

بائیسواں باب صلح کی باتیں

عمر سعد چاہتا تو تھا ہی کہ کسی طرح اس جرم عظیم جس میں وہ حرص دنیا کی بدولت اپنے ہاتھوں گرفتار ہونے جا رہا ہے چھٹکارا حاصل کرے چنانچہ اس نے کر بلا آ کر ایک گوشش معاملت کے سلجھانے کی شروع کی۔ اس طرح کہ عزہ بن قیس احسی کو بلا کر یہ چاہا کہ وہ امام حسینؑ کے پاس جا کر آپ کے مقصد تشریف آوری کو معلوم کرے مگر عزہ، یہ ان سات آدمیوں میں سے تھا جنہوں نے وقتی سیاست سے متاثر ہو کر جماعت شیعہ کے خطوط جانے کے بعد اپنی جانب سے امام حسینؑ کو ایک دعوتی خط لکھ دیا تھا۔ اس لیے اس کو آپ کے پاس جانے اور اس قسم کی گفتگو کرنے سے حجاب دامن گیر ہوا اور اس نے انکار کر دیا کہ میں نہیں جاؤں گا۔ دوسرے ایسے اشخاص کو بھی جو خطوط لکھ چکے تھے جانے میں اسی صورت سے توقف ہوا اور آخر کثیر بن عبد اللہ شعیبی ایک درشت خواہ اور سخت آدمی یہ کہتا ہوا سامنے آیا کہ میں جانے کے لیے تیار ہوں بلکہ مجھے حسینؑ کے قتل کرنے کے لیے کہا جائے تو اس میں بھی عذر نہیں ہے۔ عمر سعد نے کہا نہیں، یہ مطلب نہیں ہے۔ تم بس جا کر اتنا دریافت کر لو کہ آپ اس ملک میں کس لیے آئے ہیں؛ کثیر خیمہ گاہ حسینی کی طرف روانہ ہوا۔ بہادر ابو ثامر صائدی نے جو شاید اس وقت خیمہ امام حسینؑ پر پرادے رہے تھے اسے دور سے دیکھ لیا اور اٹھ سے عرض کیا کہ آپ کی طرف بدترین خلق اور انتہائی سفاک و خوریزہ شخص آ رہا ہے۔ اس کے بعد وہ خود آگے بڑھ گئے اور انھوں نے کثیر کو روک کر ہتھیار کھول کر رکھ دینے کا مطالبہ کیا۔ اس نے کہا، نہیں، یہ نہیں ہو سکتا۔ میں پیغام لے کر آیا ہوں۔ اگر مجھے موقع دو تو میں پیغام پہنچا دوں، نہیں تو واپس جاؤں۔ ابو ثامر نے کہا، اچھا میں تمہاری تلوار کے

بویز کرنے کا حق رکھے گی۔

خط کا انداز بتاتا ہے کہ ابن زیاد حضرت امام حسینؑ کے اتمامِ حجت پر مبنی جواب کی صحیح نوعیت کو نہیں سمجھا اور اس نے خیال کیا کہ فوج کی کثرت کو دیکھ کر آپؑ ڈر گئے ہیں اور اس لیے کہ میں جہاں سے آیا ہوں وہیں واپس چلا جاؤں گا۔ مگر عمر سعدؓ حسینؑ اور ان کے اصحاب کے تیوروں کو قریب سے دیکھ رہا تھا اور سمجھتا تھا کہ آپؑ کا جواب صرف امن پسندی اور سلامت روی کا نتیجہ ہے کسی ہتیت اور خوف پر مبنی نہیں ہے۔ اس لیے اس نے ابن زیاد کے اس خط کو بالکل نامعقول سمجھتے ہوئے کہا۔ ”مجھے پہلے ہی اندیشہ تھا کہ امیر ابن زیاد ان د سکون کے خواہاں نہیں ہیں“۔

پھر بھی اس نے یہ کیا کہ ابن زیاد کا خط امام حسینؑ کے پاس بھیج دیا۔ امام حسینؑ نے وہی کہا جو عمر سعدؓ سمجھ چکا تھا۔ یعنی یہ ہرگز نہیں ہو سکتا۔ زیادہ سے زیادہ موت ہی تو ہے۔ میں اس کا بغیر مقدم کرنے کے لیے تیار ہوں۔ عمر سعدؓ نے یہ جواب امام حسینؑ کا ابن زیاد کے پاس بھیج دیا۔



کے نام خط لکھا کہ میں نے یہاں پہنچ کر حسینؑ کے پاس اپنا نمائندہ بھیجا اور اس کے ذریعہ سے دریافت کیا کہ وہ ادھر کیوں آئے ہیں؟ کیا چاہتے ہیں اور کیا مطالبہ رکھتے ہیں؟ انہوں نے کہا کہ اس ملک کے لوگوں نے مجھ کو لکھا تھا اور میرے پاس ان کے قاصد گئے تھے اور مجھے ادھر آنے کی دعوت دی تھی۔ لیکن اب جبکہ وہ میرا آنا ناپسند کرتے ہیں اور ان کے خیالات میں تبدیلی ہو گئی ہے تو میں جہاں سے آیا ہوں ادھر ہی واپس چلا جاؤں گا۔

خط پہنچا۔ ابن زیاد نے پڑھا اور غور و تکبر، فرعونیت اور ظلم و سفاکی کے جذبہ کے ماتحت اس نے یہ شعر پڑھ کر اپنی تاریک ذہنیت کا ثبوت دیا۔

الان اذ علقت بخال البنا بـ

یرجو النجاة ولات حین مناص

(یعنی) اب جبکہ ہمارے چنگل ان تک پہنچ گئے ہیں تو وہ نجات کے طالب

ہیں۔ ہرگز نہیں۔ اب وہ ہم سے بچ کر کہاں جائیں گے۔

اس نے عمر سعدؓ کو لکھا۔ ”خط پہنچا اور حال معلوم ہوا۔ تم حسینؑ کے سامنے یہ سوال پیش

کرو کہ وہ اور ان کے تمام اصحاب یزید بن معاویہ کی بیعت کر لیں جب وہ ایسا کر چکیں گے تو پھر ہم رائے قائم کریں گے۔“

اس خط سے عمر سعدؓ کی امیدوں کی دنیا میں ایک دفعہ پھر تاریکی چھا گئی۔ اس خط کے

عنوان میں ابن زیاد کی مفسد اور فتنہ پسند ذہنیت کا پورا پورا ثبوت موجود تھا۔ اول بیعت

یزید کا امام حسینؑ سے مطالبہ ہی ایسا تھا جس کا اثر قبول کرنا آپؑ کے لیے ناممکن تھا۔ پھر اس

پر طرہ یہ کہ بغرض محال بیعت کر لینے کی صورت میں بھی حکومت کی طرف سے کسی خوفگوار

نتیجہ کا وعدہ نہ تھا بلکہ یہ کہا جا رہا تھا کہ ہم پھر رائے قائم کریں گے۔ اس کے یہی معنی ہو سکتے

تھے کہ اس کے بعد بھی حکومت امام حسینؑ کے گزشتہ انکارِ بیعت کی بناء پر آپؑ کے لیے کچھ سزا

بنائے نقشب اور نیز اپنے بڑوں کو ان کے مخالف کے ساتھ سختی کر کے خوش کرنے کے لیے اس کے لیے بھی تیار ہو جاتے ہیں۔ چہ جائیکہ حاکم کی طرف سے شرت کے ساتھ سختی کرنے کا حکم اور پھر صاف صاف پانی سے دور رکھنے کا فرمان بھی ہو گیا ہو۔ اس کے بعد یہ کسی طرح سمجھا ہی نہیں جاسکتا کہ اب حسین اور اصحاب حسین کے لیے پانی باطمینان و سکون اور بالکل آسانی بغیر کسی رکاوٹ کے حاصل ہو جاتا ہوگا۔

ہاں ممکن ہے حُر اپنی ذات سے سختی نہ کرتا ہو۔ چونکہ وہ پہلے ہی امام کی حقانیت سے کچھ متاثر ہو چکا تھا مگر جب ابھی وہ ”بازمانہ بساز“ پر عامل تھا اور حکومت و قوت کی مخالفت پر کھل کر آمادہ نہ تھا تو دوسرے سپاہیوں کو وہ صاف صاف سختی و درشتی سے باز بھی نہ رکھ سکتا تھا پھر یہ تو دو ایک دن کی بات تھی کہ حُر سالار فوج تھا۔ اس کے بعد عمر سعد آگیا اور مزید فوجیں کربلا میں جمع ہو گئیں جس کے بعد حُر کی کوئی اہم حیثیت باقی نہیں رہی تھی اور نہ اس کی آواز کوئی آواز سمجھی جاسکتی تھی اس لیے یقیناً ان دنوں میں بھی اصحاب امام کے لیے پانی تک پہنچنا اور پانی بھر دینا ناممکن تھا۔ ایک خطرہ اور کشمکش کا مقابلہ کرنا تھا جسے اسی وقت اختیار کیا جاتا ہوگا جب دشمنوں کی پیکس بہت بڑھ جائے یا پوری جماعت پر پیاس کا شدید غلبہ ہو چنانچہ اس سلسلے میں بعض وقت جنگ بھی ہو گئی ہے اور جنگ کر کے پانی حاصل کیا گیا ہے۔ ساتویں محرم کو وہ خاص تاریخ تھی جب ابن زیاد کا دوسرا خط عمر سعد کے پاس پہنچا۔ اس کا مضمون یہ تھا کہ:-

”حسین اور ان کے اصحاب پر پانی بند کر دو، اس طرح کہ انھیں ایک قطرہ بھی پانی

نہ ملے نہ پائے جیسا عثمان بن عفان کے ساتھ سلوک کیا گیا تھا۔“

عمر سعد نے اس خط کو دیکھتے ہی عمرو بن حجاج زبیدی کو پانچ سو ارادوں کی فوج کے ساتھ کربلا پر مقرر کر دیا اور یہ تاکید کر دی کہ ایک قطرہ خیام حسینی کی طرف بہانے نہ پائے۔

۱۔ الاخبار الطوال ص ۲۵۰، طبری ج ۶ ص ۲۳۵، ارشاد

تیسواں باب بندش آب اور غلبہ تشنگی

حقیقت امر یہ ہے کہ امام حسین اور آپ کے اصحاب و اقرباء یہاں تک کہ اطفال خورد سال پر پانی بند کرنے کا انتظام دوسری محرم ہی کو ہو گیا تھا۔ اس خط کے ذریعے سے جو ابن زیاد نے حُر بن یزید ریاحی کے پاس بھیجا تھا اور جس میں صاف صاف لکھا تھا کہ حسین کے ساتھ سختی سے پیش آؤ۔ اور انھیں ایک ایسی جگہ قیام پر مجبور کرو جہاں پانی موجود نہ ہو۔ اس حکم کے نفاذ میں اتنا اہتمام تھا کہ قاصد کو یہ ہدایت کر دی گئی تھی کہ وہ حُر سے اس وقت تک جدا نہ ہو جب تک اس حکم کی تعمیل نہ ہو جائے۔ چنانچہ حُر نے امام کے سامنے اپنی مجبوری کا اظہار کر کے حضرت کو کربلا میں ایسے ہی بے آب مقام پر قیام کے لیے مجبور کیا۔ اس کا تذکرہ تفصیل کے ساتھ پہلے ہو چکا ہے۔

اس کے بعد اب صورت حال یہ تھی کہ امام حسین آپ کے اصحاب و اعتراف و خدشات عصمت اور اطفال ان سب کے غیبتہ نہر سے دور جلتی ہوئی ریت پر تھے۔ صحرائے عرب کا سورج دن بھر لینی پوری قوت سے ان خیام پر چمکتا تھا جس کے اندر رہنے والے یقیناً تمازت آفتاب شدت کے ساتھ محسوس کر سکتے تھے۔ نہر فوات قاصد پر رواں تھی اور وہاں دشمن فوج کا قیام تھا۔

کوئی نہیں کہیں کہ ابن زیاد کے خط کے جس جزو پر ہر دیکھنے والے کی نظر سب سے پہلے پڑتی ہے اور جسے حُر نے بھی خاص اہمیت دی ”بے آب مقام“ اس کے مقصد کی طرف خود ابن زیاد کی فوج کے سپاہیوں کی نظر نہ گئی ہوگی جبکہ ہمارا مشاہدہ یہ ہے کہ حکومت کے اقتدار اعلیٰ والے افراد فریق مخالف کے ساتھ جس سخت گیری کا حکم نہیں بھی دیتے، چھوٹے درجہ کے عمال اور سپاہی

۱۔ الاخبار الطوال ص ۲۵۰، طبری ج ۶ ص ۲۳۵، ارشاد ص ۲۱۳، کامل ابن اثیر ج ۴ ص ۲۵۰، البیہقی ج ۱ ص ۲۵۰

یہ اقرباء و انصارِ حسینی کی یادگار و فاداری ہے کہ بغیر امام کے ان میں سے ایک نے بھی باوجود نہر تک پہنچ جانے کے لب تر نہیں کیے اور صاف کہہ دیا کہ یہ ناممکن ہے کہ ہم پانی نہیں اور حضرت امام حسینؑ پیاسے رہیں اور یہ امام کی بلند نظری تھی کہ پانی کے حاصل کرنے پر اپنی طاقت صرف نہیں کی بلکہ تین دن تک صرف اتمامِ حجت کے طور پر ان کے ضمیر کے بیدار کرنے کی کوشش ”سوالِ آب“ کی صورت میں کرتے رہے اور اصحاب کو بھی اسی کی اجازت عطا فرمائی چنانچہ جب شدتِ عطش کا عالم دیکھتے ہوئے بریرہ مدانی نے اجازت چاہی کہ میں ابنِ سعد کے پاس جا کر پانی کے باب میں گفتگو کروں ممکن ہے کہ اس پر کچھ اثر ہو۔ حضرت نے فرمایا ”تمہیں اختیار ہے۔ بریرہ، عمر سعد کے پاس گئے اور کہا ”تم کیسے مسلمان ہو کہ اہلِ رسول کے قتل پر تیار ہو کر آئے ہو۔ پھر اس پر طرہ یہ ہے کہ یہ آبِ فرات ہے جس میں سے عراق کے کتے اور سڑک پانی پیتے ہیں مگر یہ حسینؑ ہیں اور ان کے اہلِ حرم اور اعزّاء و اقارب کہ پیاس سے بے ہلاک ہو رہے ہیں اور انھیں فرات کے پانی تک پہنچنے نہیں دیا جاتا۔“

عمر سعد نے جواب میں گویا اقرارِ جرم کرتے ہوئے یہ عذر پیش کیا ”کہ کیا کروں“ رے کی حکومت مجھ سے جاتی رہے گی اگر ابنِ زیاد کے خلاف کروں اور رے کی حکومت کا ترک کرنا میرے لیے کسی طرح ممکن نہیں ہے۔“

صبح عاشور جب حر بنِ یزید شکرِ شام سے جدا ہو کر جماعتِ حسینی کی طرف گئے تو انھیں سب سے زیادہ فوجِ یزیدی کے جس ظلم و تعدی کا احساس ہوا وہ پانی کا بند کرنا تھا اور ہونا بھی چاہیے تھا اس لیے کہ امام حسینؑ نے اس کے پہلے اور اس کی جماعت کو انتہائی تشنگی کے عالم میں سیراب کیا تھا۔ پھر یہ کہ اسی نے ابنِ زیاد کے حکم سے خیامِ حسینی کو نہر کے کنارے برپا نہ ہونے دیا اس لیے ایک طرح بندشِ آب کا وہ اپنے کو ذرّہ دار سمجھتے تھے چنانچہ انھوں نے امام حسینؑ سے عفوِ قصور کرانے کے بعد فوجِ مخالف کے سامنے جو تقریر کی اس میں انتہائی

تاریخ میں تصریح ہے کہ یہ امام حسینؑ کی شہادت سے تین روز قبل کا واقعہ ہے۔ پانی کی اس بندش کے بعد جماعتِ حسینی کے تمام افراد اور بالخصوص صغیر اطفال پر پانی کا شدید غلبہ ہو گیا۔

پھر دشمن کی یہ تنگ نظری تھی کہ اس ظلم و تشدد کے ساتھ زخمِ زبان بھی لگائے جا رہے تھے۔ جیسے یہ فقرہ کہ: ”حسین! دیکھتے ہو یہ پانی نیلا نیلا آسمانی رنگت کا کس طرح بہہ رہا؟ مگر تم مرتے دم تک اس میں سے ایک قطرہ بھی نہیں پاسکتے۔“

اور یہ کہ اے حسین! یہ پانی موجود ہے۔ جس میں کتے تک منہ ڈالتے ہیں اور عراق کے سڑک گدھے اور بیٹھریے تک اس میں سے پیتے ہیں۔ مگر تم اس میں سے بخدا ایک قطرہ کچھ بھی نہیں پاسکتے۔ بعید نہیں ہے کہ فوجِ یزیدی کا خیال یہ ہو کہ جماعتِ حسینی سے کسی جنگ کی فردیت ہی نہ رہی۔ پیاس کی شدت ہی ان کے ختم کرنے کے لیے کافی ہوگی۔ چنانچہ ایک موقع پر جب حضرت نے اتمامِ حجت کے لیے خطبہ پڑھا اور پیغمبرِ اسلام کے ساتھ اپنے خصوصی تعلق کا اظہار کیا ان نام نہاد سلاؤں میں احساسِ فرض پیدا کرنے کی کوشش فرمائی تو اس کے جواب میں لگایا ”کہ ہم یہ سب جانتے ہیں مگر اس کے باوجود تم کو چھوڑیں گے نہیں۔ یہاں تک کہ پیاس کی شدت کی وجہ سے ہی تم دنیا سے رخصت ہو جاؤ۔“

حالانکہ حسینؑ اصحاب نے اپنی شجاعت سے یہ ثبوت دے دیا کہ ہم اب بھی جب باہمی تمہیں گھاٹ سے ہٹا کر پانی حاصل کر لیں چنانچہ حضرت ابو الفضل العباس کے ساتوں کے بعد بھی جہاد کے پانی لانے کا تذکرہ تاریخ میں ملتا ہے۔

غالباً یہ آٹھویں شب کا واقعہ ہے اس کے بعد آٹھویں، نویں اور دسویں تین دن کی مسلسل پیاس پھر بھی مسلم طور پر قائم رہی ہے۔

۱۔ الاخبار الطوال ۵۲۷ ج ۲ طبری ج ۲۳۲۷۔ ارشاد کامل ابن اثیر ج ۴ ص ۲۷۷۔ تذکرہ خواص الاساطیر ابن جوزی ص ۲۷۷۔ لوت سید ابن طاووس ص ۲۷۷ ج ۲ طبری ج ۲۳۲۷۔ ابن اثیر ج ۴ ص ۲۷۷۔ ارشاد تذکرہ سبط ابن جوزی ص ۲۷۷۔ تذکرہ ص ۲۷۷۔ لوت ابن طاووس ص ۲۷۷ ج ۲ طبری ج ۲۳۲۷۔

پُر انداز میں جماعتِ حسینیٰ بالخصوص خواتین و اطفال کی عطش کا بیان اور بندشِ آب پر اعتراض کیا ہے۔

اس کا تفصیلی تذکرہ آئندہ آئے گا۔

جب اس تمام اتمامِ حجت اور موعظہ و نصیحت کا اس سنگار اور قسی القلب فوج پر کوئی اثر نہ ہوا تو امام حسینؑ اور آپ کے ساتھ کے ہر نتیجے نے اپنے عمل سے ثابت کر دیا کہ راہِ حق پر اُن کے قیام اور ثبات و استقلال میں کسی تشدد اور اندازِ سانی سے ذرہ بھر کمی نہیں ہو سکتی۔ انھوں نے شدتِ تشنگی کی تکلیف کو برداشت کیا اور تین دن کی پیاس کے عالم میں فریضہ ہمارا کو پورے طور سے ادا کرنے کے ساتھ شہادت کا خیر مقدم کیا۔

————— ❦ —————

بیویوں کا باب

صلح کی آخری کوشش اور اس کا انجام

حسینؑ اپنے دامن پر یہ دھبہ لینا نہیں چاہتے تھے کہ آپ مسلمانوں کے درمیان فوری کو پسند کرتے ہیں۔ اس لیے آپ نے اتمامِ حجت کے لیے دوبارہ خود اپنی جانب سے صلح کی گفتگو کا آغاز فرمایا۔ اس طرح کہ عمرو بن قرظہ بن لعب النصارى کو عمر بن سعد کے پاس بھیجا کہ آج شب کو مجھ سے دونوں طرف کے لشکرِ دہ کے درمیان مل لینا۔ چنانچہ عمر سعد کوئی بیس سو اپنے ساتھ لے کر نکلا اور امام بھی اتنے ہی ساتھیوں کے ساتھ تشریف لے گئے مگر جب قریب پہنچے تو آپ نے اپنے ساتھیوں کو ہٹا دیا جس کے بعد ابن سعد نے بھی اپنے ساتھیوں سے علیحدگی اختیار کی۔ یہ مکالمہ بڑی رات گئے تک جاری رہا جس کے بعد امام اپنے خیمہ کی طرف واپس ہوئے اور ابن سعد اپنے لشکرِ گاہ کی طرف چلا گیا۔

یہ تمام گفتگو صیغہ راز میں تھی۔ مخفی طور پر اتنا معام ہو سکا کہ امام حسینؑ اس پر آمادہ تھے کہ عراق میں قیام کے خیال کو ترک کر دیں گے اور اگر ضرورت سمجھی جائے تو عرب کا ملک بھی چھوڑ دیں گے اور کسی دور و دراز مقام پر چلے جائیں گے۔

حقیقت کے لحاظ سے اس صورت میں بھی امام حسینؑ کی فتح تھی یعنی آپ کا ملک ترک کرنا بھی اس مقصد کا ایک اعلان تھا جس کی خاطر آپ کو جان دینا پڑی پھر بھی آپ کا رویہ انبازیم اور سلجھا ہوا تھا کہ یزیدی فوج کے افسر عمر سعد نے صاف اعتراف کر لیا کہ آپ کے راستے پر گامزن ہیں اور اس نے بہت خوش ہو کر ابن زیاد کو خط لکھا اور حضرت

شعبہ شخص کا سردار لشکر باقی رکھنا کیا؟ یقیناً شمر کو بھیجا جائے تاکہ ابن سعد کے طرز عمل کا مدارک اور حسین کے ساتھ ہر قسم کی مصالحتانہ گفتگو کا سبب باب کر سکے۔ چنانچہ ابن زیاد نے اسی دماغی الجھن کے عالم میں عمر سعد کے نام خط لکھا: ”میں نے تم کو حسین کی جانب اس لیے نہیں بھیجا ہے کہ تم ان کے ساتھ مراعات کرو یا ان کے ساتھ معاملات کو طول دو یا ان کو زندگی کی امیدیں لاؤ بلکہ میرے پاس ان کی سفارش کرنے بیٹھو، دیکھو اگر حسین اور ان کے اصحاب میرے حکم کے سامنے تسلیم خم کریں اور اپنے کو میرے رحم و کرم پر چھوڑ دیں تو ان کو خاموشی کے ساتھ میرے پاس بھیج دو اور اگر وہ انکار کریں تو ان پر حملہ کرو لیکن انھیں قتل کر دو اور ان کے اعضاء و جوارح کو قطع کر دو کیونکہ وہ اسی کے مستحق ہیں۔“ اتنا ہی نہیں بلکہ اسلام کے نام کو بدنام، انسانیت کی مٹیانی لڑائی، انصاف سے تراوے تا دینج کو ہمیشہ کے لیے انگشت بدنداں کرنے والے یہ الفاظ تھے جو کسی اور کی نسبت نہیں رسول اسلام کے سب سے پاکے راستہ باز نور حسین کی نسبت لکھے جاتے تھے کہ اگر حسین کو ہلاک کر دیا جائے تو ان کے سینہ اور پشت کو گھوڑوں کی پاؤں سے پامال کرنا کیونکہ وہ سلطنت کی باغی، مخالف اور حریف ہیں۔ یہ تصدیق نہیں ہے کہ اسی موت کے بعد ان کو کوئی نقصان پہنچے گا۔ لیکن یہ زبان سے کہہ چکا ہوں کہ اگر حسین قتل کیا تو ان کے ساتھ یہ سلوک کر دیا جائے گا۔ اگر تم نے ان احکام کا اجماع کیا تو خیر تمھیں معاوضہ ملے گا ایک دفا دار فرماں بردار کو ملنا چاہیے اور اگر تمھیں منظور نہ ہو تو لشکر کی سرداری سے علیحدہ ہو جاؤ۔ اس منصب کو شمر کے سپرد کر دو۔ جسے ہم نے پورے طور سے مناسب ہدایتیں کر دی ہیں“ اس خط شمر کے سپرد کیا اور زبان بھی اس سے کہہ دیا کہ اگر عمر سعد اس حکم کی تعمیل نہ کرے تو معزول تصور ہوگا اور تم اس کی جگہ سردار لشکر قرار پاؤ گے۔ تم حسین سے جنگ کرنا اور عمر سعد کو قتل کر کے اس کا سر میرے پاس بھیج دینا۔

یہ تعجبی اور تنبیہی حکم نامہ شمر کے ہاتھ عمر سعد کے پاس بھیج دیا گیا۔ اب جنگ کا التواء غیر ممکن سا ہو خود عمر سعد کو اس کا خوب اندازہ تھا کہ حسینؑ بڑی کی بیعت یا ابن زیاد کی غیر مشروط اطاعت

اجار الطوال ۲۵۳ ۳۰ طبری ج ۶ ۲۳۶، ارشاد ۲۳۱، ۲۳۲

امام حسینؑ کی اس شرط مصالحت سے اطلاع دی۔ ان الفاظ کے ساتھ کہ ”الحمد للہ فتنہ کی آگ فرو ہو گئی اور مسلمانوں کا شیرازہ مجتمع رہنے کی صورت پیدا ہو گئی اور امت اسلامی کا معاملہ رو بہ اصلاح ہو گیا۔“ انہیں اس نے اپنی رائے بھی لکھی کہ میرے نزدیک اب محاصرت کی کوئی وجہ نہیں ہے اور اب اس معاملہ کو ختم ہونا چاہیے۔“ ۱

کہا جاتا ہے کہ ابن زیاد نے بھی اس رائے کو منظور کرنا چاہا اور کہا کہ عمر سعد کا یہ خط بہت خیر خواہانہ ہے مگر شمرؓ بگڑ گیا اور کہنے لگا۔ ”بھلا ایسا موقع جس کے ہاتھ آئے وہ اسے چھوڑ دے حسینؑ آپ کے پاس پہلو میں آگئے ہیں۔ اگر آج وہ چلے گئے اور انھوں نے آپ کی طاعت اختیار نہ کی تو پھر یاد رکھیے کہ قوت و عزت ان ہی کا حق ہوگا اور کمزوری دعا جزئی آپ کا حصہ۔ میری رائے میں ان کی یہ خواہش کبھی منظور نہ کرنا چاہیے کیونکہ یہ بڑی ذلت کی بات اور کمزوری کی نشانی ہے۔ بیشک انھیں غیر مشروط طور پر ہتھیار ڈال دینا اور آپ کے سامنے برتسم خم کر دینا چاہیے۔ پھر اگر آپ انھیں ان کے جرم کی سزا میں قتل کرنا چاہیں تو آپ کو حق اس کا ہے اور اگر معاف کر دیں تو اس کا بھی امتیاز ہے۔ رہ گیا عمر سعدؑ اس کا کیا ذکر، میں نے تو سنا ہے کہ پوری پوری راتیں وہ حسینؑ کے ساتھ باتوں میں گزار دیتا ہے۔“ ۲

یہ خوشامد آمیز، غیرت انگیز، معصومہ پرداز اور فتنہ پرور تقریر وہ تھی جس سے ایک طرف تو تفوق طلبی اور ظفر انجانی کے جذبہ میں حرکت پیدا ہوئی۔ دوسری طرف انسانیت، غرور اور خود بینی کی رگ میں جنبش ہوئی اور تیسری طرف ابن سعد کی طرف سے بدگمانی ہو گئی اور وہ خلوص اور خیر خواہی کا قرینہ جو اس کی تحریر میں پایا جاتا تھا نیت و نالود ہو گیا۔ شمر بڑا خیر خواہ دوست اور سچا مشیر کار شمار کیا جہلنے لگا اور عمر سعد پر غصہ آنے لگا کہ وہ لڑنے گیا تھا اور رات رات بھر بیٹھ کر دشمن سے باتیں کرتا ہے حسینؑ سے مل گیا ہے اور ہم کو خواہ مخواہ دھوکا دیتا ہے۔ پھر ایسے

۱ طبری ج ۶ ۲۳۶-۲۳۷، ارشاد ۲۳۱، ۲۳۲، شمر کا اصلی نام تھا شریح بن عمرو بن معاویہ۔ وہ بنی عامر بن

محصہ میں آل دجید کلابی میں سے تھا (الاجار الطوال ص ۳۰-۲۵۲) ۳۰ طبری ج ۶ ۲۳۶

چنانچہ اس نے اسی وقت حمد کی تیاری کا حکم جاری کر دیا اور روزِ بخشنیہ نوں تاریخ کی شام ہونے نہیں پائی تھی کہ امام حسینؑ پر حملہ کر دیا گیا۔ یہ حملہ بالکل بغیر اطلاع تھا۔ امام حسینؑ عصر کی نماز کے بعد خیمہ کے دروازے پر تلوار کا سہارا لیے گھسٹوں پر سر رکھے بیٹھے تھے اور آپ کی آنکھ لگ گئی تھی کہ ایک مرتبہ گھوڑوں کی ٹاپوں اور فوج کے غل کی آواز جناب زینبؑ کے کان میں گئی۔ آپ گھبرا کر پردے کے پاس آئیں اور امام حسینؑ کو مخاطب کیا کہ دیکھیے فوج دشمن کی آوازیں بہت نزدیک سے آ رہی ہیں۔ آپ نے سر اٹھایا اور فرمایا میں نے ابھی خواب میں دیکھا رسول اللہؐ کو، حضرت نے مجھ سے فرمایا کہ تم عنقریب ہمارے پاس آیا چاہتے ہو۔ ادھر اچانک دشمنوں کے حملہ سے زینبؑ کا دل پریشان تھا ہی۔ ادھر جو امام نے یہ خواب بیان کیا تو جناب زینبؑ مضطرب ہو گئیں۔ دونوں ہاتھوں سے منہ پیٹ لیا اور کہا: ”ارے یہ غضب!“ امام نے بہن کو تسکین دی۔ فرمایا: ”اے بہن غضب تمہارے دشمنوں کے لیے، خاموش رہو۔ خدا مالک ہے۔“ ابھی گیفتگو ہو رہی تھی کہ ابوالفضل العباسؑ نے آکر اطلاع دی کہ فوج اعداء نے چڑھائی کر دی ہے۔ حضرت یسناکرا اپنی جگہ سے اٹھ کھڑے ہوئے اور فرمایا کہ عباسؑ سوار ہو جاؤ اور ان سے پوچھو کہ اس وقت حملہ کا سبب کیا ہے؟ جناب عباسؑ بیس سواروں کے ساتھ تشریف لے گئے اور آپ نے فوج مخالفت سے خطاب کرتے ہوئے دریافت کیا کہ تمہاری رائے میں کیوں تبدیلی ہوئی اور اب تم کیا چاہتے ہو؟ جواب ملا کہ ”امیر ابن زیاد کا حکم آیا ہے کہ تم لوگوں سے امیر کی اطاعت قبول کرنے کا مطالبہ کیا جائے اور نہیں تو پھر جنگ شروع کر دی جائے۔“ آپ نے فرمایا کہ اچھا پھر جلدی نہ کرو۔ میں امام کے پاس جا کر تمہارا مطالبہ پیش کرتا ہوں۔ اس کے بعد حبیبیا کچھ امام فرمائیں گے اس سے تم کو مطلع کر دوں گا۔ جناب عباسؑ گھوڑے کو مرپٹ دوڑاتے ہوئے امام حسینؑ کی خدمت میں واپس گئے اور آپ کو واقعہ کی اطلاع دی۔ حضرت نے فرمایا اگر ممکن ہو تو آج کی شب کی ان سے مہلت حاصل کر لو تاکہ

لے طبری ج ۶ ص ۲۳۸

پرہیز گزارانہ نہ ہوں گے اس لیے جو نبی اسے ابن زیاد کا خط شمر کے ہاتھ پہنچا اور اس نے کھول کر اسے پڑھا فوراً شمر سے کہنے لگا: ”کم محبت یہ تو نے کیا کیا؟ خدا تجھ سے سمجھے، خدا تجھے غارت کرے اور اس پیغام کو غارت کرے جو تو میرے پاس لایا ہے۔ بخدا میں سمجھتا ہوں کہ تو نے ہی ابن زیاد کو میرے مشورہ پر عمل کرنے سے روک دیا اور اس بات کو بگاڑ دیا جس کے بن جانے کی امید تھی۔ خدا کی قسم حسینؑ کبھی اپنے کو ابن زیاد کے رحم و کرم پر چھوڑنا پسند نہ کریں گے۔ یقیناً حسینؑ اپنے باپ کا دل اپنے سینے میں رکھتے ہیں۔“ شمر نے کہا: ”ان باتوں کو جانے دو۔ یہ بتاؤ کہ اب کیا کرو گے؟ اپنے امیر کے حکم پر عمل یا سرداری کو میرے سپرد کر دو گے؟“

مکروردل اور دنیا پر جان دینے والا عمر سعد اپنی تمام قلبی کیفیتوں اور ضمیر کی ہدایتوں کو اس وقت بھول جاتا تھا جب دنیا کے وقتی اعزاز اور جاہ و ثروت کے اس کے ہاتھ سے جانے کا سوال پیش ہوتا تھا اور اس طرح وہ دنیا کے عشق میں اپنی تمام وجدانی کیفیتوں کے پامال کر دینے پر اس حد تک تیار ہو جاتا تھا کہ اس کے ذیل میں اس کو بڑے سے بڑے جرم کا ارتکاب بھی گوارا ہو جاتا تھا۔ خطرہ بالکل قریب اور اس کا رقیب سرداری شمر سامنے موجود تھا اور صرف ایک ہاں یا نہیں کا جواب وہ تھا کہ جس پر تمام اس کی آئندہ زندگی کا دارومدار تھا۔ جس میں فقط سرداری رہنے یا نہ رہنے کا سوال ہی نہ تھا بلکہ ابن زیاد کے صریح حکم کے مطابق جان جانے کا اندیشہ بھی تھا۔ اس کے لیے تو ایسے ہی تندہیت پسند کی ضرورت تھی جو راہِ حق کے فداکاروں میں ہوا کرتا ہے۔ عمر سعد اس جذبہ سے غرق و رشتہ دستِ تقدس سے منہ نہ شمر کے ہی سوال پر اسے کہہ دینا پڑا کہ نہیں میں ہی اس مہم کو سر کر دوں گا۔ یہاں بھقیں پیادوں کا افسر بنائے دیتا ہوں۔ اس کے بعد سے شمر کا وجود اس کے لیے سو ہاں روح ثابت ہو رہا تھا۔ ابن زیاد کی بدگمانی کی نسبت ظاہر ہو چکی تھی لہذا اسے اپنی وفاداری اور خیر خواہی کا ثبوت فراہم کرنا تھا۔ اس نے جنگ میں ذرا بھی تاخیر اس کے نزدیک مناسب نہ تھی۔

لے ارشاد ص ۲۴۲ لے الاخبار الطوال ص ۲۵۳ لے طبری ج ۶ ص ۲۳۶ - ۲۳۷

پچیسواں باب شب عاشور یعنی محرم کی دسویں رات

گوشش کے ساتھ اس رات کی ہمت اس لیے نہیں لی گئی تھی کہ جنگ کی کوئی خاص تیاری کر لی جائے، نہ یہ کہ کہیں سے کسی امداد کے آنے کی کل تک امید ہو اور نہ یہ کہ امام چاہتے تھے کہ اپنے اہل بیت اور سپہاندگان کو آئندہ کے لیے کچھ وصیتیں فرمادیں اور انھیں آئندہ کے لیے تیار کر دیں یا اپنے بعد ان کی حفاظت کا کوئی سامان کرنا منظور تھا۔ ان میں سے کوئی بات نہ تھی۔ بلکہ ایک تو مقصد اس ہمت کا وہی تھا جو خود آپ نے جناب عباس سے ظاہر فرمادیا تھا۔ اس وقت جب انھیں ہمت لینے کے لیے بھیجا ہے وہ یہ تھا کہ ہم آج کی رات اپنے پروردگار کی خوب عبادت کر لیں اور دعا و استغفار میں مصروف رہیں۔ چنانچہ آپ نے اور آپ کے اصحاب نے تمام شب اس عالم میں گزاری کہ وہ مسلسل نماز اور دعا اور دعا اور استغفار اور بارگاہِ الہی میں تضرع و زاری میں مصروف تھے۔

دوسری بڑی مصلحت اس ایک شب کی ہمت میں یہ مضمر تھی کہ آپ خطرہ کے یقینی ہونے کے بعد اپنے ساتھیوں کو اپنی اپنی طبیعتوں کے تول لینے کا موقع دینا چاہتے تھے اور ایک بار اور یہ کہ دینا چاہتے تھے کہ جو آپ کا ساتھ چھوڑ کر جانا چاہتا ہو وہ چلا جائے تاکہ عین موقع پر کوئی ایک متنفس بھی ایسا باقی نہ رہے پائے جو خطرہ کے ہنگامی ہونے کی وجہ سے بادل ناخواستہ آپ کا ساتھ دینے پر مجبور ہوا ہو۔ چنانچہ آپ نے شام ہوتے ہوتے اپنے ساتھیوں کو مجتمع کر کے یہ خطبہ ارشاد فرمایا:۔

۱۔ طبری ج ۶ صفحہ ۲۲۸

آج رات مہرم عبادت الہی اور دعا و استغفار میں بسر کر لیں۔ اللہ ہی واقف ہے کہ میں اُن کی نماز و عبادت، تلاوت قرآن اور دعا و استغفار سے کتنی محبت رکھتا ہوں۔ ادراس دوران میں حبیب بن مظاہر اور زہیر بن قین فوج مخالف سے گفتگو اور حضرت امام حسین پر بلا و جہل و ظلم و ستم کرنے پر اُن کو قائل معقول کرتے رہے یہاں تک کہ جناب عباس واپس آئے اور امام کے ارشاد کے مطابق ان سے ایک رات کی ہمت طلب کی۔ عمر سعد گزشتہ واقعات کی بنا پر شمر کی موجودگی کو اپنے لیے انتہائی خطرناک سمجھتا تھا۔ اس لیے اب وہ امام حسین کے متعلق خواہ مخواہ بھی تشدد سے کام لینا چاہتا تھا۔ لہذا وہ شمر کی طرف متوجہ ہوا اور کہا: تمہاری اس بارے میں کیا رائے ہے؟ شمر نے جواب دیا کہ جیسا آپ مناسب سمجھیں۔ اس لیے کہ آپ انہیں اور آپ کی رائے معتبر ہے۔

عمر سعد نے سمجھ لیا کہ شمر کا یہ جواب طنزیہ انداز کا حامل ہے، اس نے کہا: ”میں چاہتا ہوں کہ ہمت نہ دی جائے“۔ مگر چونکہ دراصل اس کا ضمیر اس کے خلاف تھا اس لیے اب وہ متوجہ ہوا دوسرے سرداروں کی طرف اور ان سے دریافت کیا کہ کیوں تمہاری کیا رائے ہے۔ عمرو بن حجاج زبیدی، یثربی بن عروہ کے برادر نسبتی نے جو اُن کے قتل کی خبر سنا کر فوج لے کے دارالامارہ پر چڑھ دوڑا تھا، کہا: ”سبحان اللہ! اگر یہ لوگ قبیلہ ترک و دہلیم سے بھی ہوتے اور اتنی مراعات کے طالب ہوتے تو تمہیں ان کے ساتھ یہ مراعات لازم تھی؟“ قیس بن اشعث نے بھی یہی مشورہ دیا کہ ہمت دینی چاہیے۔ حضرت عباس کے ضبط و ضبط کا بے نظیر نمونہ تھا کہ یہ تمام گفتگوئیں آپس میں ہوتی رہیں اور آپ خاموش نتیجہ کے منتظر کھڑے رہے۔ آخر کو ہمت کا مسئلہ طے پایا اور جناب عباس واپس ہوئے۔ اس طرح کہ آپ کے ساتھ عمر سعد کی فوج کا ایک نمائندہ بھی تھا اور اس نے آکر کہا کہ ہم آپ کو کل تک کی ہمت دیتے ہیں۔ اگر کل آپ نے ہتھیار ڈال دیے تو ہم آپ کو اپنے امیر عبداللہ بن زیاد کے پاس بھیج دیں گے اور اگر آپ نے انکار کیا تو پھر جنگ یقینی ہوگی۔

۱۔ طبری ج ۶ صفحہ ۲۲۸۔ ۲۔ طبری ج ۶ صفحہ ۲۲۹۔ ۳۔ طبری ج ۶ صفحہ ۲۳۰۔ ۴۔ ارشاد صفحہ ۱۴۳

خدا کی قسم میں ان دشمنوں سے نیزہ کے ساتھ جنگ کروں گا۔ یہاں تک کہ میرا نیزہ ان کے سینوں میں ٹوٹ جائے اور تلوار چلاؤں گا جب تک کہ اس کا قبضہ میرے ہاتھ میں ٹھہر سکے اور میں آپ سے کسی طرح جدا نہ ہوں گا۔ اگر ہتھیار نہ ہوں گے کہ جن سے جنگ کروں تو میں انھیں پتھر ماروں گا اور آپ کی حمایت کروں گا یہاں تک کہ آپ کے قدموں پر اس جان کو نثار کر دوں۔“ اس کے بعد سعید بن عبداللہ حنفی نے کہا: ”بخدا ہم آپ کا ساتھ نہیں چھوڑیں گے جب تک کہ خدا کی بارگاہ میں یہ ثابت نہ کر لیں کہ ہم نے رسالت اللہ کے غائبانہ حق کو آپ کے بارے میں ادا کر دیا۔ بخدا اگر مجھے یہ معلوم ہو کہ میں قتل ہو گیا پھر زندہ کیا جاؤں گا، پھر جیتے جی جلادیا جاؤں گا، پھر میری خاک ہوا میں منتشر کی جائے گی اور ایسا ہی میرے ساتھ ستر مرتبہ ہوگا تب بھی میں آپ کا ساتھ نہ چھوڑ دوں گا جب تک کہ آخری مرتبہ بھی آپ کے قدموں پر موت نہ آجائے۔ پھر جائیکہ یہ تو ایک مرتبہ کا قتل ہونا ہے اور اس کے بعد وہ دائمی عزت ہے جو کبھی ختم ہونے والی نہیں۔“ تہمیرین قین نے کہا: ”بخدا میری تو آرزو یہ ہے کہ میں قتل کیا جاؤں، پھر زندہ ہوں اور پھر قتل کیا جاؤں۔ ایسا ہی ہزار مرتبہ ہو مگر کسی طرح آپ سے اور آپ کے خاندان کے ذبوانوں سے یہ مصیبت دفع ہو جائے۔“ دیگر اصحاب نے بھی ملتے جلتے الفاظ میں اسی قسم کے جذبات کا اظہار کیا اور سب کا متفق اللہ علیہ مطلب یہی تھا کہ یہ غیر ممکن ہے کہ ہم آپ سے جدا ہو جائیں بلکہ اپنی جانیں آپ پر فدا کر دیں گے۔ ہاں جب ہم مر جائیں تو پھر چاہے جو ہو ہم تو اپنا فرض ادا کر چکے ہوں گے۔ امام نے دعائے خیر دی اور اپنے خیمہ میں واپس تشریف لے گئے۔ یہ تھا مجاہد کربلا کی حقانیت کا ایک بے مثال مظاہرہ۔ آپ زورِ تقریر سے جوش و خروش پیدا کرنے والے بیانات اور خوش آئند و لغزیر تو قعات سے اپنے ساتھ والوں کو ساتھ رکھنا نہیں چاہ رہے تھے بلکہ ان کے سامنے حقیقتِ حال کو واضح کر کے غلط فہمیوں کو دور کر رہے تھے۔ یہ گوشش شبِ عاشور ہی تک نہیں رہی بلکہ اس کا آپ کی جانب سے مظاہرہ روزِ عاشور بھی ہوا۔ خاص طرح کہ جب تشریف عمر و حضرت کو جو انصار امام میں سے ایک تھے یہ خبر پہنچی کہ ان کا فرزند

”تمام تعریفیں خدا کے لیے ہیں۔ راحت و تکلیف ہر حال میں اس کا شکر ہے۔ بارِ الہا تیرا شکر ہے کہ تو نے ہم کو نبوت کی عزت عطا کی۔ قرآن کا علم دیا۔ دینی معلومات کا خزانہ مرحمت فرمایا اور ہمیں گوشِ شنوا، چشمِ بینا اور دلِ دانائی نعمتوں سے مالا مال کیا۔“ اس کے بعد حضرت نے فرمایا: ”معلوم ہونا چاہیے کہ میں دنیا میں کسی کے ساتھیوں کو اپنے ساتھیوں سے زیادہ با وفا اور ان سے بہتر نہیں جانتا اور نہ اپنے اعزاء سے زیادہ نیکو کا اور اداے حق کرنے والے اعزاء کسی کے مجھے معلوم ہیں۔ خدا تم سب کو میری طرف سے جزلے خیر دے۔ آگاہ ہو کہ دشمن کل ضرور جنگ کرے گا۔ میں بخوشی اجازت دیتا ہوں کہ جہاں تمھارا جی چاہے چلے جاؤ۔ میں بیعت کی ذمہ داری تم سے ہٹاتا ہوں۔ رات کا پردہ پڑا چاہتا ہے اسی کو اپنا مرکب بنا کر روانہ ہو جاؤ۔ تم ہی کو میں جانے کے لیے نہیں کہتا بلکہ ہر ایک تم میں سے میرے عزیزوں میں سے بھی ایک ایک شخص کا ہاتھ پکڑ لے اور اپنے ساتھ لیتا جائے۔ اس لیے کہ یہ لوگ صرف میرے طالب ہیں اگر مجھے قتل کر ڈالیں تو پھر کسی دوسرے کی طرف متوجہ نہیں ہوں گے۔“

اس تقریر کو سن کر سب سے پہلے حضرت ابو الفضل العباس کھڑے ہوئے اور کہا: ”کس لیے ہم ایسا کریں؟ کیا اس لیے کہ آپ کے بعد ہم زندہ نہیں؟ ہرگز نہیں، خدا ہم کو یہ روزِ بد نصیب نہ کرے۔“ دوسرے تمام اعزاء بھی حضرت عباس کے ساتھ ہم آواز ہوئے اور متفق اللہ علیہ ہو کر یہی الفاظ زبان پر جاری کیے جس کے بعد امام نے خاص طور سے اولادِ عقیل کی طرف متوجہ ہو کر فرمایا کہ تمھارے لیے تو مسلم کا قتل ہو چکا بہت کافی ہے۔ تم چلے جاؤ، میں انھیں اجازت دیتا ہوں۔ ان سب نے متفق اللہ علیہ ہو کر کہا: ”ہم ایسا نہیں کریں گے۔ آپ کے بعد زندہ رہنے کا کوئی مزہ نہیں۔“

اس کے بعد اصحاب میں سے مسلم بن عوجہ کھڑے ہوئے، کہا کہ ”ہم آپ کو چھوڑ دیں؟ یہ نہیں ہو سکتا

عمر دسے کی سرحد پر قید ہو گیا ہے انھوں نے کہا کہ خدا پر چھوڑتا ہوں اس کو بھی اور اپنے آپ کو بھی۔ بیشک اگر مجھے زندہ رہنا ہوتا تو یہ پسند نہ کرتا کہ وہ قید میں رہے۔ امام کو اس کی خبر ہوئی تو آپ نے فرمایا کہ تم میری بیعت سے آزاد ہو، جاؤ اور اپنے فرزند کی رہائی کی فکر کرو۔ وفادار مجاہد نے جواب دیا کہ ”مجھے جیل سے جی درندہ کھا جائیں اگر میں آپ سے جدا ہوں، یہ بھلا کیونکر ہو سکتا ہے۔“ حضرت نے فرمایا۔ ”اچھا اپنے فرزند محمد کو بھیج دو اور یہ کہڑے اس کو دے دو کہ ان کی قیمت سے اپنے بھائی کی رہائی کا سامان کر سکے۔“ آپ نے پانچ کہڑے مرحمت کیے جن کی قیمت ہزار اشرفیہ کے قریب تھی۔ اس کے بعد جیل خانہ نثار امام کے ساتھ رہ گئے تھے وہی ہو سکتے تھے جو موت کو اپنے لیے یقینی سمجھتے ہوئے دل و جان سے مقصد حسین کی حمایت کے لیے آمادہ تھے اور ان کے کردار میں کمزوری کے تشابہ کا امکان بھی نہ تھا۔

غیر مصلحت اس ایک رات کی ہمت میں یہ ہو سکتی تھی کہ آپ دشمن کو ایک موقع اور اپنے کردار کے جائزہ لینے کا دینا چاہتے تھے تاکہ اگر کسی میں صلاحیت راہِ راست پر آنے کی ہو تو وہ آجائے۔ چنانچہ عمر سعد کی فوج کا ایک بڑا افسر حُر بن یزید ریاحی جو سب سے پہلے حسین کو گھیر کر بلا میں لانے کا ذمہ دار تھا اپنے ضمیر کی ہدایت کی بنا پر فوج مخالفانہ علیحدہ ہو کر اصحابِ حسین میں داخل ہو گیا اور اس نے بھی آپ کی نصرت میں اپنی جان دی۔ اسی طرح اور بھی چند سپاہی نصرتِ باطل چھوڑ کر نصرتِ حق پر آمادہ ہو گئے۔

حقیقت میں ایک داعیِ حق کی بڑی کامیابی ہی قرار پاسکتی ہے کہ وہ کسی ایک متنفس کو ہی سہی حقیقی معنی میں راہِ ہدایت دکھا سکے اور حضرت امام حسینؑ کی یہ ایک بڑی کامیابی اس رات کی ہمت کا نتیجہ تھی جو آپ نے دشمن سے مانگ کر حاصل کی تھی۔

گزشتہ خطبہ کے بعد تمام رات امام اور اصحابِ امام نے عبادتِ خالق میں بسر کی۔

اس کے ساتھ آپ نے جنگ کے ہنگام کے لیے امکانی حد تک تحفظی تدابیر بھی کیے۔ آپ نے اپنے اصحاب کو حکم دیا کہ وہ غیموں کو بالکل ایک دوسرے کے ساتھ ملا دیں اور ہر غیمہ کی

طاب کو دوسرے غیمہ کے ساتھ باندھ دیں۔ اس کے علاوہ آپ نے پشت کی جانب ایک ایسے نشیب کو جو ایک نالی کی طرح سے تھا کھدوا کر خندق تیار کرادی اور اس میں لکڑیاں جمع کرادیں کہ جب ان میں آگ دی جائے تو اس طرف سے دشمن کے حملہ کا اندیشہ نہ رہے۔

یہ تیاریاں شبِ عاشور مکمل ہو گئیں اور صبح کو اس خندق میں آگ روشن کر دی گئی اس طرح فوجِ دشمن کو بالکل گھیر کر چاروں طرف سے حملہ کرنے کا موقع باقی نہ رہا۔



بیکہ نے جواب دیا کہ "خدا کی قسم میرے قوم و قبیلہ والے اچھی طرح واقف ہیں کہ مجھے جوانی سے لیکر اس عمر تک کبھی مذاق سے دلچسپی نہیں رہی۔ مگر میرا دل اس وقت مستقبل کے تصور سے محفوظ ہو رہا ہے۔ خدا کی قسم ہمارے اور سعادتِ ابدی کے درمیان بس اب اتنا فاصلہ ہے کہ یہ دشمنانِ دین تو ایں لے کر ہم پر ٹوٹ پڑیں اور مجھے تو تمنا ہے کہ کسی طرح وہ وقت جلد آئے کہ ان کی تلواریں ہم پر پڑنے لگیں۔" ۱۰

بے شک یہ حقانیت پر اعتماد اور اخروی کامیابی کے کامل یقین ہی کا نتیجہ ہو سکتا ہے۔ یہی چیز کمزور دل میں طاقت پیدا کرتی اور مایوسیوں کی ظلمت میں امید کی شمع روشن کرتی ہے۔ اتنی دیر میں فوج مخالفت میدانِ جنگ میں آگئی، پرے جھمکے گئے اور لشکر کی ترتیب ہوئی مینہ پر عمرو بن حجاج زبیدی، میسرہ پر یثمر بن ذی الجوشن، سواروں کا سردار عزمہ بن قیس حمسی اور پادوں کا انصر شہبث بن ربعی ربوہی اور علم عمر سعد نے اپنے غلام درید کے سپرد کیا۔ ۱۱ امام حسینؑ بھی میدانِ جہاد میں آگئے۔ یقیناً تاریخ ایک ایسے سپہ سالار کی مثال پیش کرنے سے قاصر ہے جس نے ایسی چھوٹی سی جماعت کو کم از کم میں تیس ہزار فوج کے مقابلہ میں جنگ کے لیے کھڑا کیا ہو۔

ایک تاریخی صراحت کے مطابق یہ تیس سوار اور چالیس پیادوں سے زیادہ نہیں تھے۔ ۱۲ اور اسی لیے شہدائے کربلا کے لیے بہتر کی لفظ زبان زدِ خلافت ہے۔

مگر کربلا کے حالات جنگ اور مجاہدین کے ناموں کی تفصیل اور دوسرے متعلقہ واقعات سے پچھا جاسکتا ہے کہ یہ تعداد سو سے زیادہ اور دوسو سے کم تھی بلکہ ممکن ہے کہ عام طور پر تاریخ میں جو تعداد درج اور عموماً زبان زدِ خلق ہے اور جو اس کتاب میں بھی بعض جگہ نظر آئیگی۔

۱۰ طبری ج ۶ ص ۲۴۱ ۱۱ الاخبار الطوال ص ۲۵۴ طبری ج ۶ ص ۲۴۱ ۱۲ ارشاد ص ۲۴۶

۱۳ الاخبار الطوال ص ۲۵۴ طبری ج ۶ ص ۲۴۱ ۱۴ ارشاد ص ۲۴۶

۱۵ تاریخ طبری ج ۶ ص ۲۴۱ ۱۶ الاخبار الطوال ص ۲۵۴ طبری ج ۶ ص ۲۴۱ ۱۷ ارشاد ص ۲۴۶

۱۸ تاریخ طبری ج ۶ ص ۲۴۱ ۱۹ الاخبار الطوال ص ۲۵۴ طبری ج ۶ ص ۲۴۱ ۲۰ ارشاد ص ۲۴۶

چھبیسواں باب

دسویں محرم ۶۱ھ

اتمامِ حجّت اور آغازِ حرب

عاشور کی رات اپنی تمام کیفیتوں سمیت ختم ہوئی۔ یقین کرنا چاہیے کہ اس شب کربلا کے میدان میں کسی کی آنکھ لگنے نہ پائی ہوگی۔ اس طرف عبادتِ خدا اشتیاقِ شہادت، بی بیوں میں بے تابی بچوں میں پریشانی اور سب سے بڑھ کر پاپس کا غلبہ اور اس طرف جنگ کی تیاری، اسلحہ کی دھتکا تدابیر جنگ کے متعلق مشورے اور اپنے ظالمانہ ارادوں کی تکمیل کے لیے صبح کا انتظار۔ بہر حال رات ختم ہوئی اور سپیدہٴ سحری نمودار ہوا۔ حضرت امام حسینؑ نے اصحاب و اقربا کے ساتھ نماز صبح بجماعت ادا کی، وہ نماز جس کے تعقیبات میں کربلا کا جہاد تھا۔

عام انسانی دل و جگر کے معیار کو پیش نگاہ رکھتے ہوئے ظاہر میں افراد خیال کر سکتے ہیں کہ اس وقت اصحابِ حسینؑ پر عجیب ہراس کا عالم طاری ہوگا۔ سامنے نظر جاتی ہوگی تو ان کو دشمن کی فوج کا عظیم ہندو موجود لیتا ہوا نظر آتا ہوگا اور اپنی ہستی اس میں حجاب کی سی نظر آ رہی ہوگی مگر یہ حقیقتاً ایسا نہیں تھا۔ ان کے دل اطمینان سے معمور تھے۔ ان کے سینوں میں خوشی اور سرست کی ہلکی ہتھیں اور ان کے چہروں پر فرحت و انبساط کی سرخی تھی۔ وہ جیسے کبھی خوش نہیں تھے دیے آج خوش نظر آ رہے تھے جیسی پہ مذاق باتیں کہتی تھیں نہ کرتے تھے دیسی آج کر رہے تھے۔

چنانچہ عبدالرحمن بن عبدالربہ انصاری اور جریر بن خضیر سہلانی کا واقعہ ہے کہ جریر نے عبدالرحمن

۱۰ طبری ج ۶ ص ۲۴۱ ۱۱ الاخبار الطوال ص ۲۵۴ طبری ج ۶ ص ۲۴۱ ۱۲ ارشاد ص ۲۴۶ ۱۳ تاریخ طبری ج ۶ ص ۲۴۱ ۱۴ الاخبار الطوال ص ۲۵۴ طبری ج ۶ ص ۲۴۱ ۱۵ ارشاد ص ۲۴۶ ۱۶ تاریخ طبری ج ۶ ص ۲۴۱ ۱۷ الاخبار الطوال ص ۲۵۴ طبری ج ۶ ص ۲۴۱ ۱۸ ارشاد ص ۲۴۶ ۱۹ تاریخ طبری ج ۶ ص ۲۴۱ ۲۰ الاخبار الطوال ص ۲۵۴ طبری ج ۶ ص ۲۴۱ ۲۱ ارشاد ص ۲۴۶

اسی لیے آپ نے مصاحمت کی گفتگوئیں کیں۔ ملک عرب کو چھوڑنے اور بدری کی زندگی بسر کرنے پر آمادگی ظاہر کی اور اسباب اشتعال پیدا کیے جانے کے باوجود بھی اپنے ساتھیوں کو جنگ میں بہت سے روکے رکھا اور لڑائی کی مکمل تیاری ہو چکنے کے بعد بھی اپنی طرف سے پہل نہ ہونے دی چنانچہ صبح عاشور ابھی جب خیام امام کے ساتھ خندق میں آگ بھڑک رہی تھی تو ادھر کا ایک سوار سر سے پیر تک لوہے میں غرق اس طرف سے گزرا اور اس خندق کی آگ کو شعلہ ورد گچھ کر ایک انتہائی اشتعال انگیز جملہ کہا۔ معلوم ہوا کہ عمر بن ذی الجوشن ہے۔ مسلم بن عوف نے امام سے عرض کیا کہ اجازت ہو تو اس کو تیر کا نشانہ بنا لوں کیونکہ یہ بڑا فاسق و فاجر شخص ہے اور اس وقت بالکل تیر کی زد پر ہے۔ حضرت نے فرمایا: ”نہیں ایسا نہ کرو۔ میں جنگ میں پہل نہیں کرتا چاہتا۔“ لے یاد رکھنا چاہیے کہ یہ ایک تیر جو اس وقت کمان سے رہا ہو جاتا تو عیت جنگ کو تبدیل کر دیتا۔ امام نے اس کا سختی کے ساتھ لحاظ رکھا۔

دوسرے اس کی ضرورت تھی کہ آپ کے خلاف دشمنوں کے طرزِ عمل میں تاویل کی کوئی گنجائش باقی نہ رہ جائے۔ سب سے بڑی تاویل کسی ناروا عمل کے متعلق اسکا بے خبری اور نادانیت پر محمول کیا جانا ہے۔ بنی امیہ نے اپنے حدودِ مملکت میں یہ پردہ پگینڈا کیا تھا کہ پیغمبرِ اسلام نے اپنے بعد کوئی اولاد نہیں چھوڑی اور ہم ان کے وارث جانتے ہیں۔ اس کے لیے ضرورت تھی کہ امام حسینؑ اپنے ہم و نسب اور خاندانی خصوصیات نیز اپنے بارے میں اسلامی روایات کو فوج مخالفت پر اس طرح واضح کر دیں کہ ان میں سے کسی ایک فرد کے لیے بھی نادانیت کے عذر کی گنجائش باقی نہ رہ جائے اور آپ کے خلاف جو ظلم ہو رہا ہے اس کے جرم کی اہمیت ہر ایک پر بالکل روشن ہو جائے۔ ان میں سے ہر ایک نہ خود اپنے نفس کو دھوکا دے سکے اور نہ دوسروں کو ان کی نسبت کسی ”ناچل برصحت“ کا راستہ مل سکے۔ امام حسینؑ دیکھ چکے تھے کہ ان سب سے پہلے ان کے والد حضرت علیؑ کا مقابلہ کیا گیا اور اس مقابلہ کو خطائے اجتہادی کا پردہ ڈال کر قابلِ معافی سمجھ

ان جاننا زوں کی ہو جو فوجی انداز پر تربیت یافتہ تھے لیکن سلسلہ جہاد میں بہت سے ایسے افراد بھی میدان میں آگئے جو فوجی حیثیت سے سپاہی نہ سمجھے جاسکتے تھے۔

میدان جنگ میں آنے کے بعد پہلے امام نے اپنے ہاتھ درگاہِ احدیت میں بلند کیے اور یہ مناجات زبان پر جاری کی۔ کیا نسبت دی جاسکتی ہے نبی خدا حضرت عیسیٰؑ کی آواز کو جو بائبل (عہد جدید) کی نقل کے مطابق صلیب پر بلند ہوئی تھی۔ اس انداز سے کہ ایسی ایسی لما سبقتنی ”لے خدا تو نے مجھے کیوں چھوڑ دیا“ فرزندِ رسولؐ امام حسینؑ کی اس مناجات کے ساتھ جو اس سیلابِ مصیبت کے اندر آپ کے لبوں پر جاری ہو رہی تھی۔

خداوند! تو میرا سہارا ہے ہر تکلیف میں اور میرا قبیلہ امید ہے ہر سختی میں اور تجھ پر مجھے ہر حم میں جو درپیش ہو پھر دوسا ہے۔ کتنے ہی صدے ایسے ہیں جن کے برداشت کرنے سے دل کمزور ثابت ہوتا ہے اور حیلہ و تدبیر کی راہیں بند نظر آتی ہیں۔ دوست ان میں ساتھ چھوڑ دیتے اور دشمن ان میں طعنہ زنی کرتے لگتے ہیں۔ میں ان کو تیرے حضور میں پیش کرتا اور تیری بارگاہ میں عرض معروض کرتا ہوں اس لیے کہ میں تجھے چھوڑ کر کسی اور سے لو لگانا ہی نہیں جانتا تو اس تکلیف کو دہر کرتا اور اس کا تدارک کرتا ہے۔ یقیناً تو ہی ہر نعمت کا مالک اور احسان کا مرکز اور ہر مطلب کے لیے آخری جائے پناہ ہے۔“ لے

اس کے بعد آپ نے اپنے چھوٹے لے لشکر کو ترتیب دیا۔ مہینہ پر تیسر بن قین، مسیرہ پر حبیب بن مظاہر اور عکدار عباس بن علیؑ قرار دیے گئے۔ لے چونکہ امام حسینؑ کی جدوجہد کا مقصد یہ تھا کہ دین و ایمان شریعت کی حقانیت کو ظاہر کرنے ہوئے اپنے دشمن کی سیرت و کردار کے متعلق دنیا کے سامنے اس حقیقت کو ثابت کر دیں کہ اے اسلام سے دور کا بھی کوئی تعلق نہیں ہے اس کے لیے ضرورت تھی کہ ایک تو آپ کے کردار میں کوئی ایسا شائبہ بھی نہ آنے پائے جو آپ کے خلاف تشدد کے جواز کی دلیل بن سکے۔

طبری ج ۶ ص ۲۲۶۔ ارشاد م ۲۲۶۔ طبری ج ۲ ص ۲۲۶۔ الارشاد الطول ص ۲۵۳۔

کہ اہل حرم میں گریہ و بکا کا شور بلند ہوا۔ حضرت نے تجسس و غلی اکیڑ کو بھیجا کہ انھیں خاموش کر دے۔ روئے کا وقت بعد کو آئے گا۔ جب آواز گریہ کی موقوف ہو گئی تو حضرت نے حمد الہی ادا فرمائی اور خدا کے اوصاف ذکر فرمائے پھر جناب رسالتؐ پر درود بھیجا اور آنحضرت کے اوصاف و فضائل دیر تک بیان فرماتے رہے۔ راوی کا بیان ہے کہ میں نے حسینؑ کے پہلے اور حسینؑ کے بعد کوئی متکلم نہیں دیکھا جو فصاحت و بلاغت میں آپ سے بڑھا ہوا ہو۔ حمد و صلوات ادا کرنے کے بعد حضرت نے فرمایا۔ ”ذرا میرے نام و نسب پر غور کرو اور دیکھو تو میں کون ہوں پھر اپنے گریبانوں میں منہ ڈالو۔ غور کرو کہ تمہارے لیے میرے خون کا بہانا اور میری ہتک حرمت کرنا جائز ہے؟ کیا میں تمہارے نبی کا نواسا نہیں ہوں اور ان کے دھی، ان کے چچا زاد بھائی اور ان پر سب سے پہلے ایمان لانے والے اور ان کی تصدیق کرنے والے کا فرزند؟ کیا حمزہؑ سید الشہداء میرے باپ کے چچا اور جعفر طیار خود میرے ہی چچا نہیں تھے؟ کیا یہ حدیث جو ذوالنہد خلعت ہے تمہارے گوش زد نہیں ہوئی کہ حضرت رسول خداؐ نے میرے اور میرے بھائی کے بارے میں فرمایا تھا کہ یہ دونوں جو انما اہل جنت کے سردار ہیں؛ اگر تم میری بات کو سچ سمجھتے ہو اور حقیقتاً وہ سچ ہی ہے، اس لیے کہ کبھی میں نے غلط بات نہیں کہی، پھر تو کوئی بات نہیں اور اگر تم میری بات کو غلط سمجھو تو اسلامی دنیا میں ابھی ہیں ایسے اشخاص جن سے اگر تم پوچھو تو وہ بتا دیں گے۔ پوچھو لو جابر بن عبد اللہ انصاری سے، ابو سعید خدری سے، سہل بن سعد ساعدی سے، زید بن ارقم سے، انس بن مالک سے۔ وہ تمہیں بتائیں گے کہ انھوں نے رسالتؐ سے اپنے کانوں سے اس حدیث کو سنا ہے۔ پھر کیا یہ تمہیں میری خونریزی سے روکنے کے لیے کافی نہیں ہے۔ یہ اس موقع پر بشر آپ کا کلام قطع کرتے ہوئے بول اٹھا کہ ”میں اللہ کی عبادت ایک حرف پر کرتا ہوں۔ اگر میری سمجھ میں آتا ہو کہ تم کیا کہہ رہے ہو“ (قرآن میں منافقین کا نسبت آیا ہے ومن الناس من یعبد الله علی حرف لئلا اس کا مقصود

لایا۔ حسینؑ کے خلاف تنویر اٹھانے والوں کے عمل میں اگر کہیں سے اس طرح کی گنجائش ہوتی تو سادہ لوح افراد یا ہوا خواہان بنی امیہ اس سے فائدہ اٹھانے سے چمکتے تھوڑے ہی اور اس سے مقدم اور مفاد دینی کو سخت نقصان پہنچ جاتا۔ اس نے تحفظ کے لیے امام حسینؑ نے وہ سب کچھ کیا جسے ”اتمام حجت“ کے نام سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ جس کے بعد دشمن کے ”اصرارِ گناہ“ یا باطل پر ضد کی حیثیت اتنی نمایاں ہو گئی کہ کسی تاویل یا حمایت کا موقع باقی نہ رہا۔

تاریخی بیانات سے ظاہر ہوتا ہے کہ صبح عاشور دونوں طرف کی صفت بندی ہو چکنے کے بعد کافی وقت تک آغاز جنگ نہیں ہوا۔ اس کا سبب یہ معلوم ہوتا ہے کہ دشمن اس کا موقع نہ چاہتا رہا تھا کہ کسی صورت سے حسینؑ کی جماعت کی طرف سے کوئی ایسا اقدام ہو جو بنائے جنگ بن سکے اور امام حسینؑ کا نشانہ یہ تھا کہ میری طرف سے آغاز جنگ ہونے نہ پہلے بلکہ اس کے بعد ان آپ نے دشمن کو راہِ راست پر لانے کی پُر اس کوشش کر کے چاہا کہ اتنا حجت فرمائیں ان لیے آپ نے ناقہ طلب فرمایا اور اس پر سوار ہوئے۔ قرآن اپنے سامنے رکھا۔

پھر صفوف دشمن کے قریب آکر بلند آواز سے ارشاد فرمایا۔ ”اے گروہ مردم میری بات سنو جلدی سے کام نہ لو۔ یہاں تک کہ مجھ پر جو تمہارا حق ہے اس کے ماتحت تم کو نصیحت و ہدایت کا فرض ادا کر دوں اور تمہارے سامنے یہ حقیقت حال بیان کر دوں کہ میں تمہاری جانب کیوں آیا؛ اگر تم نے میرے بیان کو صحیح سمجھتے ہوئے تسلیم کر لیا اور میرے ساتھ انصاف سے کام لیا تو یہ تمہاری خوش قسمتی ہوگی اور تمہیں معلوم ہوگا کہ تمہیں میری مخالفت کی کوئی وجہ ہو ہی نہیں سکتی اور اگر تم نے میرے بیان کو قبول نہ کیا اور انصاف سے کام نہ لیا تو شوق سے مجتمع کر لو اپنی طاقتوں کو اور اکٹھا کر جو جس کو چاہو اپنے ہم خیالوں میں سے اور کوئی کوشش اٹھا نہ رکھو، پھر پوری طاقت سے بغیر ایک دم کی بھی ہمت دیے ہوئے میرا خاتمہ کر دو۔ میرے لیے وہ پروردگار کافی ہے۔ جس نے قرآن کو نازل کیا اور وہی اپنے نیک اعمال بندوں کا مددگار رہے۔“ امام حسینؑ کی آواز خیمہ میں پہنچا

تھا کہ میں مسلمان نہیں، منافق ہوں اگر کچھ سمجھتا ہوں کہ آپ کیا کہہ رہے ہیں) اصحاب خاموش کھڑے ہوئے امام کی تقریر سن رہے تھے انھیں شمر کی یہ بدترینی اور حضرت کے خطبہ میں مداخلت سخت ناگوار ہوئی۔ حبیب بن مظاہر نے پکار کر جواب دیا۔ ”بخدا میں جانتا ہوں کہ تو خدا کی عبادت ستر حرفوں پر کرتا ہے (یعنی انتہائی مکار اور عبادت کے معاملہ میں فریبی ہے) اور میں گواہی اس کی بھی دیتا ہوں کہ تو سچ کہتا ہے تیری کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ حضرت کیا کہہ رہے ہیں۔ خدا نے تیرے دل پر مہر لگا دی ہے“ امام نے پھر سلسلہ تقریر جاری فرمایا۔ اگر تھیں اس حدیث کی صحت میں پھر بھی شک ہے تو کیا اس میں بھی شک ہے کہ میں تمھارے رسول کا نواسا ہوں۔ خدا کی قسم مشرق و مغرب کے عالم میں کوئی بھی نبی کا نواسا میرے سوا موجود نہیں ہے نہ تم میں اور نہ تمھارے سوا دوسرے اقوام میں اور میں تو خود تمھارے ہی نبی کا نواسا ہوں۔ ذرا بتاؤ تو سہی کہ میرے قتل پر تم کس لیے آمادہ ہوئے ہو؟ کیا کسی اپنے مقتول کا قصاں لینا چاہتے ہو جسے میں نے قتل کر دیا ہو؟ یا کسی اپنے مال کا مطالبہ رکھتے ہو جسے میں نے تلف کیا ہو؟ یا کسی زخم کا بدلہ چاہتے ہو جو میرے ہاتھ سے کسی کو لگا ہو؟ ایک خاموشی سی چھائی رہی اور ان میں سے کسی سے کچھ جواب دیتے نہ بن پڑا۔ دیکھیے تو کہ ایک انسان ایک طرف ادب و اہل زبانیں دوسری طرف۔ بے شک حق میں ایسی طاقت ہونا چاہیے اور ایک انسان اپنی سچائی اور حسن عمل پر اتنا اعتماد رکھتا ہو۔ حسین اس وقت جبکہ اپنا کوئی گواہ نہ تھا اور مجمع دشمن تھا مجمع سے اپنی بے جرمی کا اقرار لے رہے تھے۔ تمام لشکر کو دعوت دی جا رہی تھی کہ کوئی شخص کسی جرم کا پتہ دے دے۔ ہوتا کوئی جرم کسی کی نگاہ میں تو اس تیس ہزار کے مجمع میں کوئی زبان کھولتا کیا دنیا کی کوئی مادی طاقت زبانوں کو روکنے والی تھی؟ مگر معلوم ہوتا ہے کہ سچائی کی طاقت تھی جو دہنوں پر قفل اور زبانوں پر گرہ لگائے ہوئے تھی جس کا نتیجہ یہ تھا کہ ایک یکہ و تنہا انسان ہزاروں آدمیوں کو مخاطب کر رہا تھا اور کسی کو اسکے خلاف زبان کشائی کی جرأت نہ تھی۔

چلا جانے دو کسی ایسی جگہ جہاں میں امن و امان کی زندگی گزار سکوں۔“

فتیس بن اشعث نے دھم کی بہن جعدہ بنت اشعث نے حکومت شام کے ساتھ سازش میں شریک ہو کر امام حسنؑ کو زہر دیا تھا اور جس کا بھائی محمد بن اشعث حضرت مسلم کے قتل کا ذریعہ تھا پکار کر کہا۔ ”آپ یزید کی بیعت کیوں نہیں کر لیتے؟“ حضرت نے فرمایا۔ ”تم ایسا کیوں نہ کہو گے؟“ تم محمد بن اشعث ہی کے تو بھائی ہو۔ کیا تم اتنے کو کافی نہیں سمجھتے کہ مسلم بن عقیل کے خون کی ذمہ داری تم پر ہے۔ خدا کی قسم میں ذلت کے ساتھ اپنا ہاتھ تمہارے ہاتھ میں نہ دوں گا۔ اور نہ غلاموں کی طرح خطرے اپنی جان بچا کر بھاگوں گا۔“

فوج مخالفت کے متاثر ہونے کی پہلے ہی سے امید نہ تھی۔ اپنا فرض پورا کرنا تھا وہ پورا ہو گیا۔ حضرت نے ناقہ کو بٹھا دیا۔ اتر پڑے اور عقبہ بن سمان کو حکم دیا کہ اسے باندھ دیں۔ چونکہ اصحاب حسینؑ آپ کے مقصد سے واقفیت حاصل کر چکے تھے اس لیے وہ بھاگنا نہ سہلک حسینؑ ہی کو پیش نظر رکھنے کی کوشش کرتے تھے اور افواج یزید کی اکثریت عوام اہل کوفہ کے متاثر افراد کی تقریروں کا ان پر کافی اثر ہو سکتا تھا۔ پھر ان میں بھی جلیب بن مظاہر دیر جو ہمیشہ سے شیعہ علیؑ ہونے کی حیثیت سے مشہور تھے اور حضرت کو کوفہ کی جانب دعوت دینے والوں میں سے تھے۔ ہوا تو امان بنی امیہ کے لیے ان کی تقریر ایسی ٹوٹ رہی ہو سکتی تھی جیسی زہیر بن قین کی جو کہ ابھی قریبی زمانہ تک ”عثمانی“ گروہ میں شمار ہوتے تھے اور اب مکہ اور کربلا کے راستے ہی میں امام کے پاس آ کر شریک ہوئے تھے اس لیے فوج مخالف کے سامنے سب سے زیادہ تقریریں انھوں نے کی ہیں جن کا ظاہری حیثیت سے اس وقت کوئی نتیجہ مرتب ہوا ہو یا نہیں۔ لیکن یہی نتیجہ کیا کم ہے کہ افواج مخالفت پر ہر ممکن ذریعہ اتمام حجت ہو گیا۔ چنانچہ امام حسینؑ کے مذکورہ بالا خطبہ کے بعد زہیر بن قین گھوڑے سوار اسے پاؤں تک لوہے میں غرق صفت سے باہر نکلے۔ پکار کر کہا۔ ”کوفہ لڑنا“

لے عذاب سے ڈرو۔ ایک مسلمان کی گردن پر اس کے اسلامی بھائی کا یہ حق ہے کہ وہ اسے خیر خواہان نصیحت کرے اور ہم آپس میں بھائی بھائی اس وقت تک ہیں اور ایک ہی ملت کے تابع کی حیثیت رکھتے ہیں۔ جب تک کہ ہمارے تمہارے درمیان تلوار چلنے نہیں لگی ہے۔ یعنی جب تک باقاعدہ جنگ شروع نہیں ہو جاتی ہم میں اور تم میں رشتہ اخوت قائم ہے اور تم ابھی ہماری طرف سے نصیحت کے مستحق ہو۔ بے شک جب تلوار چلنے لگے گی تو یہ رشتہ خود بخود ٹوٹ جائے گا اور ہم علیحدہ علیحدہ ملتوں کے تابع قرار پا جائیں گے۔ یقیناً اللہ نے ہماری اور تمہاری آزمائش کی ہے۔ اپنے نبی محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اولاد کے ذریعہ سے تاکہ وہ دیکھے کہ ہم ان کے ساتھ کیا کرتے ہیں اور تم کیا سلوک کرتے ہو۔ ہم تم سب کو دعوت دیتے ہیں کہ ان کی مدد کرو اور عبید اللہ بن زیاد کا ساتھ چھوڑ دو۔ یزید اور ابن زیاد سے تم کو ان کی حکومت کے تمام دور میں کبھی سوا برائی کے کوئی اچھا سلوک نظر نہ آئے گا۔ وہ تمہاری آنکھوں میں سلائیاں بھر دواتے۔ تمہارے ہاتھ پاؤں قطع کر لیتے۔ تم کو سولیاں دلاتے اور تمہارے نیک اعمال حفاظت قرآن مثلاً تجربن عدی اور ان کے ہمراہیوں اور آہنی بن عروہ وغیرہ کے ایسے اشخاص کو قتل کرتے رہے ہیں۔“

مضمون کے لحاظ سے امام حسینؑ کے خطبہ اور زہیر بن قین کی تقریر میں بہت نمایاں فرق ہے۔ اس کا انداز خاص طور پر انفرادی حیثیت سے حقیقت حال کو واضح کرنے اور اپنی شخصیت کے تعارف پر مبنی معلوم ہوتا ہے۔ اور اس میں موجود حکومت کے متعلق ایک سیاسی تبصرہ ہے جس میں یزید سے زیادہ ابن زیاد کی حکومت کے کردار پر تبصرہ کیا گیا۔ اس مصلحت سے کہ مخاطب کوفہ کے باشندے تھے اور ان کو براہ راست ابن زیاد کے مظالم سے سابلغہ پڑ رہا تھا۔ غالباً یہی وجہ تھی کہ زہیر بن قین کو اپنی تقریر کے سلسلے میں سخت مزاحمت سے دوچار ہونا پڑا۔ اس طرح کہ ابن زیاد کے ہوا خواہوں اور خوشامدوں نے خود زہیر کی مذمت اور ابن زیاد کی مدح شروع کر دی اور کہا ہم اس وقت تک دم نہ لیں گے جب تک تمہارے سردار اور ان کے ساتھیوں کو قتل نہ کر لیں یا

امام حسینؑ کو کربلا میں پہنچا کر ابن زیاد کو مطلع کر چکا اس وقت سے برابر خاموشی کے عالم میں مگر بے حسینی کے ساتھ حالات کا بغور مشاہدہ کر رہا تھا۔

اس کے قبل اس نے راستے ہی میں اس طرح کی سلسلہ جنبانی کرنا چاہی تھی کہ کسی طرح امام حسینؑ اور یزید یا ابن زیاد کے درمیان کچھ خفا و کتابت ہو اور معاملات رو بہ اصلاح ہو جائیں۔ اس کے بعد میدان کربلا میں پہنچنے کے بعد بھی اسے یہ توقع تھی کہ بیچ میں کوئی ایسا مشترک نقطہ پیدا ہو جائے گا جہاں امام اور ان کے مخالف جمع ہو جائیں اور جنگ کی صورت پیش نہ آئے۔ اسے کو ذہن سے متواتر فوجیں آنے سے انتشار ضرور پیدا ہوتا ہوگا مگر عمر بن سعد کا طرز عمل اس کے لیے امید افزا تھا جو خود صلح کی گفتگوئیں کر رہا تھا اور یہ چاہتا تھا کہ کسی طرح جنگ نہ ہو۔ ایسا بھی وقت آیا جب سلسلہ گفتگو ایسے نقطہ پر پہنچی جہاں عمر سعد تک نے یہ طے کر لیا کہ اب معاملہ کیسے ہو گیا اور مقابلہ کی ضرورت باقی نہیں رہی۔ پھر ایسی صورت میں حُر کو یہ سمجھنے کی کیا وجہ تھی کہ جنگ ضرور ہوگی۔ وہ دیکھ رہا تھا کہ امام کا طرز عمل روادارانہ ہے۔ آپ اپنی جانب سے معقول شرائط پیش کر رہے ہیں جن پر صلح نہ ہونے کی کوئی وجہ نہیں۔ یہ توقعات تھے جو اس کے دل و دماغ پر نویں محرم کی سہ پہر تک چھائے رہے ہوئے مگر محرم کی شام کو یہ سب امیدیں منقطع ہو گئیں۔ ابن زیاد کے اس خط سے جو سترہن ذی الحجہ کے یکے ہاتھ عمر سعد کے پاس پہنچا جس کے بعد عمر سعد مجبور تھا کہ وہ اسی وقت حسینی جماعت پر حملہ آور ہو اور بدقت تمام حسینؑ اور اصحاب حسینؑ کو صرف ایک شب کی مہلت عبادتِ خدا کے لیے دینا منظور کرے۔ یقیناً یہ وہ وقت تھا کہ جب حقیقتاً حُر کے سامنے امام حسینؑ سے کھل کر جنگ کرنے اور آپ کے قتلِ ناحق میں شرکت کرنے کا سوال صریح طور پر پیدا ہو گیا اور اس کو یہ نظر آنے لگا تھا کہ میں نے اس سے پہلے حسینؑ کے خلاف جتنے بھی اقدامات کیے تھے وہ اس حلقہ مقدس مستی کو فنا کی منزل سے قریب کرنے کے سامان تھے۔ اس کی ذمہ داری مجھ پر ہے اور اس کے بعد پھر اب کیا مجھ کو اس سے بڑے اقدامات میں شرکت کرنا چاہیے؟ کیا میں حسینؑ کے خون میں اپنے ہاتھوں کو رنگیں کر سکتا ہوں؟ اس کا ضمیر سختی سے انکار کرتا تھا کہ ہرگز نہیں۔

گرفتار کر کے ان کو ابن زیاد کے پاس نہ لے جائیں۔ زہیر اس کے بعد بھی خاموش نہ ہوئے اور ان کو ہدایت کرتے رہے۔ یہاں تک کہ سترہن تیر لگایا اور کہا ”بس خاموش۔ خدا تیری زبان کو چپ کرے“ مگر زہیر نے تیر کی بھی کوئی پروا نہیں کی اور وہ سترہن سے مصروفِ کلام ہو گئے۔ سترہن کے اس کہنے پر کہ ”دیکھو تھوڑی دیر میں تم اور تمہارے سردار سب قتل ہو چاہتے ہیں“ زہیر نے بڑی جگر داری اور قوتِ ایمانی کے ساتھ جواب دیا ”تو مجھے موت سے خوف دلاتا ہے؟ خدا کی قسم ان کے ساتھ مرنا مجھے تم لوگوں کے ساتھ زندگی جہاں حاصل کرنے سے زیادہ محبوب ہے۔ ان کے بعد پھر وہ لشکرِ مخالفت کی طرف مخاطب ہوئے اور کہا ”اے اللہ کے بندو! ایسے بندگانِ زر کے کہنے میں نہ آؤ۔ خدا کی قسم پیغمبرِ خدا کی شفاعت ان لوگوں کو کبھی نصیب نہیں ہو سکتی جنہوں نے پیغمبرِ خداؐ کی اولاد کا خون بہایا ہو اور ان کے مددگاروں کو قتل کیا ہو“ امام حسینؑ نے یہ دیکھ کر باتوں کا جواب تیر سے دیا جاریہ ہے اور انہماکِ محبت کا فرض ادا ہو چکا ہے کسی سے پکار کر کہہ دیا کہ زہیر! پس چلے آؤ، اگر میں آلِ فرعون نے اپنی قوم کو نصیحت کر کے اپنے فرض کو ادا کر دیا تھا تو یقیناً تم بھی اپنا فرض پورا کر چکے اور نصیحت کا حق ادا کر دیا۔ مگر نصیحت و تبلیغ کا کوئی نایاب بھی تو ہو، اس آواز کو سن کر زہیر واپس چلے آئے۔

ان مصلحانہ رجحانات، ان حقیقت ریز بیانات اور بصیرت افروز نصائح و انظارات کا کوئی اثر ہو رہا تھا یا نہیں۔ یہ امر بالکل تاریخی میں تھا، جب تک کہ حُر کے باطن نے پردہ الٹ کر اپنے کو ظاہر نہیں کیا۔ ہماری کتاب کے ناظرین کے لیے یہ نام کوئی اجنبی حیثیت نہیں رکھتا۔ یہی حُر وہ تھا جس نے ایک ہزار فوج کی جمعیت کے ساتھ آکر کوفہ کے راستے میں امام حسینؑ کو روکا تھا جو آپ کو گھیر کر کربلا لایا تھا اور جس نے ابن زیاد کا خط آنے کے بعد اتنی سختی برتی تھی کہ خیام حسینی کو دیا گئے کنارے پر پانہ ہوتے دیا تھا۔ اس کے بعد محرم کی دوسری تاریخ سے دسویں تک اس کی کیا حالت رہی تھی اس کا بعد کی صورتِ حال اور خود حُر کے اقوال سے پتہ چلتا ہے کہ جس وقت سے وہ

مجھ سے یہ نہیں ہو سکتا۔ اسے اب سب کچھ یاد آتا ہوگا کہ حسینؑ وہ تھے جنہوں نے اس سخت موقع پر مجھے اور میری تمام فوج کو پانی سے سیراب کیا تھا۔ اب ان پر افران کے ننھے ننھے بچوں تک پر پانی بند ہے اور یہ بڑی حد تک میری ہی وجہ سے، اس لیے کہ میں نے ہی انہیں اس لیے آب دیکھا وہ مقام پر اترنے کے لیے مجبور کیا۔ یہ سوچ کر اس کے قلب میں خود اپنی ہستی سے انتقام لینے کا جذبہ پیدا ہوتا ہوگا یا کم از کم اس کی کسی صورت سے تلافی کی صورتوں پر غور کرتے ہوئے وہ خیال کرتا ہوگا کہ اگر میں حسینؑ کے پاس جا کر اپنی اس خطا کو معاف کر سکیں تو خواست کروں تو کیا اتنا بڑا عزم دنیا میں معافی کے قابل بھی ہے؟ پھر اگر حسینؑ نے میری خطا کو معاف نہ کیا تو میں کہاں کا رہا؟ نہ دنیا میں نہ آخرت۔ پھر بھی اس کا ضمیر کہتا ہوگا کہ چل کر معافی مانگنا تو چاہیئے اپنا امکانی فرض تو بہر حال انجام دینا ضروری ہے۔ پھر میں جب اپنی جان ان کے قدموں پر ڈال دوں گا تو وہ کریم النفس ہیں ضرور معاف کر دیں گے۔ قرآن کی بنا پر یقین کیا جاسکتا ہے کہ یہ خیالات تھے جو اس کے دماغ میں ایک نلاطم برپا کیے ہوئے تھے اور وہ شب عاشور ہی تھی جس کی باریاں کے بے پناہ سمندر میں اس کے خیالات کی کشتی پھٹیڑے کھا رہی تھی۔

ہوتا رہتا ہوا جنگل اور رات کا سناٹا! صفحہ تاریخ بھی سسنا ہے، کون مورخ ہے جو اس معرکہ کی داستان قلم بند کرے جو حوڑ کے دل و دماغ میں برپا تھا۔ بے شک سچا شاعر اگر حقیقت کی ترجمانی کرتا ہے۔ میراثیں علیہ الرحمۃ اور ان کے خاندان کے دوسرے باکمال مرثیہ گوئیوں نے جس طرح اس رات کو حوڑ کی حالت کی خیالی تصویر کشی کی ہے۔ وہ یقیناً ایک ایسا بیان حال ہے جس کی روایت خاموش فطرت کے واسطے سے شاعر کے دل تک پہنچی ہے اور واقعات کے قرآن الکی تصدیق کرتے ہیں۔

بہر طور رات کسی طرح گزری اور صبح ہوئی۔ حوڑ کو پھر بھی یہ دیکھنا ہے کہ اب کیا ہوتا ہے کیا واقعی جنگ ہی ہوگی یا کوئی اور صورت رونما ہوگی۔ اس نے انتہائی صبر و ضبط کے ساتھ دیکھا کہ افواج کی ترتیب ہوئی۔ اسے یہ بھی معلوم ہوا کہ وہ ایک حصہ فوج کا افسر قرار دیا گیا

ابنا جماعت حسینی کی طرف بڑھنا شروع کیا۔ نفسیاتی حیثیت سے قیاس کیا جاسکتا ہے کہ اس وقت اس کا دل دھڑک رہا ہوگا۔ اس کے سینہ میں طوفان برپا ہوگا اور یقیناً وہ محسوس کر رہا ہوگا کہ اب میں کیس اور ہوں۔ اس پر اس وقت ایک خود فراموشی اور مدہوشی کا عالم طاری ہوگا۔ اس وقت کسی کا ٹوک دینا! معاذ اللہ۔

تہا جبرن اوس اس کے قبیلہ کا ایک شخص کہنے لگا۔ کیوں تڑا کیا ارادہ ہے؟ کیا حمد کرنا چاہتے ہو؟ تڑا اس کا کیا جواب دیتا؟ اس نے پھر بھی سکوت کر کے پردہ داری کی کوشش کی۔ کچھ جواب نہیں دیا، مگر جسم میں لرزہ سا پیدا ہو گیا۔ تہا جبرن نے کہا ”تڑا تمہاری یہ کیا حالت ہے؟ میں نے تمہاری یہ کیفیت کبھی نہیں دیکھی۔ مجھ سے پوچھا جاتا کہ کوئی سب سے زیادہ بہادر کون ہے تو میں تمہارے سوا کسی کا نام نہ لیتا۔ مگر اس وقت میں تمہاری عجیب حالت دیکھ رہا ہوں۔ آخر اس کا سبب کیا ہے؟“ یہ سن کر تڑا نے مزید راز داری کی کوشش کو بے سود سمجھا۔ کہا ”بڑے سامنے اس وقت بہشت و دوزخ کا سوال ہے۔ میں تو بہشت پر کسی چیز کو مقدم نہ سمجھوں گا۔ ہاں میرے ٹکڑے ٹکڑے کر دیے جائیں اور مجھے آگ میں جلا دیا جائے۔“ یہ کہتے کہتے اس نے ٹکڑے کو چابک لگایا اور اصحاب حسینی کی طرف پہنچ گیا۔

اس موقع پر شاید تڑا کو اندیشہ ہو کہ اس کے اس طرح بے تحاشا گھوڑا اڑائے ہوئے آنے سے کس انصارِ امام کو پریشانی نہ پیدا ہو اور اس کی مزاحمت نہ کی جائے اس لیے اس نے ان کے قریب پہنچتے ہی اپنی سپر کوپٹ کر ہاتھ میں لے لیا۔ یہ طرزِ عمل عرب کے دستور کے مطابق تھا۔ آئیے کہ جب کسی کو حمد کرنا مقصود ہو تو اس کے ایک ہاتھ میں کھنچی ہوئی تلوار اور دوسرے ہاتھ میں حفاظت کے لیے سپر ہوتی تھی لیکن اگر کوئی تلوارِ نیام میں رکھے اور پٹی ہوئی سپر کو ہاتھ لیے آتا دکھائی دے تو یہ سمجھا جاتا تھا کہ وہ امان کا طالب ہے یا کچھ پیغام لے کر آ رہا ہے۔ اس طرح اصحاب حسینی پر واضح کر دیا کہ وہ جنگ کا ارادہ نہیں رکھتا ہے۔ چنانچہ

حسین سے کم کسی بات پر رضامند نہیں۔ اس کے بعد تڑا کچھ گفتگو کرنا بیکار سمجھا اور اب یہ وقت آ گیا تھا کہ وہ اپنے اس فیصلہ کو جو بہت مشکل سے اس کے دل و دماغ کے انتہائی کشکش کے نتیجے میں ملے پاسکا تھا عملی لباس پہنائے۔

تڑا کو یہ اندیشہ قطعی تھا کہ اگر فوج سے نکلنے کے پہلے یہ ظاہر ہو گیا کہ میری نیت کچھ اور ہے تو مجھے فوراً گرفتار کر لیا جائے گا اور میں اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہو سکوں گا۔ اس لیے ظاہر ہے کہ وہ اس وقت بہت احتیاط سے کام لے رہا ہوگا۔ اس کے قبیلہ کا ایک شخص قرہ بن قیس اس وقت اس کے نزدیک تھا۔ غالباً یہ وہی شخص ہے جو عمر بن سعد کا پیغام لے کر امام کی خدمت میں گیا تھا اور حبیب بن مظاہر کے نصیحت کرنے پر اس نے کہا تھا کہ میں جو پیغام لایا ہوں جا کر اس کا جواب دے دوں تو پھر غور کروں گا کہ خود مجھے کس کا ساتھ دینا چاہیے۔ تڑا کو اس کا اپنے پاس رہنا ناگوار ہو رہا تھا، وہ چاہتا تھا کہ یہ کسی طرح میرے پاس سے ہٹ جائے مگر کچھ بتانا تھا۔ آخر اس نے پوچھا ”قرہ! تم نے آج اپنے گھوڑے کو پانی نہیں پلایا؟“ اس نے کہا ”نہیں ابھی نہیں۔“ کہا، ”پھر پلاؤ گے نہیں؟“ انسان کا چہرہ، اس کی بات چیت، اس کے چہرہ کا رنگ سب ہی اس کے خلاف جاسوسی کرتے ہیں۔ تڑا لاکھ چھپائے مگر دل کا اضطراب چھپنے کی چیز نہیں۔ قرہ کچھ دیکھا ہوتا تو سمجھ لیا کہ یہ مجھے اپنے پاس سے ٹاننا چاہتے ہیں۔ بعد میں اس کا بیان تھا کہ اگر تڑا مجھ سے بتلا دیتے کہ میں امام حسینی کی طرف جا رہا ہوں تو میں بھی یقیناً ان کے ساتھ بولیتا اور نکل جاتا۔ مگر یہ کہنے کی باتیں ہیں اور خواہ مخواہ کے عذر ہیں جو احساسِ گناہ پر وقت نکلنے کے بعد پیش کیے جاتے ہیں۔ اگر ایسی اخلاقی جرأت اس میں موجود ہوتی تو تڑا کے بے کلمے چلے جانے پر بھی قرہ کے لیے راستہ نہیں بند ہو گیا تھا۔ وہ جانا چاہتا تو چلا جاتا۔ بہر حال یہ محسوس ہوتے ہوئے کہ تڑا کو میرا اپنے پاس رہنا ناگوار ہے اس نے اس کے پاس سے ہٹ جانے کی مناسب سمجھا۔ تڑا نے اپنے خیال کے مطابق اس کو ہٹا کر ایک رکاوٹ کو اپنے راستے سے دور کر دیا اور آہستہ آہستہ گھوڑا

بلاروک لوگ وہ سیدھا امام کے سامنے آیا اور کہنے لگا، "فرزند رسول! میری جان آپ پر فدا، میں وہی گنگا رہوں جس نے آپ کو واپس جانے سے روکا۔ راستے میں آپ کے ساتھ ساتھ رہا اور آپ کو اس جگہ ٹھہرنے پر مجبور کیا۔ قسم ہے اس خدا کی جس کے سوا کوئی معبود برحق نہیں کہ مجھے یہ گمان ہرگز نہیں تھا کہ یہ لوگ آپ کے تمام شرائط کو جو آپ پیش کریں گے مسترد کریں گے اور نوبت یہاں تک پہنچے گی۔ میں نے اپنے دل میں خیال کیا تھا کہ کیا حرج ہے، میں کسی خدا کو لوگوں کا ساتھ دوں اور معلوم نہ ہو کہ میں ان کی اطاعت سے باہر ہوں۔ پھر یہ لوگ ان شرائط کو تو قبول ہی کر لیں گے جو امام ان کے سامنے پیش کریں گے۔ بخدا اگر مجھے یہ علم ہوتا کہ یہ لوگ ان شرائط کو آپ کے منظور نہیں کریں گے تو میں کبھی آپ کے ساتھ یہ طرز عمل اختیار نہ کرتا۔ اچھا اب میں حاضر ہوا ہوں انتہائی شرمساری کے ساتھ توبہ کرتا ہوں اپنے گناہ سے خدا کی بارگاہ میں اس غرض سے کہ جان و دل سے آپ کا شریک مصیبت ہوں۔ یہاں تک کہ آپ کے قدموں پر تار ہو جاؤں۔ کیا اس طرح میری توبہ قبول ہو سکتی ہے؟" حضرت نے بلا توقف فرمایا۔ "ہاں ہاں! خدا تمہاری توبہ قبول کرے گا اور تمہیں بخش دے گا۔ مبارک ہو۔ واقعی تم حُر (آزاد منس) ہو۔ ویسے ہی جیسا تمہاری ماں نے نام رکھا ہے۔ تم آزاد ہو انشاء اللہ دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی۔ گھوڑے سے تو اُترو۔ حُر نے کہا۔ "میرا آپ کی نصرت میں گھوڑے پر سوار رہنا نیچے اترنے سے بہتر ہے۔ چاہتا ہوں تھوڑی دیر ان سے جنگ کر لوں، پھر تو (مر کر) گھوڑے سے نیچے اترنا ہی ہے۔" امام نے یہ دیکھ کر حُر کو جہاد کا دلولہ ہے۔ فرمایا۔ "اچھا جو تمہاری خوشی ہو وہ کرو۔ خدا اپنی رحمت تمہارے شامل حال رکھے۔" وہ ضابط بہت کر چکا تھا۔ امام سے خطا معاف کر کے اس کا دل بڑھ چکا تھا اب اسے حق محسوس ہوتا تھا کہ وہ افواج یزید کے سامنے جا کر ان کو بھی حق کہے راستے پر آجانے کی دعوت دے۔ چنانچہ وہ فوراً میدان میں آگیا۔ پہلے تو اس نے "لا اثم الذلیم" میں صفوت اہل کوفہ سے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ "بھائیو! آخر حسین کی ان باتوں میں سے

جو کوہ پیش کرتے ہیں کسی ایک بات کو تم کیوں نہیں منظور کر لیتے تاکہ تمہیں ان کے مقابلہ میں جنگ کرنے سے نجات ملے۔" لشکریوں نے کہا کہ امیر عمر سعد موجود ہیں جو کچھ تمہیں کہنا ہے ان سے کہو۔

تو نے عمر سعد سے مخاطب ہو کر پھر یہی الفاظ کہے اور ویسا ہی جواب ملا جو اس کے قبل مل چکا تھا کہ اگر مجھ سے ممکن ہوتا تو میں ضرور ایسا کرتا۔ یہ سن کر حُر کو غصہ آگیا، اتنے تلخ الفاظ میں جس کا اسے خود اسی فوج کے ایک نمایاں افسر ہونے کی بنا پر پورے طور سے حق حاصل تھا۔ اس نے کہا۔ "اے کوہ والو خدا تمہیں غارت کرے۔ تم نے اس بزدل کو روکا بلایا اور جب وہ آیا تو تم نے اسے دشمن کے سپرد کر دیا۔ تم نے خیال ظاہر کیا تھا کہ تم ان پر جہان نثار کر دو گے۔ پھر تم نے خود ان پر چڑھائی کر دی اور ان کے قتل پر آمادہ ہو گئے۔ تم نے ان کے نفس کی آمد و شد کو مسدود کر رکھا ہے اور گلا گھونٹنے پر آمادہ ہو اور چاروں طرف سے انہیں گھیر رکھا ہے۔ تم نے ان کو خدا کی چوڑی چمکی زمین میں خود مردہ امن کا راستہ پائیں اُدھر جانے سے روک دیا ہے۔ اور وہ تمہارے ہاتھ میں قیدی کے مثل ہو گئے ہیں اور بے بس کر دیے گئے ہیں اور تم نے ان کو، ان کے اہل حرم اور بچوں کو اور ان کے اصحاب کو قزاق کے اس بھتے ہوئے پانی سے روک دیا ہے جس کو یہودی مجوسی اور نصرانی تک پیتے ہیں اور عراق کے سوئے اور کتے تک اس میں لوٹتے ہیں مگر یہ لوگ ہیں کہ بایں کی شدت نے ان کو جاں بلب کر رکھا ہے۔ حقیقتاً کیا بُرا وہ سلوک ہے جو تم نے محمد مصطفیٰؐ کے بعد ان کی اولاد کے ساتھ جائز رکھا ہے۔ تم کو خدا اس شدت والی پیاس کے دن میرا ب ذکر ہے اگر تم آج ابھی اسی دم توبہ نہ کرو اور اپنے طرز عمل سے لپٹنا ہو کر باز نہ آ جاؤ۔"

حُر کی تقریر دشمن کے مفاد کے خلاف بہت خطرناک ثابت ہو سکتی تھی۔ اس لیے تیر اندازوں کو کم دیا گیا اور انہوں نے کچھ تیر چلائے۔ یہ دیکھ کر حُر نے تقریر موقوف کر دی اور چونکہ جنگ باقاعدہ شروع نہ ہوئی تھی وہ واپس آ کر امام کے سامنے کھڑے ہو گئے۔

جیسا کہ مشب عاشور کی حمت پر بحث کے سلسلہ میں کہا جا چکا ہے یہ امام حسین کی ایک

جودن تیر روانہ ہو گئے۔

نہیں سمجھا جاسکتا کہ حضرت امام حسینؑ کے ساتھ والی قلیل جماعت اس اچانک حملہ کا مقابلہ کرنے کے لیے کسی طریقہ پر تیار ہو سکتی تھی مگر انھیں تیاری کی ضرورت ہی کیا تھی۔ ان کے تھے ہوئے نئے تیروں کے استقبال کے لیے موجود اور ان کے دل وجگر، شوقی شہادت میں ناکوں کو باغیوں ہاتھ لینے پر آمادہ تھے۔

یزیدی لشکر والوں کو اندازہ تھا اور خوب اندازہ کہ اگر حسینی جماعت سے وہ کتنی ہی مخفی رہیں نہ ہی دست بدست مقابلہ کیا گیا تو کربلا کی جنگ صرف عاشور کے دن ختم نہیں ہو سکے گی ورنہ اس کو بھی اچھی طرح سمجھتے تھے کہ جنگ کا طول کھینچنا ان کے لیے انتہائی اندیشہ کا باعث ہے۔ اس لیے کہ امام کی مکہ سے روانگی کی اطلاع بصرہ میں ہو چکی ہے اور وہاں سے مدد پہنچنے کا موقع ہے۔ کوفہ کے بہت سے افراد جو ابھی تک نہیں پہنچ سکے ہیں۔ یقیناً موقع کے منتظر اور حضرت حسینؑ کے لیے بے چین ہوں گے نیز یہ بھی کہ ایران کچھ دور نہیں ہے اور وہاں کے بھی کچھ افراد کا امام حسینؑ کے ساتھ عقیدت رکھنا یقینی ہے۔ خصوصاً جبکہ ان کے ساتھ علی بن الحسینؑ بھی موجود ہیں جو ہنضیائی رشتہ سے مملکت ایران کے شہزادے کی حیثیت رکھتے ہیں۔ لہذا بہت امکان ہے کہ قومی تعصب ہی ایرانیوں کو حسینؑ کی حمایت پر آمادہ کر دے۔ یہ بھی خیال ہو سکتا تھا کہ آجادی سلسلے پہاڑ بھی بہت فاصلہ پر نہیں ہیں جہاں کا قبیلہ طے کافی اہمیت دلاتا ہے اور طراح بن عدی امام حسینؑ سے یہ وعدہ بھی کر چکے ہیں کہ اگر آپ اپنے اوہاں پہنچادیں تو آپ کی مدد کے لیے ہزاروں جوان قبیلہ طے کے بالکل تیار پائے جائیں گے۔ پھر خود طراح صحرائے کربلا کے قریب حضرت سے یہ کہہ کر رخصت ہوئے ہیں کہ میرا کچھ غلہ ہے اسے گھر پر رکھ آؤں تو آتا ہوں۔ ممکن ہے وہ آئیں تو اپنے ساتھ کچھ جوانان طے کو لیتے ہوئے آئیں۔ بہر حال اسباب کچھ بھی ہوں مگر بظاہر فوج یزید کو بہت جلدی تھی اور وہ چاہتی تھی کہ جلدی سے برہانہ ہو جائے مگر تیروں کا مارچ اسے جماعت صحنہ کو کوفہ خواہ افغان

بہت بڑی فتح تھی جو عین موقع جنگ پر خود آپ کی آنکھوں کے سامنے اور آپ کے دشمنوں کی نگاہوں کے سامنے ظاہر ہو گئی کیونکہ ہر شخص اندازہ کر سکتا ہے کہ جس قدر بہت بڑھانے اور دلا کر اپنی طرف جذب کرنے کے مادی اسباب ہو سکتے ہیں سب فوج یزید کی طرف تھے۔ کثرت تعداد، طاقت و قوت، یقین کامیابی، آسائش و راحت، آب و غذا کا اطمینان، پھر جائزہ و انعام اور بارگاہ حکومت میں تعزب کے توقعات اس کے برخلاف جتنے ہمت شکن اور جی چھڑانے والے اسباب ہو سکتے ہیں وہ سب اصحاب حسینؑ میں مجتمع تھے۔ قلت تعداد، بے کسی و بے بسی، یقین بددین اور دن کی بھوک پیاس اور حکومت کا حساب جس کا نتیجہ اپنے ہی لیے نہیں بلکہ اپنے بعد اپنے پسماندگان اور اولاد کے لیے بھی ہمت شکن اور طاقت رہا ہونے کے لیے کافی ہے۔ اس سب کے باوجود تاریخ یہ بتانے سے عاجز ہے کہ ان میں سے کوئی ایک معمولی سپاہی بلکہ سچ بھی الگ ہو کر فوج مخالفت سے جا کر ملا ہو۔ نہ حسینؑ کی زندگی میں اور نہ حسینؑ کے بعد۔ اس کے برخلاف فوج مخالفت کا کوئی معمولی شخص نہیں بلکہ ایک نمایاں افسر جنگ شروع ہونے سے قبل ہی ادھر سے ادھر کرا دھرا گیا۔ یہ وہ غیر معمولی فتح تھی جس نے فوج مخالفت کو دنگ کر دیا اور شاید فوج کا دنگ بے رنگ پاکر ہی سالار فوج نے مزید تاخیر کو خطرناک پایا۔

اب دھوپ کافی چڑھ چکی تھی اور دن کا اچھا خاصہ حصہ گزر گیا تھا۔ عمر سعد نے لشکر کو بڑھایا اور اپنے غلام ورنید کو جو علمبردار لشکر تھا آواز دی کہ جھنڈا اپنا میرے قریب لاؤ۔ رایت جنگ لینے اس کے پاس آکر کھڑا ہو گیا۔ عمر سعد نے تیرا پنا چلہ، کمان میں جوڑ کر فوج کی طرف رہا کیا اور لشکر یزید کو مخاطب کرتے ہوئے پکار کر کہا: ”گواہ رہنا کہ سب سے پہلے نے لکھایا ہے پہلے“

سپہ سالار لشکر ان الفاظ کو اپنی زبان پر جاری کرتے ہوئے تیر رہا کرے اور لشکر کو جوش و خروش پیدا نہ ہو، یہ ناممکن ہے۔ یقیناً ہزاروں کمائیں کرٹکیں، ہزاروں چٹے کے